ماہ نامہ
ہمدرد نونہال
۲۰۱۲ء
خاص نمبر
دل چسپ معلوماتی
تحفہ بھی
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

یادگار: شہید پاکستان حکیم محمد سعید

اشاعت کا ۶۰ واں سال

ماہ نامہ ہمدرد نونہال کراچی

جون ۲۰۱۲ عیسوی
رجب المرجب ۱۴۳۳ ہجری
شمارہ ۶
جلد ۶۰

خاص نمبر
۳۵ روپے

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

ٹیلی فون 36620945 — 36620949
ایکسٹینشن (054 ؛ 052 ؛ 066)
فیکس نمبر 36611755 (021-92)
ای میل hfp@hamdardfoundation.org
ویب سائٹ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان www.hamdardfoundation.org
ویب سائٹ ہمدرد لیبارٹریز (وقف) www.hamdardlabswaqf.org
ویب سائٹ ادارہ سعید www.hakimsaid.info

ISSN 02 59-3734

صدرِ مجلس
سعدیہ راشد

مدیر اعلا
مسعود احمد برکاتی

قیمت عام شمارہ ۳۵ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ۵۰۰ روپے
سالانہ (عام ڈاک سے) ۳۸۰ روپے
سالانہ (غیر ممالک سے) ۵۰ امریکی ڈالر
سالانہ (فری جنگ) ۳۳۰ روپے

قرآنی آیات اور احادیث نبوی کا احترام ہم سب پر فرض ہے

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی اور ہمدرد فاؤنڈیشن نے تعمیر نونہالان پاکستان کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے شائع کیا

سعدیہ راشد پبلشر نے اس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر ادارہ مطبوعات ہمدرد، ناظم آباد کراچی سے شائع کیا

دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی ۷۴۶۰۰

ڈاک خانے کے نئے قاعدوں کی وجہ سے آیندہ ہمدرد نونہال کی قیمت صرف
چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں قبول ہوگی، VPP بھیجنا ممکن نہیں ہے

سرورق کی تصویر	علی اکبر ، ناظم آباد کراچی

خاص نمبر میں کیا کیا ہے؟

عنوان	مصنف	صفحہ
جاگو جگاؤ	شہید حکیم محمد سعید	۵
پہلی بات	مسعود احمد برکاتی	۶
حمد باری تعالیٰ (نظم)	ضیاء الحسن ضیا	۸
روشن خیالات	ننھے لکھنے	۹

بچپن کی یادیں	محترمہ سعدیہ راشد اپنے بچپن اور گھریلو طور طریقے کے بارے میں بتا رہی ہیں	سعدیہ راشد ۱۲۹

عنوان	مصنف	صفحہ
علم کا سفر	مسعود احمد برکاتی	۱۰
اپنا وطن (نظم)	تنویر پھول	۱۲
بستوں کی کہانی	محمد احمد سبزواری	۱۳
آج کی دنیا کے ہم مسلمان	شہید حکیم محمد سعید	۱۷

زمین کی کہانی	زمین کیسے بنی؟ زمین کے اندر کیا ہے؟ دل چسپ معلومات	ڈاکٹر سہیل برکاتی ۲۷

عنوان	مصنف	صفحہ
بیٹے کا تحفہ	نیر ندیم	۱۹
زمین کی کہانی	ڈاکٹر سہیل برکاتی	۲۷
موتیوں جیسی باتیں	لیلیٰ جلیل الرحمن یوسف زئی	۳۴
فقیر کی دعا (نظم)	محمد ظریف خاں	۳۵

بے غرض نیکی	ایک غریب لڑکے کی سبق آموز کہانی جو قاضی کے عہدے تک جا پہنچا	پروفیسر رئیس فاطمہ ۵۴

عنوان	مصنف	صفحہ
خط کی اہمیت	نسرین شاہین	۳۶
وقت کی اہمیت	مسعود احمد برکاتی	۳۹
پھلوں کی وادی	محمد سیف اللہ بھابڑوی	۴۰
کائنات میں زندگی کی تلاش	ادارہ	۴۱

خاص نمبر میں کیا کیا ہے؟

عنوان	مصنف	صفحہ
ایک سال کی زندگی	سائرہ وقار	۴۳
سچی باتیں کہتا تھا وہ (نظم)	خلیل جبار	۵۱
تصویر خانہ	ادارہ	۶۵
نیک لڑکے کی دعا (نظم)	امان اللہ نیر شوکت	۸۲

دو رئیس آدمیوں کا قصہ	ان دو نوابوں کا قصہ جو اپنے بچوں کو بھی نہیں پہچانتے تھے	مسعود احمد برکاتی ۶۷

عنوان	مصنف	صفحہ
گلاب بادشاہ کا فیصلہ	عمیرا سید	۸۳
آگے بڑھنا سیکھو (نظم)	کرشن پرویز	۸۸
میں نے ہمدرد نونہال سے کیا سیکھا	شائستہ زریں	۸۹
ہمیں سب سے آگے بڑھنا ہے (نظم)	نینا عادل	۱۰۴

گہرا نیم	ایک نیم کے درخت کی کہانی جو جلتی لوگوں سے اپنی جان بچاتا پھر رہا تھا	حسن منظر ۹۵

عنوان	مصنف	صفحہ
ڈاکٹر غلام علی الانا	محمد عمران اسحاق	۱۰۵
نونہال مصور	ننھے آرٹسٹ	۱۰۶
گاؤں کا ڈاکٹر	یاسمین حفیظ	۱۰۹
میرا بچپن	پروفیسر مشتاق اعظمی	۱۱۷

موت کا گڑھا	تجسس سے بھرپور مدتوں یاد رہنے والا ایک سنسنی خیز مکمل ناول	اشتیاق احمد ۲۲۳

عنوان	مصنف	صفحہ
معلومات افزا - ۱۹۸	سلیم فرخی	۱۲۲
علم دریچے	ننھے نکتہ داں	۱۲۵
انتخاب	وقار محسن	۱۳۳
ادب و صحافت کی خدمت پر اعزاز	ادارہ	۱۵۳

خاص نمبر میں کیا کیا ہے؟

عنوان	مصنف	صفحہ
معصوم چور	اُم عادل	۱۵۵
پانی پت کا میدان	غلام حسین میمن	۱۶۴
مسکراتی لکیریں	ادارہ	۱۷۷
گلہری شہزادی	ادیب سمیع چمن	۱۷۹
چنگ چیا — اس بار واحد بھائی نے چنگ چی رکشا خریدا ہے۔ مسکراتی تحریر	نوشاد عادل	۱۳۷
نونہال ادیب	ننھے لکھنے والے	۱۸۷
مثالی نمونہ	فرزانہ روحی اسلم	۱۹۹
خونی بڑھیا	سمعیہ غفار میمن	۲۰۵
ہنسی گھر	ننھے مزاح نگار	۲۱۲
ایک بچہ کم ہے — بلی کا ایک بچہ تلاش کرنے کے لیے ایک کھوجی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں	جدون ادیب	۱۴۷
بیت بازی	خوش ذوق نونہال	۲۱۷
اِدھر اُدھر سے	ادارہ	۲۱۸
ہنڈ کلیا	ادارہ	۲۲۰
نونہال خبر نامہ	ادارہ	۲۲۱
بلاعنوان انعامی کہانی — اس خوب صورت کہانی کا عنوان بتا کر انعام میں ایک کتاب لیجیے	ثمینہ پروین	۱۶۷
آدھی ملاقات	نونہال پڑھنے والے	۲۶۱
انعامات بلاعنوان کہانی	ادارہ	۲۶۶
جوابات معلومات افزا-۱۹۶	ادارہ	۲۶۹
نونہال لغت	ادارہ	۲۷۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حساس دل بخشا ہے۔ اگر کوئی اس سے مہربانی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے تو وہ اس کا احسان مند رہتا ہے اور اگر اس کو ناحق بُرا بھلا کہا جائے یا اس کو ذلیل کیا جائے تو اس کے دل کے شیشے میں بال آجاتا ہے، اس کو چوٹ لگتی ہے اور وہ رہ رہ کر ٹیسیں محسوس کرتا ہے۔

عموماً بڑے آدمی چھوٹے کی اور طاقت ور کم زور کی دل آزاری کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی چوٹ ہے، جس کی آواز اللہ تعالیٰ سنتا ہے۔ یہ ایک ایسا زخم ہے جو بھرتا نہیں۔ تلوار کا زخم بھر سکتا ہے، لیکن دل آزاری کا زخم نہیں بھرتا۔

ہمارے دین میں ظلم اور زیادتی کی پکڑ ہے اور بُری نیت کی بھی پکڑ ہے۔ روزِ حساب دونوں کا احتساب اور سزا ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دل آزاری کرنے سے منع کیا ہے۔ ہماری روایات میں تو یہاں تک ہے کہ مظلوم کی آہ سات آسمانوں کو پار کر جاتی ہے۔

اگر انسان اس بات کو سوچے کہ یہ بھی ہماری طرح کا انسان ہے۔ اس کے جسم میں بھی اللہ تعالیٰ نے روح پھونکی ہے۔ اس کے جان و مال اور اس کی آبرو بھی محترم ہے تو پھر کسی قسم کی دل آزاری کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم دل آزاری کے بجائے لوگوں کی دل دہی کریں۔ ان کی مشکل میں کام آئیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا اور ثواب ملے گا۔

دل آزاری سے بچنا تہذیب و شرافت کا بھی تقاضا ہے۔ مہذب آدمی تو وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ سچا مسلمان بھی وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا محفوظ ہو۔ بہ حیثیت انسان اور بہ حیثیت مسلمان ہمارا فرض ہے کہ ہم لوگوں سے ہمدردی کریں۔ مشکل میں ان کی مدد کریں۔ ان کی راہ سے کانٹے ہٹا دیں۔

(ہمدرد نونہال نومبر ۱۹۹۷ء سے لیا گیا)

مسعود احمد برکاتی

حوصلہ بلند ہو تو آپ کو بلندیوں پر پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

نونہال دوستو! خاص نمبر حاضر ہے۔

آپ کا انتظار ختم ہوا۔ ہمیں سانس لینے کا موقع ملا۔ ہر خاص نمبر کے بعد خاص نمبر کی ترتیب و تیاری کے متعلق ذہن یہ کہتا ہے کہ خاص نمبر بہت محنت لیتا ہے۔ آیندہ نہیں نکالیں گے، لیکن نونہال قارئین کی فرمایشوں اور اُمیدوں کے آگے ہر بار ہتھیار ڈال دیتا ہوں۔

بہر حال اب خاص نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے، کیسا ہے؟ اچھا ہے؟ بہت اچھا؟ یا بس غنیمت ہے۔ یہ تو آپ رسالہ پڑھ کر ہی بتائیں گے۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس بار بھی بہت محنت ہوئی ہے، پچھلے برسوں سے زیادہ، بہت زیادہ۔ میرے ساتھی دن رات لگے رہے۔ راتوں کو بھی دیر تک کام کیا۔ اس کے لیے اچھی اچھی، پیاری پیاری، انوکھی، مزے دار، خوب معلوماتی، دل چسپ، حیرت انگیز، غرض جہاں تک ہو سکا بہترین تحریریں حاصل کیں اور شامل کیں۔

میں نے جن دوستوں سے فرمایش کی تھی وہ انھوں نے ہمدرد نونہال سے محبت اور میرے تعلق کی بنا پر اپنی خوب صورت تحریروں، کہانیوں اور نظموں سے نوازا۔ مجھے اُمید ہی نہیں یقین ہے کہ میرے نونہال دوست ان کو پسند کریں گے۔ خاص نمبر شائع ہونے کے ایک ہفتے بعد سے خطوں کی بارش شروع ہو جائے گی۔

مجھے خاص نمبر تیار کرتے وقت وہ بزرگ اور دوست بہت یاد آئے جو ہمدرد نونہال کے لیے لکھا کرتے تھے اور ان کی تحریروں سے ہمدرد نونہال مفید، دل چسپ اور مقبول بنتا تھا یہ ادبا اور شعرا اب ہم میں نہیں رہے۔ ان بزرگوں اور دوستوں میں سے کچھ نام تو لکھ ہی دوں۔ حامد اللہ افسر، کوثر چاند پوری، عشرت رحمانی، علی ناصر زیدی، پروفیسر حبیب اللہ رشدی، مسلم ضیائی، وحیدہ نسیم، قمر ہاشمی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، شاعر لکھنوی، محشر بدایونی، اشرف صبوحی، ایم۔ اسلم، محمد زکریا مائل، معراج (خواجہ محمد عارف)،

ماہر القادری، علی اسد، انجم اعظمی، عبدالحمید نظامی، فضل حق قریشی، راز یوسفی، عبدالغنی شمس، حسین حسنی، عبداللہ خاور، سید منصور علی، نسیمہ قاسمی، عارف حجازی، مناظر صدیقی اور بھی کئی نام ہیں، جن کے قلم کی توانائی سے ہمدرد نونہال پڑھنے والوں نے اپنے بچپن اور نو عمری میں فائدہ اُٹھایا اور اب بھی اُٹھا رہے ہیں۔ مجھے جو نام اس وقت یاد آتے گئے، میں لکھتا گیا۔ اس میں چھوٹے بڑے یا بزرگ یا نوجوان کا خیال نہیں رکھا۔ اب بھی جو ادیب، شاعر دوست ہمدرد کے لیے لکھ رہے ہیں ان کا شکر گزار ہوں۔ کچھ نام یہ ہیں: محمد احمد سبزواری، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر سہیل برکاتی، اشتیاق احمد، غلام حسین میمن، پروفیسر عباس العزم، حسن منظر، وقار محسن، ڈاکٹر عمران مشتاق، نوشاد عادل، ثمینہ پروین، تنویر پھول، ضیاء الحسن ضیا، پروفیسر محمد ظریف خان، نسرین شاہین، کرشن پرویز (انڈیا)، پروفیسر مشتاق اعظمی (انڈیا)، ادیب سمیع چمن، شائستہ زریں، خلیل جبار، حکیم خاں حکیم، سید علی بخاری، حیات محمد بھٹی، یاسمین حفیظ، غزالہ امام (آرٹسٹ)، شمس القمر عاکف، محمد اقبال شمس، ان دوستوں کی تحریریں ہمدرد نونہال کو مفید اور دل چسپ بناتی ہیں۔

محترم محمد احمد سبزواری صاحب کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے کم زور صحت کے باوجود میری درخواست پر "سِکّوں" پر مفید مضمون تحریر فرمایا۔ سبزواری صاحب ماشاء اللہ اب سوویں (۱۰۰) سال میں ہیں۔ سو سال پورے ہونے پر جشن منانا چاہیے۔

خاص نمبر کی ترتیب میں محترمہ سعدیہ راشد کا پُر خلوص اور سرگرم تعاون حاصل رہا۔ انھوں نے اپنی بے تحاشا مصروفیت کے باوجود ایک بہت مفید مضمون عنایت کیا۔ خاص نمبر کی تیاری میں رفقائے کار سلیم فرخی، شکیل صدیقی، جدون ادیب، راغب شکیب، عمران علی سجاد، محمد اکرم خاں، عبدالجبار خاں نے شریک ہو کر محنت کی۔ ان کا شکریہ بھی واجب ہے۔

ہر روز بڑھتی ہوئی منہگائی نے ہمدرد نونہال کی قیمت میں اضافے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں یقین ہے کہ نونہال اس مجبوری کو سمجھتے ہوئے قبول کریں گے اور دعا کریں گے کہ منہگائی کا زور ختم ہو۔ یقین ہے خاص نمبر کا تحفہ بھی پسند آئے گا۔

خدا حافظ

حمدِ باری تعالیٰ

ضیاء الحسن ضیا

اونچی تیری شان خدایا! تیرا چرچا عام

آنکھ کی ٹھنڈک، دل کا سہارا تیرا پیارا نام

سب کا دھیان تُو رکھنے والا، مالک تُو سب کا

سورج، چاند، ستاروں، پھولوں میں تیرا جلوا

سارے مسائل حل کر دیتا ہے اُس بندے کے

اپنی مدد کو تجھے پکارے داتا جو دل سے

تیرے ذکر سے میرے دل کو راحت ملتی ہے

جیسے کوئی کلی چمن کی ہوا سے کھلتی ہے

بخش دے یارب! ساری خطائیں، نام ترا غفار

تُو ہی ہم بندوں کا مولا، مالک اور مختار

دعا ضیا کی یارب! تجھ سے یہ ہے اب ہر دم

اونچا رہے اس پاک وطن میں اسلامی پرچم

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جب نیکی تمھیں خوش کر دے اور بُرائی افسردہ کر دے تو تم مومن ہو۔ مرسلہ: ماہ نور طاہر، کراچی

حضرت عمر فاروق ؓ

جو شخص راز پوشیدہ رکھتا ہے، وہ گویا اپنی سلامتی کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔

مرسلہ: محمد جعفر، گروٹ، خوشاب

حضرت عثمان غنی ؓ

عقل مند کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جب کہ بے وقوف کہتا ہے، میں سب کچھ جانتا ہوں۔

مرسلہ: فرح اسلام، کراچی

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ

خوش کلامی ایک ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔ مرسلہ: محمد سکندر، ڈیرہ اللہ یار

سقراط

جس چیز کے بارے میں معلوم نہ ہو، وہ کسی کو نہ بتاؤ۔ جس چیز کی ضرورت نہیں، اس کی جستجو نہ کرو۔ جو راستہ معلوم نہیں، اس پر سفر نہ کرو اور اچھی بات کوئی بھی کہے، غور سے سنو۔

مرسلہ: الطاف اللہ لطف، کاگڑہ، شبقدر

شہید حکیم محمد سعید

سچ بات کہنے کی عادت ڈالو، چاہے وہ کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو۔ مرسلہ: حافظ حامد عبدالباقی، حویلیاں

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

سُستی کرنے والوں کو صرف اتنا ہی ملتا ہے، جتنا کوشش کرنے والوں سے بچ جاتا ہے۔

مرسلہ: محمد اعظم مغل، ڈگری

آئن شٹائن

انسان کی حماقتوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

مرسلہ: سید محمد عباس، کراچی

لینن

مایوسی، ذہنی موت کا دوسرا نام ہے۔

مرسلہ: روبینہ ناز، رتن تلاؤ

ایمرسن

کام یابی کا سب سے بڑا راز خود اعتمادی ہے۔ مرسلہ: ثوبیہ شاہزمان، ایبٹ آباد

علم کا سفر

مسعود احمد برکاتی

آج ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں، وہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی دنیا ہے۔ نئی نئی باتیں، نئی نئی ایجادیں سامنے آ رہی ہیں۔ ترقی اور تبدیلی کی رفتار بہت تیز ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک جن چیزوں کا خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا، وہ آج عام ہیں۔ ہم ان کو استعمال کر رہے ہیں اور فائدے حاصل کر رہے ہیں۔ پہلے جن سہولتوں کا خیال تک بھی نہیں ہو سکتا تھا، وہ آج ہمیں میسر ہیں اور عام ہیں، بلکہ بہت عام ہیں اور وہ ہر شخص کے اختیار میں بھی ہیں۔ ان سے سکون مل رہا ہے، آرام مل رہا ہے، خوشی مل رہی ہے۔ مثال دینے کی خاص ضرورت نہیں ہے۔ ایک موبائل فون کو ہی لے لیجیے۔ پہلے عام ٹیلے فون ہونا ہی بڑی بات تھی، لیکن اب موبائل فون نے زندگی بہت آسان کر دی ہے۔ اسی طرح ٹیلے ویژن ہے۔ اس نے ہر شخص کو "باخبر" کر دیا ہے۔ دور دراز کے واقعات کی اطلاع بھی منٹوں میں گھر گھر پہنچ جاتی ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ بھی ایک نعمت ہے۔ اس سے علم حاصل کرنے، علم کو پھیلانے میں کتنی آسانی ہو گئی ہے۔ یہ سب علم ہی کا کرشمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم دیا اور علم کی اہمیت بتائی۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں ارشادِ باری ہے:

وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰه

(اور اللہ تمھیں علم دیتا ہے)

علم کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے صاحبِ علم ہونے کا بطور خاص اور متعدد مقامات پر ذکر فرمایا۔ علم والا یعنی علیم کا ذکر قرآن شریف میں تقریباً ایک سو پچاس مقامات پر آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے علم میں اضافے کی دعا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

قُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا

(دعا کیجیے کہ اے میرے رب! میرا علم بڑھا دیجیے)

قرآن پاک کی تعلیمات اور سرکارِ دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کا اثر تھا کہ مسلمانوں نے علم حاصل کرنے کا سفر پوری محنت اور توجہ سے شروع کر دیا۔ طلبِ علم کو اہمیت دی۔ عالم کی عظمت کو، علم والے کی عزت کو، علم دوست انسان کی وقعت کو بڑھایا اور خوب بڑھایا۔ مسلمانوں نے علم کے راستے پر اس تیزی سے بڑھنا شروع کیا کہ وہ ساری دنیا سے آگے نکل گئے اور علم کی روشنی سے دنیا کو جگمگا دیا۔ علم دوستی، عالم دوستی اور کتاب دوستی میں کوئی ان کا مقابل نہ رہا۔ مسلمان علم، ایجاد، تحقیق، تصنیف و تالیف میں سب سے آگے بڑھ گئے اور تمام قوموں پر چھا گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

اَلْعِلْمُ سِلَاحِی

"علم میرا ہتھیار ہے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ "طالبِ علم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے بھی زیادہ پاک ہوتی ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہر وقت یاد رکھنے کے لائق ہے کہ

"طالبِ علم کی راہ میں فرشتے اپنے پَر بچھاتے ہیں۔"

اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے علم کو عبادت کا درجہ دیا اور علم کے حصول کو، علم کی اشاعت اور علم کے فیض کو عام کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور دنیا کے گوشے گوشے کو علم کے فائدوں سے، نئی نئی دریافتوں سے، نئی نئی تحقیقات سے علم و سائنس کو بامِ عروج پر پہنچا دیا، لیکن دل کو دُکھا دینے والی بات یہ ہے کہ آج ہم علم و سائنس میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے۔ جو قومیں علم میں ہم سے آگے ہیں، انھوں نے نئی نئی تحقیقات اور ایجادات سے تمام دنیا کے انسانوں کو طرح طرح کی سہولتیں، راحتیں، نعمتیں پہنچائی ہیں اور مسلسل پہنچا رہے ہیں، لیکن...... لیکن نونہالو! میں مایوس نہیں ہوں۔ ان شاء اللہ...... ان شاء اللہ نونہال پھر اسی طرح علم میں آگے بڑھیں گے اور نئی نئی ایجادات سے دنیا کو راحت کدہ بنا دیں گے۔

☆ ☆ ☆

اپنا وطن

تنویر پھولؔ

رب نے دیا پیارا وطن
سب دُور ہیں رنج و محن
مل جل کے رہنا ہے ہمیں
دل کش ہے اپنی انجمن
تجھ سے دعا ہے ذوالمنن
قائم رہے اپنا وطن

پیارا ہے اپنا گلستاں
ہیں لہلہاتی وادیاں
پرچم ہلالی سبز ہے
امن و محبت کا نشاں
تجھ سے دعا ہے ذوالمنن
قائم رہے اپنا وطن

تیرے نبی ہیں مصطفےٰؐ
رحمت کا اُنؐ کی آسرا
آئے بہار بے خزاں
یہ پھولؔ کی ہے التجا
تجھ سے دعا ہے ذوالمنن
قائم رہے اپنا وطن

سِکّوں کی کہانی

محمد احمد سبزواری

سِکّے ہر چھوٹے بڑے کے ہاتھ سے روزانہ گزرتے ہیں۔ آیئے آج آپ کو ان کی کہانی سنائیں۔ کسی دھات کے اس ٹکڑے کو سِکّہ کہتے ہیں جو کسی حکومت کی جانب سے مقررہ نشان لگا کر اور اس کی مالیت درج کر کے بطور زر رائج کیا جائے۔ مغربی خطے میں [illegible] سال قبل مسیح لیڈیا میں اور مشرق میں اسی زمانے میں چین میں سِکّوں کا چلن ہوا، مگر دنیا کے بڑے حصوں میں نمک، چاندی، کوڑیاں اور مویشی زر کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔

پرانے زمانے میں سونے، چاندی اور تانبے کے سِکّے ہوا کرتے تھے۔ اب نکل کے بھی ہونے لگے ہیں۔ پہلے سِکّے ہاتھ سے بنتے تھے۔ یہ گول، چوکور، لمبوترے کسی بھی شکل کے ہو سکتے تھے۔ جہاں سِکّے ڈھالے جاتے تھے اس کو ٹکسال یا دارالضرب کہا جاتا ہے۔ لوگ اپنا سونا، چاندی دے کر بھی سِکّے ڈھلوا سکتے تھے۔ مغلوں کے زمانے میں پورے ملک میں چالیس ٹکسالیں تھیں۔ جب ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے دفتر قائم کیے تو انھوں نے پہلے کلکتہ، پھر مدراس اور بمبئی میں اپنی ٹکسالیں قائم کیں۔ سترویں صدی سے سِکّے مشینوں سے بنائے جانے لگے اور ان کی دھاتوں کو چوری ہونے یا کُترنے سے بچانے کے لیے سِکّے گول اور ان کے کناروں پر لکیریں بنائی جانے لگیں۔ چھوٹے سِکّے تانبے کے ہوتے تھے جب کہ روپیہ، اٹھنّی، چونّی چاندی کی اور اشرفیاں سونے کی ہوا کرتی تھیں۔

سِکّہ بادشاہ کی علامت تصور کیا جاتا ہے، اس لیے ہر نیا شخص بادشاہ ہوتے ہی اپنے نام کا سِکّہ جاری کیا کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سونے کا لاطینی سِکّہ

دینار اور چاندی کا سِکّہ درہم مختلف وزن کے رائج تھے۔ حضرت عمرؓ نے دینار اور درہم میں ایک اور سات کا فرق رکھا اور زکواۃ اسی حساب سے ادا کی جاتی تھی، اسلامی ملکوں کے سِکّوں پر کلمہ یا کوئی آیت ہوتی ہے، جب کہ دوسرے ملکوں میں سِکّے پر بادشاہِ وقت کی تصویر ہوتی ہے۔ دہلی کے بادشاہ محمد تغلق کے زمانے میں چاندی کی قلت ہوگئی تو چمڑے کا سِکّہ رائج کیا گیا، مگر اتنے جعلی سِکّے جاری ہوگئے کہ ان کو واپس لینا پڑا۔ یہ بھی تاریخی واقعہ ہے کہ جب ہمایوں، شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر بھاگا تو اس کو ایک سقّے نے دریا پار کرایا۔ اس کے بدلے سقّے کو آدھے دن تخت پر بٹھایا تو اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنی مشک کے سِکّے جاری کیے۔ ہمایوں کے بھائی دانیال نے اس تقریب میں شرکت نہیں کی تھی۔

شہنشاہ اکبر کے عہد میں سونے کے ستائیس، چاندی کے نو اور تانبے کے چار سِکّے جاری تھے۔ سونے کا سب سے بڑا سِکّہ ''شاہانہ'' کہلاتا تھا۔ اس کا وزن ایک سو ایک تولے، نو ماشے، سات رتی تھا۔ اس کے ایک جانب بیچ میں اکبر کا نام اور پانچ کونوں میں عربی کی عبارت ہوتی تھی۔ دوسری طرف درمیان میں کلمہ طیبہ اور خلفائے راشدین کے نام ہوتے تھے۔ جب دینِ الٰہی کا زور ہوا تو ملک کے درباری شاعر شیخ فیضی کا فارسی قطعہ اور درمیان میں اللہ اکبر اور جل جلالہ، لکھا جانے لگا۔ چاندی کا رپیا ساڑھے گیارہ ماشے کا تھا۔ گو اس کو شیر شاہ نے رائج کیا تھا، مگر اللہ اکبر، جل جلالہ کی عبارت کے ساتھ یہ ڈھلتا رہا۔ جب جہانگیر کی نور جہاں سے شادی ہوگئی تو اس کا نام بھی سِکّوں پر لکھا جانے لگا۔ برصغیر میں انگریزوں کے دور میں یہ سِکّے رائج تھے۔

پائی (تین پائی = ایک پیسہ) چھوٹا یا نصف پیسہ، پیسہ (آنے میں چار اور رپے میں ۶۴ پیسے) اکنی (ایک آنہ) دونّی (دو آنے) چونّی (چار آنے) اٹھنّی (آٹھ آنے) رپیہ (سولہ آنے) مہر یا اشرفی (پندرہ رپے) دونّی تک سارے سِکّے تانبے کے، چونی، اٹھنی اور رپیا چاندی کا ہوتا تھا، مگر یہ خالص چاندی نہیں ہوتی تھی۔ البتہ اشرفی خالص سونے کی ہوتی ہے۔ ملک میں پیسے کو عام طور پر ٹکہ کہا جاتا تھا۔ ۱۹۶۰ء تک بینکوں، ڈاک خانوں اور لین دین میں آنہ اور پائی تک حساب ہوتا تھا۔

جب پاکستان بنا تو یہاں کا اپنا کوئی سِکّہ نہیں تھا۔ سال ڈیڑھ سال تک ہندستانی سِکّے ہی چلتے رہے۔ اندازہ لگایا گیا کہ پاکستان کو ۴۴۳ء۷ ملین سِکّوں کی ضرورت ہے۔ نئے سِکّوں کے خاکے بنائے گئے اور یکم اپریل ۱۹۴۸ء میں رپیہ، اٹھنی، چونی، دونی، اکنّی، ادھنّا اور پیسے کے سات سِکّے تیار کرائے گئے۔ یہ لاہور، بمبئی اور کلکتہ کی ٹکسالوں میں تیار ہوئے۔

۱۹۴۸ء میں پہلا پیسہ سائز میں بڑا تھا اور اس کے درمیان ۴ء۹ ملی میٹر کا سوراخ تھا۔ یہ کانسی، نکل، تانبے اور ٹین کے آمیزے سے بنا تھا۔ دو پیسے والا سِکّہ چوکور تھا اور ایک آنے والا گول کنگورے دار تھا۔ ۱۹۵۵ء میں سکوں کا دوسرا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ لندن کی شاہی ٹکسال میں تیار کیے گئے تھے۔ ان میں چاند کا رُخ غلط دکھایا گیا تھا۔ غلطی کا احساس ہونے پر ان کو واپس لے لیا گیا۔ درمیان میں پیتل اور نکل کا دو پیسے والا سِکّہ بھی رائج ہوا۔ اس میں پیتل کی مقدار زائد تھی۔ لوگوں نے اس کو پگھلا کر نب اور پیتل کی دوسری چیزیں بنانا شروع کر دیں، کیوں کہ اس طرح ان کو سستا پیتل مل رہا تھا۔ یوں یہ سِکّہ خود ہی بازار سے غائب ہوگیا۔ ۱۹۶۱ء میں ملک میں زر اور ناپ تول کا اعشاری نظام نافذ ہوگیا۔ یعنی دہائیوں والا نظام، چناں چہ ایک پائی، پانچ اور دس پائی کے نئے نئے سِکّے جاری کیے

گئے۔ عوام نے پائی کو پیسہ سمجھا۔ چناں چہ اس غلطی کو دور کرنے کے لیے تین نئے سکے جار
کیے گئے، جن پر پائی کے بجائے پیسہ درج تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، چھوٹے سکے باز
سے غائب ہوتے رہے۔

آج کل روپے کا سکہ سب سے چھوٹا سکہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو روپے اور پا
روپے کے سکے ہیں۔ یہ سب نکل کے ہیں۔ اب پیسے کا کہیں وجود نہیں۔ یہ صرف پیٹرولیم ک
مصنوعات کی قیمتوں یا بینکوں کے منافعوں میں نظر آتا ہے۔ آج کل ایک روپے، دو ر
اور پانچ روپے کے جو سکے چل رہے ہیں ان میں ایک روپے کے سکے پر قائداعظم کی تصو
اور دوسری طرف مسجد کی شبیہ ہے جب کہ دو اور پانچ روپے کے سکوں پر ایک طرف
چاند ستارہ اور دوسری طرف مسجد کی شبیہ ہے۔

اس دوران کئی یادگاری سکے بھی جاری کیے گئے۔ دس روپے کا تانبے کا سکہ پاکستان
سینٹ کی پچیسویں سال گرہ پر اور ۵۰ روپے والا آزادی کی پچاسویں سال گرہ پر جاری ہوا
حضرت قائداعظم اور علامہ اقبال کی صد سالہ برسیوں پر سو روپے کے چاندی کے اور ۵۰۰ روپ
کے سونے کے سکے جاری ہوئے۔ اسلامی سربراہ کانفرنس کے موقع پر سو روپے کا چاندی کا او
ہزار روپے کا سونے کا سکہ جاری ہوا۔ لمبی دُم اور رنگین پَروں والے مغربی پرندے، قارض ک
تحفظ کے لیے سو روپے کا چاندی کا سکہ اور گھڑیال یا مگر مچھ کی حفاظت کی خاطر ڈیڑھ سو روپے
چاندی کا سکہ جاری ہوا۔ تین ہزار روپے کا سونے کا سب سے قیمتی سکہ بلوچستان کے مارخو
کے تحفظ کی خاطر جاری کیا گیا۔ یہ یادگاری سکے جاری ہونے کے تھوڑے ہی دنوں میں غائب
ہونے لگے، کیوں کہ لوگوں نے ان کو یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا تھا۔

باتیں شہید حکیم محمد سعید کی

آج کی دنیا کے ہم مسلمان

انتخاب: عبدالغفار رئیسانی

نونہالو! اس میں تو ذرا بھی شک اور شبہ نہیں ہے کہ ساری دنیا آج مسلمانوں کے خلاف ہو گئی ہے۔ دنیا کے ہر انسان کو جو غیر مسلم ہے، مسلمان سے کوئی محبت نہیں رہی ہے۔

مسلمانوں کی دنیا میں آج کوئی عزت نہیں ہے۔ اس صورتِ حال پر نہایت اطمینان کے ساتھ اور صبر و برداشت کے علاوہ فہم و فراست اور عقل و دانش کے ساتھ حالات دین و دنیا پر غور کرنا چاہیے۔ جذبات کی مشتعل فراوانیوں میں صبر کا دامن ہمیشہ چھوٹ جاتا ہے اور حقائق کا احساس اور حالات کا ادراک غیر یقینی ہو جایا کرتا ہے۔

دنیا کی ساری آبادی اگر پانچ ہے تو ان پانچ میں مسلمان ایک ہے، یعنی اس دنیا میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اس زمین پر بسنے والے انسانوں میں مسلمان پانچ میں ایک اور چار دوسرے لوگ ہیں۔ دوسرے مذاہب ہیں۔ ہندو ہیں، عیسائی ہیں، یہودی ہیں، پارسی وغیرہ۔ جب مسلمان پانچ میں ایک ہیں تو دنیا کی مسلم اقلیت کو غور کرنا چاہیے کہ اس کے اپنے اوصاف کیا ہیں۔ ذرا غور کریں کہ:

☆ ہمیں پانچ میں ایک کی حیثیت سے چار کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیے۔

☆ ہم مسلمانوں کو اپنے دین کی اور خود اپنی حفاظت کیسی کرنی چاہیے۔

☆ ہمیں اپنے دین اور اپنے ایمان اور اپنے فکر ونظر کو خود اس پر عمل کر کے پیش کرنا چاہیے۔

☆ ہم مسلمانوں کو اسلام کے اعلا احکام کا خود احترام کرنا چاہیے اور دنیا کے چار کے سامنے اپنے اعلا عمل و کردار کا نمونہ پیش کرنا چاہیے۔

☆ اسلام سلامتی کا دین ہے۔ امن و امان کا دین ہے۔ اخلاق و کردار بلند کا دین ہے۔ مسلمان کو سلامتی، امن و امان اور اعلا اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

☆ تمام مسلمانوں کو قرآن مجید کے حکم کے مطابق اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنا چاہیے۔ اپنے اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ فرقہ بازیاں ہرگز اسلام نہیں ہے۔

☆ دیانتِ فکر، دیانتِ عمل، امانت تامہ، شرافتِ فکر و عمل، چاہت، صداقت کا صلہ، اخوت باہمی و عالمی، اجتماعیت مسلمین، علم و حکمت، مشاورت، بصیرت و بصارت، وحدت رسالت، آخرت یہ سب اسلام کی تعلیم ہیں۔ ایک مسلمان کو ان حسنات کا نمونہ ہونا چاہیے۔

☆ ☆ ☆

بیٹے کا تحفہ

نیر ندیم

بارہ سالہ حسام ایک دن اپنے والد کے ساتھ شہر کے بڑے بازار سے گزر رہا تھا۔ اس کے والد احتشام صاحب اپنی دکان کے لیے کچھ سامان خریدنے آئے ہوئے تھے۔ ان کی دکان شہر کے آخری کنارے پر تھی، جہاں کی آبادی بہت غریب تھی۔ دکان کے پیچھے ان کا ایک بوسیدہ سا گھر تھا۔ گھر میں دو کمرے تھے۔ چھوٹا صحن، ایک طرف غسل خانہ اور ایک طرف باورچی خانہ، جس میں اس کی ماں اچھے اچھے مزے دار کھانے پکاتی تھیں۔ حسام نے ہمیشہ اپنی ماں کو مصروف ہی دیکھا تھا۔ کبھی کپڑوں کی دھلائی ہو رہی ہے تو کبھی سلائی کی مشین کی گھر گھر سنائی دے رہی ہے۔ ماں کو اس نے ہمیشہ ہنستے مسکراتے کام کرتے دیکھا۔

بازار میں چاروں طرف چہل پہل تھی۔ دکانوں پر بھانت بھانت کی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ اچانک حسام کی نظریں ایک قریبی دکان کے شوکیس پر ٹک گئیں۔ وہاں جو چیز اسے پسند آئی، اسے دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا۔ وہ تیر کی طرح گیا اور شوکیس کے شیشے سے ناک لگا کر اندر دیکھنے لگا۔ اس کی پسندیدہ چیز اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھی۔ اگر بیچ میں شیشہ نہ ہوتا تو وہ اسے ہاتھ سے چھو بھی سکتا تھا۔ اس نے مزید نظریں جما کر قیمت پڑھی اور جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''سو رپے'' پڑھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے والد اتنی بڑی رقم خرچ کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ مایوس ہو کر وہ اپنے والد کے ساتھ گھر آ گیا۔ تب بھی اسے وہ دکان اور شوکیس ہی یاد آتا رہا۔ رات کو وہ جب اپنی ماں کا ہاتھ تھام کر سویا تو بھی وہ خواب میں اسی شوکیس کو دیکھتا رہا۔

دوسرے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ اس کی والدہ اسے جگانے آئیں تو وہ حیران رہ گئیں۔ خلافِ معمول ان کا بیٹا جاگ رہا تھا۔ وہ جاگ ہی نہیں رہا تھا، بلکہ لباس تبدیل کر کے کھیلنے کے لیے جا رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور باہر نکل گیا۔ ابھی اس کے والد بھی دکان پر نہیں گئے تھے۔ گلی میں آنے کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ سو رپے کیسے کمائے جائیں۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اپنی خالہ یا پھوپی سے مدد لے، مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ وہ اپنے راز کو کسی پر ظاہر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس کے والد اپنی دکان کی آٹے، چینی اور چاول وغیرہ کی خالی بوریاں کباڑی کو تقریباً آدھی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔

اب حسام کے قدم خود بخود اپنے ایک دوست کے گھر کی طرف اُٹھ گئے، جس کے والد رحیم صاحب ایک کاروباری آدمی تھے۔ وہ ان کے یہاں خالی بوریاں دیکھ چکا تھا۔ دوست کے والد صاحب یہ سن کر حیران ہوئے کہ وہ اپنے دوست کے پاس نہیں آیا، بلکہ ان سے مدد چاہتا ہے۔ انھوں نے حسام کو پیار سے بٹھایا اور بہت محبت سے آنے کا سبب

پوچھا۔ حسام نے بڑی ہمت کرتے ہوئے کہا: ''آپ کے پاس خالی بوریاں ہوتی ہیں۔ اگر ان میں سے چند آپ مجھے بیچ دیں۔''

''آج تو میرے پاس ایک بھی بوری نہیں ہے، مگر تم بوریاں خرید کر کیا کرو گے؟''

حسام یہ سن کر بجھ گیا۔ وہ جانے کے لیے اُٹھا تو رحیم صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم بوریاں خرید کر کیا کرو گے؟''

''میں انھیں بڑے کباڑی کو بیچوں گا۔ اس سے مجھے کچھ زیادہ پیسے ملیں گے۔''

رحیم صاحب نے اُسے بڑے غور سے دیکھا۔ پھر جیسے انھیں کچھ اچانک یاد آ گیا۔ وہ اسے وہیں روک کر اندر گئے۔ جب واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں تین بوریاں تھیں۔ وہ انھوں نے حسام کو دے دیں۔

''یہ میں بیچ نہیں رہا ہوں، بلکہ میری طرف سے تمھاری حوصلہ افزائی کے لیے ایک تحفہ ہے۔''

حسام اس قدر خوش ہوا کہ شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔ جب وہ ان بوریوں کو ایک کباڑی کے پاس بیچ کر گھر آیا تو وہ خود کو دنیا کا امیر ترین بچہ سمجھ رہا تھا۔ اب حسام کی جیب میں تیس روپے تھے، جو اس نے اپنے ایک پرانے بستے میں چھپا دیے۔ اس کی ماں نے پوچھا کہ اتنی دیر کہاں غائب تھا، مگر جواب سنے بغیر وہ گھر کے کسی کام میں مصروف ہو گئیں۔

آنے والا ہفتہ اس نے بہت مصروف گزارا۔ ایک جگہ حسام کو چند بوریاں سستی مل گئیں۔ آخر ایک دن اس کے پاس سو روپے پورے ہو گئے۔ اب اسے اُس دن کا انتظار تھا، جب اس کے والد اسے لے کر شہر کے بڑے بازار جائیں اور وہ اپنی پسند کی چیز خرید کر گھر لا سکے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ اس نے پرانا بستہ نکال کر اپنے شانے پر ڈال لیا۔ اس کے والد نے اس سلسلے میں کچھ کہا، نہ کوئی سوال کیا۔ سارے راستے وہ اپنے بستے کو مضبوطی سے اپنے سینے سے لگائے رہا۔ بستے میں اس کی جمع پونجی دس دس اور پانچ پانچ کے نوٹوں کی شکل میں تھی۔ بڑے بازار میں اس کے والد اسے اپنے ایک جاننے والے کی دکان پر بٹھا کر

چلے گئے۔ انھیں کئی جگہ جانا ہوتا تھا، حسام کے تھک جانے کا خیال تھا۔ جب اس کے والد چلے گئے تو وہ چپکے سے اُٹھا۔ بستہ اس نے اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ وہ بہت اعتماد کے ساتھ دکان کا دروازہ کھول کر دکان دار کے سامنے کھڑا تھا۔ دکان دار نے عینک کے پیچھے سے اسے دیکھا۔

حسام نے اشارہ کیا: ''مجھے یہ چاہیے۔''

''تمھیں معلوم ہے، اس کی قیمت کیا ہے؟'' دکان دار کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''میرے پاس اس بستے میں سو روپے ہیں۔'' یہ کہہ کر حسام نے اپنا بستہ دکان دار کے سپرد کر دیا۔

دکان دار نے بستہ کھول کر رقم گنی، پھر دوسری بار گنی۔ اس دوران حسام خوشی، اُمید اور انتظار بھری نگاہوں سے دکان دار کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جب اس نے سنا کہ بستے میں سو روپے نہیں، بلکہ پچانوے روپے ہیں۔ حسام کو بستے کی رقم گننے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ شاید پوری رقم جمع ہو چکی ہے۔

دکان دار نے چند لمحے حسام کو دیکھا۔ حسام کا خیال تھا، وہ ان نوٹوں کو واپس اس کے بٹوے میں رکھے گا اور بستہ اس کے ہاتھ میں تھما دے گا، لیکن دکان دار نے وہ نوٹ اپنی دراز میں ڈال دیے۔ حسام کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آنسو اس کی پلکوں پر آ کر رکے ہوئے تھے۔ جب دکان دار نے اس کی پسندیدہ چیز کو خوب صورت کاغذ میں لپیٹ کر اس کے بستے میں رکھا اور بستہ اس کے شانے سے لٹکایا تو وہ آنسو جو پلکوں تک آ کر رکے تھے۔ اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ دکان دار نے اس کے گال تھپتھپائے۔

''باقی پیسے پھر دے جانا۔'' دکان دار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حسام نے خوشی سے اقرار میں سر ہلایا۔ اب اسے جانے کی جلدی تھی۔ جب وہ اپنے والد کے ساتھ گھر پہنچا تو جیسے وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بستہ کھولا۔ اس کے والد اور والدہ اس کی جلد بازی اور خوشی سے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پہلے ہی حیران تھے، مگر وہ پاگلوں کی طرح بستہ کھول رہا تھا۔ وہ کبھی ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے، کبھی اس کو دیکھتے۔ حسام نے بستہ کھولا۔ اس میں سے رنگین اور خوب صورت کاغذ میں لپٹی ہوئی اپنی پسندیدہ چیز نکالی اور اپنی ماں کے سامنے رکھ دی۔ یہ ایک بہت عمدہ قسم کا اسکارف تھا، جو عورتیں سر پر باندھتی ہیں۔

''امی جان! یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں۔'' اب اس کی ماں کے ایک ہاتھ میں اسکارف تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے بچے کو چمٹائے ہوئے تھیں۔ پھر ماں باپ کے چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

''مگر اتنا مہنگا...... ! کہیں تم نے دکان سے اُٹھایا تو نہیں ہے؟''

حسام نے تمام واقعہ سچ سچ سنا دیا۔ دوسرے دن صبح جب حسام کی آنکھ کھلی تو اس کی ماں باورچی خانے میں تھیں۔ ان کے سر پر اسکارف بندھا ہوا تھا۔ حسام کو وہ ایک پری لگیں۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کی ماں کوئی گیت گنگنا رہی تھیں۔ ☆

زمین کی کہانی

پروفیسر ڈاکٹر سہیل برکاتی

مری کا نام تو آپ نے سنا ہوگا، کتنا حسین اور خوش نما مقام ہے۔ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ اس کے خوب صورت پہاڑوں کو دیکھنے آتے ہیں اور یہاں کے روح افزا موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مری پاکستان کے بہت خوب صورت تفریحی مقامات میں شمار کیا جاتا ہے۔ پہاڑوں پر راستے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ہزاروں فیٹ بلندی پر پہنچنے کے بعد یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم کسی اونچی جگہ آ گئے ہیں، مگر اوپر پہنچ کر چاروں طرف نظر دوڑائیں تو نیچے زمین پر بنے ہوئے بنگلے اور عمارتیں گڑیوں کے گھروندے معلوم ہوتے ہیں۔ مری کے پہاڑ خوش نمائی اور دل فریب موسم کے لیے تو مشہور ہیں، لیکن بلندی کے لیے نہیں۔ کوہ ہمالیہ کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ یہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ اس کی ایک چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ انتیس ہزار دو (۲۹۰۰۲) فیٹ بلند ہے۔

ہماری زمین بھی بڑی دل چسپ جگہ ہے۔ کہیں آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ نظر آتے ہیں تو کہیں میلوں پھیلے ہوئے ہموار میدان۔ یہی نہیں بلکہ اس دنیا میں ہزاروں فیٹ گہرے سمندر بھی ہیں۔ بحر الکاہل سب سے گہرا سمندر ہے۔ ایک مقام پر اس کی گہرائی ۳۵۴۰۰ فیٹ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہماری زمین کہیں اونچی، کہیں ہموار اور کہیں نیچی ہے۔

شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ ہماری زمین جب سے بنی ہے، اسی حالت میں ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ نہیں ہے، بلکہ ہماری زمین میں مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آج آپ جس جگہ پہاڑ دیکھ رہے ہیں، ہوسکتا ہے ایک مدت بعد ان پہاڑوں کی جگہ چٹیل میدان نظر آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہموار میدانوں کی جگہ اونچے اونچے پہاڑ بن جائیں۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آج جس جگہ خشکی نظر آ رہی ہے، وہاں پانی

ہی پانی نظر آئے اور سمندر کی لہریں اسے اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ یہ تمام باتیں شاید آپ کو نا قابلِ یقین معلوم ہو رہی ہوں، کیوں کہ آپ نے اپنی زندگی میں اس قسم کی تبدیلیاں نہیں دیکھی ہوں گی، مثلاً آپ کے شہر میں اگر کہیں پہاڑ ہیں تو وہ اپنی جگہ قائم ہیں اور جس میدان میں آپ کرکٹ یا فٹ بال کھیلتے ہیں، وہاں اچانک کوئی پہاڑ نمودار نہیں ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ زمین کی ان تبدیلیوں کی رفتار اتنی آہستہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے بعد بہت معمولی سی تبدیلی ہوتی ہے، اس لیے انسان اپنی مختصر زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں دیکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام آدمی کو ان باتوں پر یقین کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ زمین کا علم جاننے والوں کو ماہرینِ ارضیات (GEOLOGIST) کہتے ہیں۔ ماہرینِ ارضیات نے ہمیں بتایا ہے کہ آج زمین کے بعض حصے جو میدانوں پر مشتمل ہیں، کسی زمانے میں یہاں برف سے ڈھکے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ یہ پہاڑ تیز و تند ہواؤں اور موسم کی سختی کو برداشت نہ کر سکے اور دھیرے دھیرے میدانوں میں تبدیل ہو گئے۔ آج جہاں درختوں سے ڈھکے ہوئے اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ ہے، وہ کسی زمانے میں پانی کے اندر تھا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی تبدیلیاں آج بھی جاری ہیں۔ دنیا کے کچھ حصوں میں پہاڑ اور زیادہ بلند ہوتے جا رہے ہیں، جب کہ بعض مقامات پر پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر میدان بنتے جا رہے ہیں۔ بعض جگہ خشکی کا علاقہ سمندر میں چھپتا جا رہا ہے تو کہیں سمندر کے نیچے چھپی ہوئی زمین اوپر آ رہی ہے۔ زمین کی شکل و صورت میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، انھیں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ زمین کی پیدائش کے متعلق معلوم کیا جائے۔

یہ آپ کو معلوم ہے کہ سورج ایک ستارہ ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اب سے بہت پہلے سورج کے قریب سے ایک بہت بڑا ستارہ گزرا، جس کی کشش کی وجہ سے سورج

سے مادّے کی کچھ مقدار الگ ہوگئی۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بڑے ستارے کے سورج کے قریب سے گزرنے کی وجہ سے سورج کی سطح پر مادے میں لہریں پیدا ہوگئیں اور پھر یہ لہریں اتنی اونچی ہوگئیں کہ سورج سے علاحدہ ہوگئیں۔ سورج سے علاحدہ ہونے والا یہ مادّہ جسے ایک طرف سے بڑا ستارہ اور دوسری طرف سورج کھینچ رہا تھا، سورج کے گرد چکر لگانے لگا۔ دھیرے دھیرے یہ مادّہ ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا، جنھیں ہم سیارہ کہتے ہیں۔ زمین بھی ایک سیارہ ہے۔ سورج سے الگ ہونے کے بعد لاکھوں سال سے زمین فضا میں چکر لگا رہی ہے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ شروع میں زمین کا درجۂ حرارت اتنا زیادہ تھا کہ وہ آگ کا گولا معلوم ہوتی تھی۔ زمین کو ٹھنڈا ہونے میں بھی لاکھوں سال لگ گئے۔ زمین آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی گئی اور اس کی اوپری پرت ٹھوس اور سخت بن گئی، لیکن اندر سے زمین پھر بھی گرم رہی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ زمین کا مرکز اس وقت بھی بہت گرم ہے۔ اگر ہم زمین کھودنا شروع کریں تو ہر پچاس فیٹ کی گہرائی پر ایک درجہ فارن ہائٹ کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ درجۂ حرارت میں اضافے کی اس رفتار سے یہ خیال ہوتا ہے کہ زمین کے اندر مرکز میں موجود چٹانیں پگھل کر گرم لاوا بن گئی ہوں گی۔

اپنی معلومات کی بنا پر بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ابتدا میں تو پوری زمین ہی گرم لاوے کی شکل تھی اور اب زمین کا اندرونی حصہ پگھلے ہوئے مادّے کی شکل میں رہ گیا ہے، لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ زمین کا مرکز مائع یا رقیق حالت میں نہیں ہے۔ زلزلوں سے اس سلسلے میں کافی مدد ملی۔ جس رفتار سے زلزلوں کے جھٹکے زمین کے مرکز سے گزرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمین کا مرکز مائع حالت میں نہیں، بلکہ ٹھوس شکل میں ہے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ مرکز میں درجۂ حرارت بہت زیادہ ہے، لیکن جو چیز وہاں موجود مادّے کو پگھلنے سے محفوظ رکھتی ہے، وہ اوپر کی چٹانوں کا بے انتہا دباؤ ہے۔ اگر یہ

دباؤ نہ ہوتا تو زمین کا مرکز یعنی اندرونی حصہ اس وقت پگھلے ہوئے مادے کی طرح ہوتا۔

زمین دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہوتی رہی۔ زمین کا اندرونی حصہ جب ٹھنڈا ہوتا تو وہاں موجود گیسیں بڑی قوت کے ساتھ باہر نکلتیں، جس کی وجہ سے زمین اس جگہ سے پھٹ جاتی۔ زمین کا بیرونی غلاف جو زمین کے اندرونی حصے کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈا اور سخت ہوتا ہے قشرِ ارض یا زمین کا پرت کہلاتا ہے۔ قشرِ ارض زیادہ تر چٹانوں سے بنا ہوا ہے۔

زمین سے نکلنے والی گیسیں ہلکی ہونے کی وجہ سے اوپر اٹھیں اور وہاں سردی پا کر بادلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ جب اور زیادہ ٹھنڈی ہوئیں تو بادل بارش بن کر برس پڑے اور یوں ہماری زمین پر بارش ہوتی رہی۔ اس بارش کے نتیجے میں ندی نالے اور سمندر وجود میں آئے۔

قشرِ ارض میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل بھی جاری تھا۔ قشرِ ارض کے بعض حصے اپنی جگہ سے ہٹ جاتے۔ کوئی حصہ ابھر آتا اور کوئی اندر دھنس جاتا یا آگے پیچھے، اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ یہ سب اندر سے بہت زیادہ دباؤ پڑنے کی وجہ سے ہوتا تھا۔ قشرِ ارض کے بعض حصے سرک کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے تھے اور وہاں دراڑیں پڑ جاتی تھیں۔ قشرِ ارض کے اس طرح ٹکڑوں میں تقسیم ہونے اور بعض حصوں کے اوپر اُٹھ جانے اور بعض ٹکڑوں کے نیچے بیٹھ جانے کی وجہ سے براعظم وجود میں آئے۔ زمین کے اُبھرے ہوئے حصوں کے درمیان جو گڑھے تھے، وہاں پانی بھر گیا اور وہ آج سمندر کہلاتے ہیں۔ زمین کی سطح پر جہاں کہیں اندرونی مادّہ اوپر آ گیا، اس نے پہاڑ کی شکل اختیار کر لی۔

آپ نے دیکھا کہ زمین کی پیدائش سے براعظموں اور سمندروں کے بننے تک زمین میں کتنی تبدیلی آئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدا میں زمین پر بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں اور بہت تیزی سے آئیں، لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ اب زمین میں کسی قسم کی حرکت یا تبدیلی نہیں ہو رہی۔ گو کہ یہ تبدیلیاں اتنی تیزی سے نہیں ہو رہیں، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ زلزلے اب

بھی آتے ہیں اور زمین کی شکل کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ دنیا کے بعض علاقوں میں دھیرے دھیرے پہاڑ سر ابھار رہے ہیں تو بعض جگہ خشکی کے علاقے سمندر میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔

زمین میں بعض قوتیں ایسی ہیں، جو اس کی شکل و صورت میں تبدیلی لاتی رہتی ہیں۔ یہ قوتیں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو زمین کو ابھارنے اور بلند کرنے میں مصروف رہتی ہیں اور دوسری وہ جو اسے پست کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ پانی، ہوا اور موسمی اثرات کا شمار انہی قوتوں میں ہوتا ہے۔

زمین کی شکل و صورت بدلنے میں پانی کا بڑا اہم حصہ ہے۔ پانی میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو جگہ جگہ ندی نالے بن جاتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے ندی نالے آپس میں مل کر دریا بناتے ہیں اور پھر یہ دریا سمندر سے جا ملتے ہیں۔ دریاؤں کے الگ الگ سلسلے ہوتے ہیں۔ ہر سلسلے میں دریاؤں کے ساتھ ان کی شاخیں اور معاون دریا ہوتے ہیں۔ پانی جب تیزی سے بہتا ہے تو اپنے ساتھ مٹی بھی بہا لے جاتا ہے۔ اس طرح یہ زمین کو کاٹ کاٹ کر پست کرتا رہتا ہے۔ پانی کے اس عمل سے بڑے بڑے پہاڑ اور چٹانیں میدانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور میدان پست ہو کر سمندر کی سطح کے برابر ہو جاتا ہے۔ اگر پانی کے بہنے کی رفتار تیز ہو تو وہ اپنے ساتھ مٹی اور ریت بھی بہا لے جاتا ہے، لیکن آگے چل کر جب دریا کی رفتار سست ہو جاتی ہے تو یہ مٹی اور ریت دریا کے کنارے جمع ہو جاتی ہے۔ اس طرح دریا کے کنارے جو میدان بنتا ہے اسے 'ڈیلٹا' کہتے ہیں۔

پانی کی قوت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ صرف دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بہنے والا پانی اپنے ساتھ مرغی کے انڈے کے برابر کے پتھر بہا لے جاتا ہے۔ فضا میں موجود گیسیں پانی میں حل ہو کر پانی کے کٹاؤ کے عمل میں بہت مدد دیتی ہیں۔ پہاڑوں پر سے بہنے والا پانی آہستہ آہستہ پہاڑوں کو کاٹ کر اپنا راستہ بنانے کا عمل جاری رکھتا ہے۔

پہاڑ کاٹ کر جو ہموار جگہ بنتی ہے، اسے وادی کہتے ہیں۔ بعض دریاؤں کی وادی میں کبھی کبھی سیلاب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کیوں کہ وادی زیادہ گہری نہیں ہوتی، اس لیے جب زیادہ بارش کی وجہ سے دریا پانی سے بھر جاتے ہیں تو پانی اس میں سے نکل کر وادی میں پھیل جاتا ہے۔ سیلاب کا پانی ہمیشہ مٹی اپنے ساتھ لاتا ہے، جو وادی کے قریب پھیل جاتی ہے۔ یہ مٹی زراعت کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔ دنیا کے زیادہ آبادی والے علاقے سیلابی میدانوں اور ڈیلٹا پر واقع ہیں، مثلاً چین، ہندستان وغیرہ۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دریا کی راہ میں کوئی بڑی چٹان حائل ہو جاتی ہے اور دریا کا پانی اس سے ٹکرا کر مخالف سمت میں ایک دم گرتا ہے۔ پانی کے اس طرح گرنے کو آبشار کہتے ہیں۔ پانی کے اس طرح ٹکرانے اور پلٹ کر چھوٹی چٹانوں پر گرنے سے یہ چٹانیں دھیرے دھیرے ٹوٹتی ہیں اور آبشار رفتہ رفتہ پیچھے ہٹتا رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ پانی کس شدت سے زمین کی توڑ پھوڑ میں مصروف ہے۔ بلندی کے اعتبار سے دنیا کے سب سے بلند آبشار کا نام اینجل ہے، جو وینز ویلا میں واقع ہے اور تین ہزار دو سو اکیاسی (۳۲۸۱) فیٹ بلند ہے۔ آبشار گوائیرا پانی کے بہاؤ کے اعتبار سے سب سے بڑا آبشار ہے۔ یہ برازیل میں ہے۔ یہاں سے پانی کے گزرنے کی سالانہ اوسط ۴۷۰۰۰۰ مکعب فیٹ فی سیکنڈ ہے۔

آپ نے چلتے ہوئے پانی کو دیکھا ہے، لیکن کیا آپ چلتی ہوئی برف سے بھی واقف ہیں؟ اسے گلیشیئر کہتے ہیں۔ برف کے ان بڑے بڑے ٹکڑوں نے زمین کی شکل و صورت بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ جب پہاڑوں پر برف بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو بوجھ سے نیچے کی برف پگھل کر پانی بن جاتی ہے اور برف کے بڑے بڑے ٹکڑے اس پانی پر پھسلنے لگتے ہیں۔ ایک زمانے میں شمالی ایشیا، یورپ اور شمالی امریکا کے بہت سے حصے گلیشیئر سے ڈھکے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گلیشیئر اب بھی دنیا کے اکثر پہاڑوں پر ملتے ہیں۔

جب گلیشیئر چلتے ہیں تو پہاڑ کی چوٹیوں کی چٹانوں کو توڑ کر اپنے ساتھ بہا لے جاتے ہیں اور میدان میں پہنچا دیتے ہیں۔ گلیشیئر کی وجہ سے بعض اوقات زمین پر موجود مٹی کھرچ جاتی ہے اور ایسی زمین پر ہر طرف پتھر ہی پتھر نظر آتے ہیں۔ ایسی زمین زراعت کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔

جب بارش ہوتی ہے تو پانی کا ایک حصہ زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ یہ پانی زمین کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مٹی میں کاربن ڈائی آکسائڈ ہوتی ہے۔ یہ گیس پانی کے ساتھ مل کر ایک ہلکا ترشا (ACID) بنا لیتا ہے، جسے کاربونک ایسڈ کہتے ہیں۔ اس ترشے میں چونے کا پتھر حل ہو جاتا ہے۔ اگر چٹان چونے کے پتھر کی بنی ہوئی ہے تو وہ پانی میں حل ہو کر اس کے ساتھ بہ جاتی ہے، جس کی وجہ سے زمین میں غار بن جاتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ کھوکھلی زمین نیچے دھنس جاتی ہے، جس سے نشیب پیدا ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ پانی جذب ہوتا ہوا ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں چٹانیں بہت گرم ہوتی ہیں، اس لیے پانی یہاں بہت گرم ہو جاتا ہے اور جب یہ پانی کسی جگہ سطح زمین سے باہر نکلتا ہے تو اس میں حرارت موجود ہوتی ہے۔

پانی کی طرح ہوا بھی زمین کی شکل و صورت تبدیل کرنے میں مصروف ہے۔ ہوا مٹی اور ریت کو اڑا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے اور جب ہوا ریت کے ذرات کو لے کر چٹانوں سے ٹکراتی ہے تو چٹان سے باریک باریک ذرے ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں۔ اس طرح ہوا چٹانوں کے توڑ پھوڑ میں سرگرمی سے حصہ لیتی ہے۔ ریگستان میں اکثر ریت کے بڑے بڑے تودے نظر آتے ہیں۔ یہ ہوا ہی کا کرشمہ ہے۔ چوں کہ اس ریت میں نمی نہیں ہوتی، اس لیے یہاں نباتی زندگی جنم نہیں لیتی اور وہ جگہ جو ہوا کے ذریعے سے لائے ہوئے ریت کے ذرات پر مشتمل ہو، ریگستان بن جاتی ہے۔

☆

موتیوں جیسی باتیں

لیلیٰ جلیل الرحمان یوسف زئی

☆ اگر آپ کم عمل کے ذریعے سے زائد اجر چاہتے ہیں تو کسی کے اُداس چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیں۔

☆ جس کے پاس مقصد نہ ہو، ان کے پاس منزل بھی نہیں ہوتی۔

☆ دوستی ایک ایسا سمندر ہے، جس کی گہرائی میں جتنا آگے بڑھتے جائیں، محبت کے بے شمار موتی ملتے چلے جائیں گے۔

☆ سونے کی آزمایش آگ میں ہوتی ہے اور بہادر لوگوں کی مشکلات میں۔

☆ تلوار کا زخم بدن پر لگتا ہے، جب کہ بُری بات کا زخم روح پر لگتا ہے۔

☆ اس شخص کی کوئی اہمیت نہیں، جو اپنی تعریف آپ کرے۔

☆ اللہ ہی وہ بے نیاز ہستی ہے، جس سے ہم کچھ بھی بے دھڑک مانگ سکتے ہیں۔

☆ اعتبار عمل میں ہوتا ہے، لفظوں میں نہیں۔

☆ یہ دنیا کے دریا کے کناروں پر پھیلی ہوئی ریت ہے، اسے چھانو گے تو پتا چلے گا کہ ہر ذرّہ سونا نہیں ہوتا۔

☆ ہر آدمی اپنا کل کھو چکا ہے۔ کام یاب وہ ہے، جو اپنا آج نہ کھوئے۔

☆ تم کبھی اپنے آپ سے جھوٹ نہ بولنا۔ اس طرح تم کبھی دنیا سے سچ بولتے ہوئے نہیں ڈرو گے۔

☆ تنکے کو بھی حقیر نہ سمجھو، ورنہ وہ تمھاری آنکھ میں چبھے گا۔

☆ نصیحت کرنے والا خود عمل نہ کرے تو وہ نصیحت فضول ہے۔

☆ جو انسان گناہ سے نہیں شرماتا وہ توبہ سے کیا شرمائے گا۔

☆ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، اسے سچ سمجھ لیتے ہیں۔ دوربین اور خوردبین نے ثابت کر دیا کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، وہ ویسا سچ نہیں ہوتا۔ مثلاً انسان سمجھتا ہے کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ عمر کم ہو رہی ہے۔

☆

فقیر کی دُعا

محمد ظریف خان

کسی ملک میں ایک تھا حکمراں — تھا ظلم و ستم جس کا ہر جا عیاں
رعایا بہت ظلم سے تنگ تھی — مگر رحم آتا نہ اُس کو کبھی
بہت وقت گزرا اسی طور سے — نہ چھٹکارا مل پایا اُس دور سے

اچانک وہاں اِک بزرگ آگئے — وہ اللہ والے بڑے نیک تھے
خبر اُن کے آنے کی جیسے ہوئی — سلامی کو مظلوم پہنچے سبھی
سنایا انھیں ظلم کا ماجرا — گزارش بھی کی پھر برائے دعا

وہ حالات سن کے وہ یہ بول اُٹھے: — ''خدا پادشہ کو فنا ہی کرے''
وہاں شاہ کے چند جاسوس تھے — جو فوراً یہ بات اُس سے کہنے گئے
سنا شاہ نے اُن سے جب واقعہ — وہ فوراً ہی پھر طیش میں آگیا

کہا: ''کھینچ کے لاؤ درویش کو — زباں اُس کی گُدّی سے پھر کھینچ لو''
سپاہی پکڑ لائے درویش کو — کہا شاہ نے ''تم بیاں اب کرو
کہ تم نے مجھ کو دی کیوں بد دعا ؟ — چکھاؤں گا میں تم کو اس کا مزا''

وہ بولے کہ جو کچھ بھی میں نے کہا — وہ ہے تیرے حق میں یقیناً دعا
اگر جلد مر جا تُو اے پادشہ! — تو کم تیرے ہوں گے یقیناً گنہ
کہ ظلم اور جو بہائے گا خوں — گناہوں کا پھر بوجھ ہو گا فزوں

سنی یہ حقیقت تو شرما گیا — وہ اپنے گناہوں سے تائب ہوا
رہا اُس نے درویش کو کر دیا — اور اِک اچھا انساں بھی بن گیا

خط کی اہمیت

نسرین شاہین

کہتے ہیں کہ خط آدھی ملاقات ہے۔ موبائل فون اور ای میل کے زمانے میں بھی آدھی ملاقات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، صرف طریقۂ کار تبدیل ہوا ہے، یعنی موبائل کے ذریعے ٹیکسٹ میسج اور کمپیوٹر انٹرنیٹ کے ذریعے ای میل بھیج کر آدھی ملاقات کر لینا۔ اس پر وقت تو بالکل ہی نہیں لگتا۔ اس کو یوں سمجھیے کہ پہلے پاکستان سے امریکا یا کینیڈا کے لیے جو خط پندرہ دن سے ایک ماہ میں پہنچتا تھا، اب صرف چند سیکنڈ میں منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور آپ اسی وقت جواب بھی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اتنی آسانی کے باوجود روایتی خط و کتابت کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔

خط لکھنا آج بھی ایک مفید اور دل چسپ مشغلہ ہے۔ دور دراز کے علاقوں اور دوسرے شہروں میں رہنے والے عزیز رشتے داروں کی خیریت دریافت کرنے، انھیں کوئی پیغام دینے اور انھیں اپنے حالات سے آگاہ کرنے کے لیے خط لکھنا ایک روایت ہے۔ موبائل میسج، ای میل، فیکس وغیرہ نئے دور کے پیغام رسانی کے ذریعے ہیں، مگر یہ تحریری خط کا نعم البدل نہیں ہیں۔ خط لکھنا ایک ایسا عمل ہے جو خط لکھنے والے کو بھی خوشی فراہم کرتا ہے اور خط پڑھنے والے کو بھی، کیوں کہ جب ہم اپنے کسی عزیز، رشتے دار یا دوست کو خط لکھتے ہیں تو اپنے احساسات اور دلی کیفیات کا اظہار خوب سوچ سمجھ کر اچھے سے اچھے لفظوں سے کرتے ہیں اور لفظ ہماری شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھتے وقت ہم ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو ہمارے جذبات اور احساسات کا اظہار کر سکیں۔ یہ عمل بذاتِ خود ایک خوش گوار تاثر رکھتا ہے۔ اچھے سے اچھے الفاظ کا انتخاب کر کے ہم اپنے گھر والوں رشتے داروں اور دوستوں سے اپنی محبت کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔

دوسری طرف جب ہمارا خط ہمارے عزیز، رشتے دار یا دوست کے ہاتھ میں پہنچتا ہے تو اسے ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوتی ہے اور وہ بے چین ہو جاتا ہے کہ بس جلدی سے لفافہ کھول کر

خط پڑھ لے۔ جیسے جیسے خط پڑھا جاتا ہے، ویسے ویسے خط پڑھنے والے کے دل میں خط لکھنے والے سے قربت بڑھتی جاتی ہے، یعنی خط لکھنا اور خط پڑھنا دونوں ہی ایک دوسرے کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ خط لکھنے والے کو اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ اُس نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھا اور دلی احساسات کا اظہار کیا، جب کہ خط پڑھنے والے کو اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ ان کے دوست نے انھیں نہ صرف یاد رکھا بلکہ خط لکھ کر اہمیت دی۔ ظاہر ہے پھر وہ بھی خط کا جواب دیں گے، پھر خط بھیجنے والے کی خوشی قابلِ دید ہوگی کہ مجھے میرے لکھے ہوئے خط کا جواب مل گیا، بالکل اس طرح جب کوئی بچہ کسی میگزین یا اخبار میں خط لکھتا ہے، خط چھپنے اور جواب ملنے پر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے اور جواب نہ ملنے پر افسوس ہوتا ہے۔

خط لکھنے کا ذکر آیا ہے تو خط پر پتا لکھنے کی بات کیوں نہ ہو۔ خط پر پتا لکھنا اسی قدر اہم ہے جتنا خط کا متن۔ اس کو ایک بالکل سادہ مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیا، آپ نے ایک بہت اہم خط لکھا ہے، لیکن پتا غلط لکھ دیا ہے تو ظاہر ہے خط اپنے اصل مقام تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خط پر احتیاط سے صاف پتا لکھنا کتنا اہم اور ضروری ہے۔ درحقیقت خط پر آپ کا درج کردہ پتا وہ "چہرہ" ہے، جس سے آپ اپنے مخاطب سے ملتے ہیں۔

پتا باہم رابطے کا سب سے اہم حصہ ہے۔ پتا چاہے کسی کے گھر کا ہو، کسی ادارے کا ہو یا کسی عمارت وغیرہ کا، وہ سب سے پہلے اپنے وجود کی نشان دہی کرتا ہے۔ اگر کوئی پتا واضح نہیں ہے تو اس کو مختلف طریقوں سے درست کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر وہ سرے سے غلط یا اتنا نامکمل ہو کہ درست مکتوب الیہ (جنھیں خط لکھا جائے) کی نشان دہی ممکن نہ ہو تو وہ خط منزل پر پہنچ ہی نہیں سکے گا، پھر وہ غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے گا یا آپ پاس واپس آ جائے گا۔

اب تو انٹرنیٹ نے خط و کتابت کا تصور ہی تبدیل کر دیا ہے اور حقیقتاً مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ اس میں بھی پتا لکھنے میں پوری توجہ درکار ہے، ہر لحاظ سے کہ آپ جو بھی پتا درج کریں، وہ بالکل صاف، واضح اور ہر اعتبار سے مکمل ہو۔ پتا انگریزی میں ہو تو بہتر ہے کہ آپ بڑے

حروف (کیپٹل لیٹرز) میں پتا لکھنے کی عادت ڈالیں اور ساتھ ہی اردو میں بھی پتا درج کر دیں تو اس طرح کسی شک وشبے کی گنجایش نہیں رہتی۔ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ بہت سارے علاقوں میں آس پاس ہی یا تو ملتے جلتے نمبروں والے پتے ہو سکتے ہیں یا پھر دوسرے بلاک وغیرہ میں نمبروں کی یہی تکرار ہو سکتی ہے۔

دیہی علاقوں میں پتا درج کرنے کا طریقہ خاصا مختلف ہے۔ اس میں سب سے پہلے شہر کا نام لکھا جاتا ہے، جس کی حدود میں یا جس کے نزدیک ترین وہ گاؤں واقع ہے۔ پھر ضلع، تحصیل اور گاؤں کے ڈاک خانے کا نام، مرکزی سڑک جو اسے شہر سے ملاتی ہے، اس کا نام اور پھر آخر میں جا کر مکتوب الیہ کا نام ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہاں بھی براہ راست نہیں بلکہ "فلاں کو مل کر فلاں کو ملے" لکھا جاتا ہے۔ کبھی گاؤں کا دکان دار بھی اس حوالے سے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ مثلاً عبداللہ دکان دار کو مل کر عبدالرحمٰن کو ملے۔ اسی طرح گاؤں کا چودھری اور نمبردار وغیرہ ایسے لوگ ہیں، جو اس ضمن میں ذریعہ بن جاتے ہیں۔

شہروں میں تو پوسٹ بکس نمبر بھی کافی ہوتا ہے۔ خصوصاً سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کے ممالک اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں میں تو یہ بہت ہی عام بات ہے۔ ہر صورت میں پوسٹ بکس اور پوسٹ کوڈ نمبر لکھنا بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ امریکا اور کینیڈا اہمیت ترقی یافتہ ملکوں میں جہاں تمام آبادی کا مکمل کمپیوٹر ائزڈ ریکارڈ رکھا جاتا ہے، وہاں آپ صرف کسی کا نام، پوسٹ کوڈ اور ٹیلے فون نمبر بھی لکھ دیں تو آپ کا خط درست پتے پر پہنچ جاتا ہے۔

اپنے عزیز، دوست اور رشتے داروں سے آدھی ملاقات کرنے سے پہلے خط کے لفا
پر مکمل پتا بالکل صاف اور واضح لکھیے اور خط کی پشت پر اپنا نام اور اپنا مکمل پتا تحریر کریں، کیوں ک
خط پر پتا لکھنا اتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا کہ خط کا متن۔

خط نویسی معاشرے کی دم توڑتی روایت ہے، جسے نئی نسل بالخصوص بچے زندہ رکھ سکتے ہیں، اپ
پیاروں کو خط لکھ کر اور جن کو وہ خط لکھیں گے، وہ ان کے خط پا کر حیران اور خوش ہو جائیں گے۔ ☆

وقت کی اہمیت

مسعود احمد برکاتی

آج کل کی زندگی بڑی مصروف زندگی ہے۔ ہر آدمی کاموں کی کثرت کی شکایت کرتا ہے۔ فقرہ عام ہے کہ وقت نہیں ملتا۔ یہ بات ہے تو صحیح، مگر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا وقت کم ہے؟ یا وقت یادہ ہے؟ اس کا فیصلہ کرنا تو بہت مشکل ہے، لیکن جتنا وقت ہے یا جتنا وقت کسی شخص کو ملتا ہے وہ م نہیں ہوتا۔ عمر کا اوسط تو تقریباً برابر ہی ہے۔ بعض لوگ بہت ہی کم عمر پاتے ہیں اور بعض لوگوں و زیادہ مہلت ملتی ہے، لیکن جہاں تک کام کے لیے وقت کا سوال ہے، اس کا تعلق عمر سے نہیں ہے، وقت کو کام میں لانے سے ہے۔ دنیا میں جن لوگوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں، ان میں ہت کم لوگ ایسے ہوئے ہیں، جنھوں نے بڑی عمر پائی۔ انھوں نے جو کچھ کام کیے، وہ اوسط عمر ہی کے اندر انجام دیے اور زندگی نے جو مہلت اُن کو دی تھی، اس سے انھوں نے پوری طرح فائدہ ٹھایا، وقت ضائع نہیں کیا اور بڑے بڑے کام کر کے نام پایا۔

کسی کا کیا عمدہ قول ہے کہ آدمی جتنا زیادہ مصروف ہوتا ہے، اس کے پاس اتنا ہی زیادہ ت ہوتا ہے۔ بظاہر تو یہ بات عجیب سی معلوم ہوگی، لیکن غور کریں تو بالکل صحیح ہے۔ مصروف آدمی ت کی قیمت جانتا ہے اور اس کو بالکل ضائع نہیں جانے دیتا۔ جو وقت بھی اس کو ملتا ہے اس کو وہ ام میں لے آتا ہے، اس لیے اس کو وقت کی کمی کی شکایت نہیں ہوتی۔ جو آدمی بے کار ہوتا ہے، م مصروف ہوتا ہے وہ وقت کی قیمت نہیں جانتا۔ جس طرح کسی بزرگ کو آپ نہ پہچانتے ہوں وہ پ کے پاس سے گزر جائیں، مگر آپ کو پتا نہ چلے کہ ایک بزرگ ہستی آپ کے قریب آئی تھی، ر آپ نے اس کو روکا نہیں اور اس سے فیض نہیں اُٹھایا۔ اسی طرح وقت بھی گویا ایک ایسی ہستی ہے کہ جو آدمی اس کو نہیں پہچانتا وہ اس سے فائدہ نہیں اُٹھا پاتا اور وقت گزر جاتا ہے۔

جتنا وقت بھی ملے، اس کو کام میں لایا جائے تو وہی وقت بہت ہے اور اسی وقت میں دنیا کو ینے والے کارنامے انجام دیے جا سکتے ہیں۔ ☆

پھلوں کی وادی

محمد سیف اللہ بھابڑوی

پھلوں کی وادی "کوئٹہ" دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں ہر موسم میں پھل ملتے ہیں، جو ذائقے اور لذت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ خشک میوے یہاں کی خاص سوغات ہیں۔ ان میں بادام، پستے، چلغوزے اور اخروٹ شامل ہیں۔ کوئٹہ شہر سے باہر نکلیں تو چھوٹے چھوٹے بہت سے باغات نظر آتے ہیں جن میں سیب، آڑو، بادام، خوبانی، چیری اور انگور کے باغات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ موسمِ بہار میں پھل دار اور پھول دار پودے عجب دلفریب منظر پیش کرتے ہیں اور قدرتی مناظر اور بھی نکھر کر سامنے آتے ہیں۔

کوئٹہ انگوروں کا گھر ہے اور آس پاس کے علاقوں کے انگور بھی یہاں آ کر بکتے ہیں۔ انگوروں کی یوں تو بہت سی قسمیں ہیں، لیکن صاحبی اور سُندر خانی انگور خاص طور پر مشہور ہیں۔ صاحبی انگور تو اتنا نازک ہوتا ہے کہ یہ کوئٹہ سے باہر کم ہی بھیجا جاتا ہے۔ اس کا رنگ عموماً گلابی ہوتا ہے اور اس کے گچھوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ کسی نے گل دستہ بنا دیا ہے۔ سُندر خانی انگور بہت ہی خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ یہ انگلی کی پوری طرح لمبا ہوتا ہے اور دوسرے انگوروں کے مقابلے میں مہنگا ہوتا ہے۔

کوئٹہ سے چند میل کے فاصلے پر "اُڑک وادی" ہے۔ اس وادی کو کوئٹہ کا ثمرستان کہتے ہیں۔ اس وادی میں ہر طرف پھلوں کے باغات نظر آتے ہیں، جہاں ہر سال ہزاروں من پھل پیدا ہوتا ہے۔ خوبانی، آلوچہ، خربوزہ اور تربوز اس وادی کے مشہور پھل ہیں۔

موسمِ بہار میں مارچ کے آخر سے لے کر اپریل کے وسط تک درختوں پر پھول نکل آ ہیں۔ مئی کے مہینے میں درخت شہتوت سے لد جاتے ہیں۔ اس کے بعد شاہ دانہ کی باری آ ہے۔ ابھی شہتوت اور شاہ دانہ ختم نہیں ہوتے کہ خوبانی پکنے لگتی ہے۔ ساتھ ہی آڑو اور آلوچے بازار میں آنا شروع ہو جاتے ہیں اور انگور تو ستمبر تک چلتے ہیں۔ کوئٹہ کے پھل پاکستان کے بڑ شہروں سے لے کر دوسرے چھوٹے شہروں اور قصبوں تک بھیجے جاتے ہیں۔ یہ پھل دوسرے ملکو کو بھی بھیجے جاتے ہیں اور ان سے پاکستان کو اچھی آمدنی ہوتی ہے۔

کائنات میں زندگی کی تلاش

اب تک ہزاروں ایسے سیاروں اور چاندوں کا پتا چلایا گیا ہے، جہاں زندگی ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ سائنس دانوں نے ایسے سیاروں اور چاندوں کی دو فہرستیں تیار کی ہیں، جہاں

کسی دوسری مخلوق یا زندگی کا امکان موجود ہے۔ ایک فہرست ان سیاروں اور چاندوں کی ہے جو زمین جیسے ہیں۔ اسے "ارتھ سمیلیرٹی" کہا جاتا ہے۔ دوسری فہرست میں وہ اجرام فلکی شامل کیے گئے ہیں، جہاں زندگی کا امکان دکھائی دیتا ہے۔ اسے "پلینٹری ہیبیٹی" کا نام دیا گیا ہے۔ ان فہرستوں میں زمین کے علاوہ سیارہ زحل کا چاند "ٹائٹن" اور زمین سے ساڑھے بیس نوری سال کے فاصلے پر واقع "لبرا" نامی کہکشاں میں موجود "G-581" نامی سیارہ بھی شامل ہے۔ ایک نوری سال سے مراد وہ فاصلہ ہے، جو روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ (ایک نوری سال میں تقریباً دس کھرب کلومیٹر ہوتے ہیں)

گزشتہ چند برسوں میں ایسی دنیاؤں کی تلاش میں تیزی آئی ہے، جہاں زندگی کی موجودگی کے امکان ہو سکتے ہیں۔ نظامِ شمسی میں موجود جن سیاروں پر زندگی کے امکانات ہو سکتے ہیں، ان میں مریخ اور عطارد شامل ہیں۔

☆

ایک سال کی زندگی

سائرہ غفار

نام تو ان کا قطب الدین تھا، لیکن سب انھیں حاجی بھائی کہتے تھے۔ وہ عام سے محنتی، خوش مزاج اور قناعت پسند انسان تھے۔ ایک دن صبح سویرے وہ جنگل میں بیر جمع کر رہے تھے کہ ایک خرگوش لنگڑاتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا تھا۔ حاجی بھائی نے جب وہ کانٹا نکالا تو وہ خرگوش ایک پری بن گیا۔ پری نے حاجی بھائی سے کہا کہ میں تمھاری کوئی ایک خواہش پوری کر سکتی ہوں۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد انھوں نے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ مجھے پتا چل جائے کہ میں اور کتنے دن زندہ رہوں گا، تا کہ میں اسی حساب سے اپنے گھر والوں کے لیے کچھ کر کے جاؤں۔''

پری بولی: ''ٹھیک ہے حاجی بھائی! آپ اس درخت کے سائے میں سو جائیں۔ جب

آپ کی آنکھ کھلے گی تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کی زندگی کے اور کتنے دن رہ گئے ہیں۔"

حاجی بھائی خوشی خوشی درخت کی چھاؤں میں سو گئے۔ جب وہ گہری نیند سے جاگے تو پری وہاں سے جا چکی تھی۔ اچانک ایک آواز سنائی دی: "حاجی بھائی! تمھاری زندگی کا صرف ایک سال باقی ہے۔" بولنے والا دکھائی نہیں دیا۔

حاجی بھائی نے سوچا، میرے پاس صرف ایک سال باقی ہے۔ مجھے جلدی جلدی گھر جانا چاہیے اور اپنے گھر والوں کے لیے اچھی زندگی گزارنے کا انتظام کرنا چاہیے، تاکہ وہ لوگ میرے مرنے کے بعد بھی اچھی زندگی گزار سکیں۔ یہ سوچتے ہی حاجی بھائی گھر کی طرف دوڑے۔ ہانپتے کانپتے جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو ان کی بیوی زرینہ نے ان سے پوچھا: "حاجی صاحب! آپ کے لیے ناشتا لگا دوں؟"

حاجی بھائی نے جلدی سے کہا: "نہیں نہیں، مجھے تم لوگوں کی اچھی زندگی کے لیے بہت سارے کام کرنا ہیں۔ میرے پاس صرف ایک سال کی زندگی ہے۔ میں اسے کھانے پینے میں برباد کروں گا تو بعد میں تم لوگ اچھی زندگی نہیں گزار سکو گے۔"

زرینہ نے حیرت سے پوچھا: "کیا مطلب! ایک سال کی زندگی؟"

حاجی بھائی الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولے: "میں ایک سال بعد مر جاؤں گا۔ تمھیں ساری کہانی سناؤں گا تو بہت وقت برباد ہو جائے گا۔ مجھے بہت کام کرنے ہیں بھئی۔"

زرینہ نے یہ سنا تو چیختے ہوئے اپنی بیٹی پارس اور بیٹے احمد کو بلایا۔ پارس اور احمد دوڑ کر آئے تو زرینہ روتے ہوئے بولی: "میرے بچو! تمھارے ابا ایک سال کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔" دونوں بچے بھی یہ بات سن کر رونے لگے۔

حاجی بھائی بوکھلا گئے کہ وہ کوئی کام کریں یا اپنے گھر والوں کو سمجھائیں۔ حاجی بھائی نے زور سے کہا: "خاموش رہو تم سب لوگ۔" سب لوگ سہم کر چپ ہو گئے۔

حاجی بھائی نے تجوری کھول کر پیسے اور زیور دیکھا، پھر افسوس سے سر ہلا کر بولے: "میں نے اپنی ساری زندگی دوسروں کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی۔ یہاں تک کہ اپنی جمع پونجی کا بڑا حصہ دوسروں پر خرچ کر دیا۔ افسوس، میں اپنے گھر والوں کے لیے زیادہ انتظام نہیں کر پایا۔ اگر میں نے سارے پیسے جمع کیے ہوتے تو آج مجھے افسوس نہ ہوتا۔"

پھر حاجی بھائی نے تجوری بند کی اور زرینہ سے کہا: "میں کام کرنے جا رہا ہوں۔ آج سے میں صرف فیکٹری میں نہیں، بلکہ اور جگہ بھی کام کروں گا، تاکہ تم لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ پیسے اکٹھے کر سکوں اور تم لوگ میرے مرنے کے بعد سکون و آرام سے زندگی گزار سکو۔ ویسے بھی میں صرف ایک ہی سال تو جیوں گا۔" یہ کہہ کر حاجی بھائی باہر چلے گئے۔

پارس اور احمد رونے لگے تو زرینہ بولی: "مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں کے ابا کی طبیعت خراب ہے۔ ہمیں ڈاکٹر طبیب سے بات کرنی چاہیے۔"

اُدھر حاجی بھائی شام تک فیکٹری میں کام کرتے رہے، پھر وہاں سے نکلے تو ایک زیرِ تعمیر عمارت میں مزدور کی حیثیت سے کام کیا، پھر وہاں سے رات گئے فارغ ہوئے تو سوچا کہ کچھ اور بھی کام کرنا چاہیے، مگر سارا شہر سنسان پڑا تھا۔ وہ تھکے ہارے گھر لوٹے تو ڈاکٹر طیب موجود تھے، وہ بولے: ''آپ کو کس نے بتایا کہ آپ کے پاس صرف ایک سال ہے اور اُس کے بعد آپ مر جائیں گے؟''

حاجی بھائی نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا: ''میں یہ بتانے بیٹھا تو بہت وقت نکل جائے گا اور ابھی تو مجھے احمد کو کوئی ہنر سکھانا ہے، تاکہ کل کو میرے بعد وہ اس گھر کو چلا سکے۔''

زرینہ نے پریشان نظروں سے ڈاکٹر طیب کی طرف دیکھا تو انھوں نے زرینہ سے کہا: ''ایسا لگتا ہے، حاجی بھائی کسی نجومی یا دست شناس کے پاس سے ہو کر آئے ہیں اور اُسی نے انھیں بتایا ہے کہ یہ ایک ہی سال جی پائیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔ چند دن ان کی یہی کیفیت رہے گی، مگر پھر آہستہ آہستہ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر طیب سب کو تسلی دے کر چلے گئے۔ حاجی بھائی، احمد کو سمجھانے لگے: ''دیکھو بیٹا! زندگی میں آسانی اور سکون حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ایک آسودہ اور خوش حال زندگی گزاریں تو اس کے لیے سخت محنت کرنا ضروری ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' یہ سن کر احمد نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

صبح ہوتے ہی حاجی بھائی فیکٹری کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ گھر سے نکلتے ہی اُن کو ایک بوڑھا محلے دار اکبر مل گیا۔ اکبر نے حاجی بھائی سے کہا: ''بیٹا! ذرا میرا یہ بل تو جمع کروا دینا۔ پچھلی بار بھی تم نے ہی جمع کرایا تھا۔''

حاجی بھائی نے جلدی سے کہا: ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ اپنا بل خود جمع

کروالیں۔'' یہ کہہ کر حاجی بھائی آگے بڑھ گئے۔

گلی کے کونے پر وہ بچہ بیٹھا تھا، جس سے حاجی بھائی روزانہ اپنے جوتے پالش کرواتے تھے۔ اُس نے حاجی بھائی کو دیکھتے ہی ہانک لگائی: ''حاجی بھائی! آیئے، آپ کے جوتوں کو پالش کر کے ایک دم چمکا دوں۔''

حاجی بھائی تیزی سے اُس کے سامنے سے گزرتے ہوئے بولے: ''میرے پاس فالتو پیسے نہیں ہیں، جو میں اپنے جوتے پالش کروانے پر ضائع کرتا پھروں۔'' حاجی بھائی یہ کہہ کر تیزی سے وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ جوتے پالش کرنے والا بچہ حاجی بھائی کا منھ دیکھتا رہ گیا۔ حاجی بھائی آگے بڑھے تو انھیں غریب بیوہ آمنہ خاتون ملیں: ''السلام علیکم حاجی بھائی! کیسے ہیں آپ؟ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

حاجی بھائی نے تیزی سے کہا: ''وعلیکم السلام...... میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

آمنہ خاتون بولیں: ''حاجی بھائی! آپ سب غریبوں کی ضرورت پڑنے پر مدد کرتے ہیں۔ مجھے چند روپوں کی اشد ضرورت ہے، کیوں کہ مجھے اپنے بیٹے کا اسکول میں داخلہ کروانا ہے۔ جیسے ہی میرے پاس روپے جمع ہوں گے، میں فوراً آپ کو واپس کر دوں گی۔''

حاجی بھائی نے تیوری پر بل چڑھا کر کہا: ''دیکھو بی بی! میں نے کوئی بینک یا خیراتی ادارہ نہیں کھول رکھا۔ میں خود ایک سفید پوش آدمی ہوں۔ تم خواہ مخواہ میرا وقت برباد کر رہی ہو۔ مجھے بہت کام کرنے ہیں۔ میں تم جیسوں کے ساتھ اپنا وقت برباد کرنے لگا تو ہو چکا میرا کام...... خدا حافظ۔'' یہ کہہ حاجی بھائی تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ حاجی بھائی وہاں سے بڑھ کر فیکٹری جانے والے راستے پر ہو لیے۔ وہ دل ہی دل میں اُن تمام لوگوں کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے، جنھوں نے اُن کی دریا دلی کی وجہ سے اُن سے خواہ مخواہ کی اُمیدیں باندھ لی تھیں۔ ابھی وہ آدھے راستے میں ہی تھے کہ دو نقاب پوش ڈاکو اُن کے سامنے آ کر کھڑے

ہو گئے۔ اُن دونوں کے ہاتھ میں پستول تھے۔ اُن میں سے ایک نے حاجی بھائی کا گریبان پکڑ کر کرخت لہجے میں کہا: ''جو بھی کچھ ہے، وہ میرے حوالے کردو، ورنہ گولی ماردوں گا۔''

یہ سن کر حاجی بھائی ہنسنے لگے۔ ڈاکو کو غصہ آگیا، بولا: ''ہمارا مذاق اُڑاتا ہے؟ اب تو تجھے اوپر جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

حاجی بھائی نے اطمینان سے کہا: ''تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ میری تو پورے ایک سال کی زندگی باقی ہے۔ تم مجھے ایک سال سے پہلے اوپر نہیں بھیج سکتے۔''

دونوں نقاب پوش حاجی بھائی کی بات سن کر ہنسنے لگے۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو کچھ اشارہ کیا۔ پھر ایک ڈاکو نے اچانک حاجی بھائی کو دھکا دیا۔ حاجی بھائی فٹ پاتھ پر گر گئے اور سر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں، پھر انھیں کچھ ہوش نہ رہا۔ نقاب پوش لٹیروں نے حاجی بھائی کی جیبیں خالی کیں اور بھاگ گئے۔ حاجی بھائی کو ہوش آیا تو وہ اسپتال کے ایک بیڈ پر تھے۔ ڈاکٹر طیب کے ساتھ گھر والے بیڈ کے گرد کھڑے تھے۔ جیسے ہی حاجی بھائی نے آنکھیں کھولیں، ویسے ہی سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ حاجی بھائی نے اُٹھنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر طیب نے کہا: ''نہیں حاجی بھائی! ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

حاجی بھائی نے زرینہ، پارس اور احمد کی طرف دیکھا تو اُن کو اچانک یاد آیا کہ اُن کی زندگی بس تھوڑی ہی باقی ہے۔ حاجی بھائی ابھی کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ روشنی کا ایک جھما کا سا ہوا اور وہاں وہی پری نمودار ہوئی، جس نے حاجی بھائی کو بتایا تھا کہ اُن کی ایک سال کی زندگی باقی ہے۔ حاجی بھائی نے پری کو دیکھتے ہی کہا: ''یہ دیکھو! اسی پری نے مجھے بتایا تھا کہ میری ایک ہی سال کی زندگی باقی ہے۔ تم سب کو مجھ پر یقین نہیں ہے تو پوچھ لو اس پری سے۔''

سب لوگ پری کی طرف دیکھنے لگے۔ پری مسکرائی پھر بولی: ''ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے ہی

حاجی بھائی کو بتایا تھا کہ ان کی بہت تھوڑی سی زندگی باقی رہ گئی ہے۔ انھوں نے میری پریشانی دور کی تھی اور میں نے حاجی بھائی کی خواہش پر انھیں بتایا تھا کہ یہ ایک سال زندہ رہیں گے۔''

پری نے رک کر سب کے چہروں کا جائزہ لیا، سب منھ کھولے حیرت سے پری کی باتیں سن رہے تھے، پری مزید بولی: ''لیکن یہ سچ نہیں تھا۔''

حاجی بھائی چیخ پڑے: ''کیا؟''

پری بولی: ''حاجی بھائی! میں معذرت چاہتی ہوں کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا، مگر میں نے یہ آپ کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔ دیکھیے! جیسے ہی آپ کو معلوم ہوا کہ آپ صرف ایک سال اور زندہ رہیں گے تو آپ سب ہمدردیاں، نیکیاں، بھلائیاں چھوڑ چھاڑ کر خود غرض بن گئے۔ اب آپ محض اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ آپ کے نزدیک اپنے گھر والوں کے لیے ایک پُر آسایش زندگی کا حصول ہی سب سے اہم کام تھا۔ آپ کا چین، بھوک، پیاس، نیند سب حرام ہو گیا، مگر آپ بھول گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ایسا نہیں، جسے غیب کا علم ہو اور یہ بات بھی صرف اللہ کو ہی معلوم ہے کہ کون کتنے عرصے تک زندہ رہے گا۔ ہم سب یہ علم نہیں رکھتے اور آپ نے دیکھ ہی لیا کہ یہ علم ہو جانا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔''

پری بات ختم کر کے حاجی بھائی کی طرف دیکھنے لگی تو وہ بولے: ''واقعی میں بڑی غلطی پر تھا۔ یہ ہم پر اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں اس علم سے محروم رکھا۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنی بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں۔ زندگی تو خدا کی امانت اور دوسروں کی خدمت کے لیے ہوتی ہے۔'' اس کے بعد حاجی بھائی نے آسمان کی طرف منھ کر کے کہا: ''خدایا! مجھے معاف کرنا میں غلطی پر تھا۔''

سب کے منھ سے بے اختیار نکلا: ''آمین۔'' پری اچانک غائب ہو گئی اور حاجی بھائی شرمندہ نظروں سے سب سے معافی مانگنے لگے۔ ☆

سچی باتیں کہتا تھا وہ

خلیل جبار

طب کا روشن ایک جہاں تھا
وہ ہمدرد کا روح رواں تھا

روشن علم کے جو یہ دیے ہیں
سب اس کی محنت کے صلے ہیں

سر سید سا کام کیا ہے
علم کو گھر گھر عام کیا ہے

علم کا شہر بسایا اس نے
لکھنے کا شوق دلایا اس نے

''جاگو جگاؤ'' لکھتا تھا وہ
سچی باتیں کہتا تھا وہ

اچھی محفل اس نے سجائی
حکمت اچھی اس نے بتائی

آؤ، ہم بھی کچھ کر جائیں
سب کو اس کی بات بتائیں

بے غرض نیکی

پروفیسر رئیس فاطمہ

بہت دنوں کا ذکر ہے کہ ہندستان کے ایک چھوٹے سے شہر شاہ پور میں ایک موچی رہتا تھا۔ اس کے تین بچے تھے، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ موچی کی بیوی گھر پر سلائی کا کام کرتی تھی۔ دونوں بیٹیاں جن کی عمریں چودہ اور پندرہ سال تھیں، گھر کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹاتی تھیں اور محلے کے بچوں کو قرآن پاک کا سبق بھی پڑھاتی تھیں۔ یوں اس خاندان کا گزارا ہو جاتا تھا۔ موچی مختار علی ایک قناعت پسند انسان تھا، جو اپنی روکھی سوکھی میں خوش تھا، لیکن اپنے بیٹے رحمان کو پڑھانا چاہتا تھا، جو محلے کی مسجد میں مولوی صاحب سے عربی، فارسی اور اردو پڑھنے جاتا تھا۔ رحمان بہت ذہین اور محنتی بچہ تھا۔ دو سال میں اس نے قرآن بھی ختم کر لیا اور اردو، عربی میں خاصی صلاحیت پیدا کر لی، لیکن آگے کی تعلیم کے لیے اسے شہر جانا تھا، جو مختار موچی کی حیثیت سے باہر تھا۔ ایک دن رحمان نے مولوی صاحب سے اس بات کا ذکر کیا کہ اب وہ آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکے گا۔ مولوی صاحب نے اس سے کہا کہ انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے اور اس کے باپ کو بلا کر سمجھایا کہ اگر وہ بیٹے کو کسی قابل بنانا چاہتا ہے تو اسے دلّی کا سفر کرنا پڑے گا، جہاں بادشاہ نے ایسے مدرسے اور مکتب بنوائے ہیں، جہاں غریبوں کے بچے علم حاصل کر سکیں۔ مختار موچی نے کہا کہ وہ کیسے اپنے آبائی گھر اور قصبے کو چھوڑ کر اتنی دور دلّی جائے، جہاں اس کا کوئی بھی جاننے والا نہیں۔

مولوی صاحب نے کہا: ''خدا ہر جگہ موجود ہے۔ زمین خدا کی ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علم حاصل کرو، چاہے اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے اور پھر ہجرت کرنا تو سنتِ نبویؐ ہے اور پھر وہاں اللہ کے نیک بندے حضرت نظام الدین اولیا سلطان جی بھی تو ہیں۔ بس ان کے در پہ جا پڑنا، باقی سب اللہ کے سپرد کر دینا۔''

مختار موچی کو اپنے ہونہار بیٹے کا مستقبل عزیز تھا، سو اس نے اپنا چھوٹا سا مکان بیچ دیا اور دِلّی جانے کی تیاری مکمل کر لی۔ جانے سے ایک دن پہلے مولوی صاحب نے رحمان کو اپنے بلایا اور کہا: ''بیٹا! میری ایک بات یاد رکھنا۔ اپنی زندگی کا مقصد دوسروں کی مدد کرنا بنا لینا، کیوں کہ انسان کو اشرف المخلوقات اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان زمین پر خدا کا نائب ہے اور نائب ہونے کے ناتے اس کا یہ فرض ہے کہ وہ انسانوں کے کام آئے اور یہ بھی یاد رکھنا کہ نیکی ہمیشہ کرنا، لیکن صلے سے بے نیاز ہو کر۔ کبھی یہ سوچ کر نیکی نہ کرنا کہ تمھیں اس کا صلہ ملنا چاہیے، لیکن یہ بھی مت بھولنا کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور انعام ضرور دیتی ہے۔ بے غرض نیکی ہی انسانیت کی معراج ہے۔''

رحمان نے سر جھکا کر توجہ سے مولوی صاحب کی بات سنی اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی باتیں کبھی نہیں بھولے گا۔

☆☆☆

چار دن کے تھکا دینے والے سفر کے بعد مختار موچی اپنے خاندان کے ساتھ دِلّی پہنچا تو وہ مولوی صاحب کی ہدایت کے مطابق تانگے میں بیٹھ کر سلطان جی کے مقبرے پہ جا پہنچے اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ مزار پر زردہ تقسیم ہو رہا تھا، جو ایک سکھ یاتری بانٹ رہا تھا، جس کی کوئی منت پوری ہوئی تھی۔ رحمان اور اس کی بہنوں کو بہت بھوک لگ رہی تھی، لیکن وہ خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک مزار کے ایک متولی کی نظر اس خاندان پر پڑ گئی۔ وہ جلدی جلدی چلتے ہوئے ان کے قریب پہنچے اور پوچھا کہ وہ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟ جب انھیں پتا چلا کہ وہ ایک دور دراز قصبے شاہ پور سے آئے ہیں تو انھوں نے پہلے ان کو تبرک بھجوایا اور بعد میں انھیں مزار کے اطراف میں بنے حجروں میں سے ایک حجرہ رہنے کو دے دیا اور کہا کہ جب تک ان کو کوئی معقول روزگار نہیں ملتا، وہ یہاں بڑے آرام سے رہ سکتے ہیں۔

ابھی انھیں یہاں آئے چند دن گزرے تھے، دونوں وقت کا کھانا اور ناشتا انھیں مزار کی

انتظامیہ کی طرف سے مل جاتا تھا۔ مختار موچی درگاہ کے داخلی دروازے پر بیٹھ کر جوتے گانٹھنے لگا۔ اس طرح تھوڑی بہت آمدنی ہونے لگی۔ رحمان ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا سبق دہراتا رہتا تھا۔ ایک دن رحمان جب مطالعے میں مصروف تھا تو اس کے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی، اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو سونے کا ایک ہار اس کے پیروں میں پڑا چمک رہا تھا۔ رحمان نے وہ ہار اُٹھایا اور جیب میں رکھ لیا اور جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اس عورت کو ڈھونڈ رہا تھا، جو کچھ دیر پہلے اس کے قریب بیٹھی تھی۔ وہ ایک ہندو عورت تھی۔ اچانک رحمان کی نظر اس عورت پر پڑ گئی۔ وہ سلطان جی کے مزار کے باہر بنی ہوئی سیڑھیوں پہ ماتھا ٹیک کر رو رہی تھی۔ رحمان اس کے قریب پہنچا اور آہستہ سے بولا: ''دیدی!''

اس عورت نے چہرے اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا: ''کیا بات ہے رے چھورے؟''

رحمان نے پوچھا: ''دیدی! تمھاری گلے میں کوئی ہار تھا؟''

اچانک اس عورت نے اپنے گلے پہ ہاتھ مارا: ''ہائے میرا ہار! میرا شوہر تو مجھے مار ہی ڈالے گا۔'' وہ عورت رو پڑی۔

''دیدی! دیکھو! یہ تو نہیں ہے تمھارا ہار؟'' رحمان نے جیب سے ہار نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔

''ہاں، ہاں یہی تو ہے ہمارا ہار۔'' وہ اپنے آنسو پونچھ کر خوش ہو کر بولی: ''پر یہ تجھے کہاں سے ملا؟''

''یہ میرے پیروں کے پاس پڑا تھا اور تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے تمھارے گلے میں دیکھا تھا۔ اگر تم نہ ملتیں تو میں اعلان کروا دیتا کہ جس کا ہار گم ہوا ہے، وہ نشانی بتا کر لے جائے۔'' رحمان نے جواب دیا۔

اتنی دیر میں بڑی سی پگڑی باندھے ایک مرد آتا دکھائی دیا۔

''کون ہے یہ چھورا؟'' اس نے عورت سے پوچھا۔ اس نے اپنے شوہر کو ساری بتائی تو وہ خوش

ہو کر بولا: ”کسی نیک ماں باپ کی اولاد ہو، ورنہ دس تولے کا ہار کوئی کب واپس کرے ہے۔“

اس نے رحمان کے سر پہ ہاتھ رکھا اور گلے سے لگا لیا۔ اتنی دیر میں یہ بات درگاہ میں پھیل گئی۔ متولی نے اس ہندو جوڑے کو بتایا کہ یہ لڑکا چند دن پہلے ہی اپنے ماں باپ کے ساتھ شاہ پور گاؤں سے آیا ہے۔ وہ عورت جس کا نام شانتی تھا، اپنے شوہر سے کہنے لگی کہ وہ رحمان کے ماں باپ سے ملنا چاہتی ہے۔ رحمان دونوں میاں بیوی کو لے کر ماں باپ سے ملوانے لایا تو انھوں نے سارا واقعہ بتا کر رحمان کو کچھ انعام دینا چاہا، لیکن مختار موچی نے انعام لینے سے منع کر دیا اور کہا: ”سلطان جی کی درگاہ میں نیکی کر کے رحمان نے کوئی کارنامہ نہیں کیا۔ یہ تو اس کا فرض تھا کہ جس کی امانت ہے، اسے لوٹا دے۔“

شانتی اور اس شوہر ونود ان کے بہت شکر گزار ہوئے اور تفصیل جاننا چاہی کہ وہ اپنے پرکھوں کا گاؤں چھوڑ کر اتنی دور دلی کیوں آئے؟ مختار موچی نے ساری تفصیل سنائی تو ونود نے کہا کہ وہ ضلع حصار کا رہنے والا ہے۔ شادی کو سات سال ہو گئے ہیں، اولاد سے محروم ہے۔ اسی کی منت ماننے حضرتؒ کے دربار پہ آیا تھا اور اب یہاں سے سیدھا اجمیر جائے گا، خواجہ کے پاس کہ اس کی مراد پوری ہو۔ اچانک شانتی نے اپنی ساڑھی میں سے ایک پتلی سی پٹی پھاڑی اور اسے رحمان کی کلائی پہ باندھ دیا۔

”آج سے تو میرا بھائی ہے۔ دو مہینے بعد راکھی بندھن کا تہوار ہے۔ میں تجھے راکھی باندھنے آؤں گی، تب میرے لیے چوڑیاں لے کر رکھنا۔“ اس نے رحمان کو گلے لگا کر کہا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

تین چار دن کے بعد دو آدمیوں نے درگاہ میں آ کر مختار موچی کا پتا کیا اور اسے بتایا کہ وہ بادشاہ کے دربار سے تعلق رکھتے ہیں۔ ونود ان کا رشتے دار ہے اور وہ انھیں سارا قصہ بتا گیا ہے کہ تم نے شاہ پور کیوں چھوڑا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ رحمان کا داخلہ ایک اچھے سے مکتب میں ہو جائے

گا۔ مختار کے لیے بھی نوکری کا انتظام ہو گیا ہے اور اس کی بیوی کو باورچی خانے میں مددگار کے طور پر رکھ لیا گیا ہے۔

مختار موچی اور رحمان آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھ رہے تھے کہ جیسے کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔

”مگر بھیا! ہم رہیں گے کہاں؟“ اچانک رحمان کی ماں نے پوچھا۔

”اس کی فکر نہ کرو، دیدی! شہنشاہ کے دربار سے وابستہ لوگوں کو رہنے کو مکان بھی دیا جاتا ہے۔ تم لوگ چاہو تو ابھی چل سکتے ہو، ورنہ ہم کل آ جائیں گے۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”بھائی! تم کل آ جانا۔ آج ہم سلطان جی کی درگاہ پہ رہیں گے۔ انھی کی برکت سے ہمارے دن پھرے ہیں۔“ رحمان کی ماں نے کہا۔

رحمان کو مولوی صاحب کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔

”نیکی خود اپنا انعام ہوتی ہے، لیکن کسی صلے کی لالچ میں نیکی نہ کرنا۔“

☆☆☆

کئی ماہ بیت گئے۔ رحمان مکتب جاتا تھا، جہاں اور بھی امیروں اور رئیسوں کے بچے پڑھتے تھے۔ جلد ہی رحمان نے اپنی محنت اور ذہانت سے مولانا محمد علی چشتی کے دل میں جگہ بنا لی۔ وہ اس ہونہار بچے سے بہت خوش تھے۔ مختار بھی اپنی ذمے داریاں ایمان داری سے نباہ رہا تھا۔ اس کی بیوی باورچی خانے کے تمام کام بہت سوچ سمجھ کر کرتی تھی اور زبان بند رکھتی تھی، کیوں کہ راکھی بندھن کے تہوار پر شانتی اور اس کے شوہر ونود نے ان سے کہا تھا کہ محل میں جو بھی دیکھو، اس پر کبھی کوئی بات نہ کرنا۔ زبان بند اور آنکھیں کھلی رکھنا اور بادشاہ سے وفادار رہنا، ساتھ ہی اس نے بادشاہ کے ملازمِ خاص حاکم علی کو بھی تاکید کر دی تھی کہ وہ رحمان کے خاندان کا خاص خیال رکھے۔ یہ بھی سمجھایا کہ کسی بھی پریشانی میں وہ صرف حاکم علی ہی سے مشورہ کریں۔

رحمان کی ماں سعیدہ کام ختم کرنے کے بعد اپنی بچیوں کو سلائی کڑھائی سکھاتی تھی۔ ایک

دن اس نے رکاب دار کے کہنے سے ڈھلی ماش کی دال پکائی۔ اس کو اصلی گھی سے بگھارا، ہرا دھنیا، ہری مرچ، ادرک اور تلی ہوئی پیاز سے سجایا۔ بہت سے لیموں کاٹ کر رکھے اور بادشاہ کے دسترخوان پہ بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد رکاب دار عنایت علی کی طلبی ہوئی اور اس سے پوچھا گیا کہ آج ماش کی دال کس نے پکائی ہے؟ اس نے ادب سے سر جھکا کر کہا: ''حضور! گستاخی معاف...... کل سے میری گھر والی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے میں نے ماش کی دال اور چنے کی دال کا حلوا سعیدہ بی بی سے تیار کروایا تھا۔ اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس کا ذمے دار میں ہوں، نہ کہ وہ بے چاری۔''

بادشاہ بیگم نے جو کہ بادشاہ کی ماں تھیں، مسکرا کر کہا: ''جاؤ، سعیدہ کو بلا کر لاؤ۔''

عنایت علی پریشان پریشان اندر گیا اور سعیدہ کو بلا لایا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''ادھر آؤ سعیدہ!'' بادشاہ بیگم نے اسے اپنے قریب بلایا اور گلے سے موتیوں کی مالا اُتار کر اسے بخش دی اور بولیں: ''سعیدہ! آج سے جب بھی ماش کی دال پکے گی، وہ تم ہی پکاؤ گی۔ تمھیں اس کا معاوضہ الگ سے دیا جائے گا۔''

سعیدہ نے جھک کر فرشی سلام کیا اور ادب سے بولی: ''حضور بادشاہ بیگم کا اقبال بلند ہو۔ میرا سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ مجھ غریب کے ہاتھ کی پکی ہوئی دال آپ کو پسند آئی۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

بادشاہ اور ملکہ نے حیران ہو کر سعیدہ کو دیکھا، واقعی اس کی آنکھوں میں کوئی لالچ نہ تھا۔

بادشاہ نے خوش ہو کر پوچھا: ''ہماری اور ملکۂ ہندستان کی جانب سے تمھیں اختیار دیا جاتا ہے کہ جو چاہو مانگ لو اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم دونوں اور اماں حضور کے لیے تم روز کوئی نہ کوئی پکوان ضرور بنایا کرو۔''

سعیدہ نے پھر جھک کر سلام کیا اور بولی: ''حضور کا حکم سر آنکھوں پر، اگر آپ مجھ غریب عورت کو انعام دینا ہی چاہتے ہیں تو میری دونوں بچیوں زبیدہ اور فریدہ کی تعلیم کا بندوبست

کروا دیجیے۔ وہ دونوں بھی پڑھنے کی بہت شوقین ہیں۔''

بادشاہ، ملکہ اور بادشاہ بیگم نے حیران ہو کر سعیدہ کو دیکھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ سعیدہ کوئی ہیرے، جواہرات، اشرفیاں یا اپنے شوہر کے لیے کوئی بڑا عہدہ مانگے گی، مگر یہ تو الگ ہی عورت تھی، جسے علم سے محبت تھی اور وہ اپنی بیٹیوں کی تعلیم کے لیے فکر مند تھی۔

بادشاہ بیگم نے خوش ہو کر کہا: ''ٹھیک ہے۔ تم کل دونوں بچیوں کو ساتھ لے کر آؤ، پھر دیکھتے ہیں۔''

اگلے دن سعیدہ دونوں لڑکیوں کو لے کر حاضر ہوئی تو بادشاہ بیگم سر درد سے کراہ رہی تھیں، لیکن انھوں نے سعیدہ کو واپس نہ بھیجا بلکہ بیٹھنے کو کہا۔ سعیدہ نے ان سے کہا کہ اگر وہ پسند فرمائیں اور اجازت دیں تو وہ ان کا سر دبا سکتی ہے۔ بادشاہ بیگم نے اشارے سے اجازت دی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔ سعیدہ دوڑ کر روغنِ بادام اور روغنِ کاہو لے آئی۔ اس نے سرہانے کھڑے ہو کر ان کے سر میں پہلے دونوں تیل ملا کر آہستہ آہستہ مالش کی اور بچیوں سے کہا کہ وہ دونوں بادشاہ بیگم کے پاؤں کی انگلیوں کو آہستہ آہستہ دبائیں۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ بیگم گہری نیند سو گئیں۔ سعیدہ خاموشی سے اُٹھ کر باہر آ گئی اور رکاب دار کے پاس بیٹھ گئی۔ عنایت علی بہت خوش تھا کہ اب اس کی ذمے داری تھوڑی کم ہو گئی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ سعیدہ محل کی دوسری کنیزوں کی بہ نسبت بہت سیدھی اور مختلف تھی۔

کئی گھنٹے کی گہری نیند کے بعد جب بادشاہ بیگم کی آنکھ کھلی تو درد کا پتا نہ تھا۔ انھوں نے تالی بجا کر کنیز کو بلایا اور سعیدہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ رکاب دار کی بیوی کے پاس بیٹھی ہے۔ بادشاہ بیگم نے اسے اور بچیوں کو بلوایا۔ بچیاں سیدھی سادی تھیں، جھک کر آداب کیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئیں۔

بادشاہ بیگم نے خوش ہو کر دونوں کو پانچ پانچ اشرفیاں انعام میں دیں اور انھیں بتایا کہ وہ

دونوں عصر کے بعد مولوی صاحب کے گھر پڑھنے چلی جایا کریں۔ ساتھ ہی انھوں نے سعیدہ کو اپنی خاص کنیز مقرر کرلیا اور اس کی تنخواہ بھی بڑھا دی۔ جب گھر جا کر سعیدہ نے رحمان اور اپنے شوہر کو ساری بات بتائی تو رحمان نے کہا: ''اماں! تمھیں یاد ہے مولوی صاحب نے شاہ پور میں کیا کہا تھا کہ نیکی خود اپنا انعام ہے، شرط یہ ہے کہ کوئی نیکی کسی صلے کی لالچ میں نہ کی جائے۔''

''ہاں بیٹا! مجھے یاد ہے اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمیشہ دوسروں کے کام آؤ کہ انسانیت اسی کا نام ہے۔''

☆☆☆

پلک جھپکتے چھے سال گزر گئے۔ رحمان تعلیم مکمل کرکے قاضی صاحب کی عدالت میں بطور معاون کام کر رہا تھا۔ مختار موچی اب صرف مختار علی کہلاتا تھا۔ اس کا خاندان ایک اچھی زندگی بسر کر رہا تھا۔ شانتی اور ونو دو بچوں کے ماں باپ بن گئے تھے۔ وہ دونوں ہر سال منت چڑھانے دلی آتے تھے اور شانتی ہر سال رحمان کو راکھی باندھتی تھی اور جواب میں بہت سے تحفے بھی اسے ملتے۔ مختار اور سعیدہ اب اپنی دونوں بیٹیوں کے رشتوں کے لیے پریشان تھے کہ یہاں ان کا کوئی عزیز رشتے دار نہ تھا، جو ان معاملات میں ان کی مدد کرتا۔

ایک دن عدالت کا وقت ختم ہونے کے بعد قاضی صاحب گھر جا چکے تھے۔ رحمان اگلے دن کے مقدمات کے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اسے کہیں سے سرگوشیوں کی آواز آئی، دو لوگ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک دم ساکت ہو کر آوازوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور غور سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔ جب دونوں آدمی باتیں کرکے چلے گئے تو رحمان آہستہ سے عمارت سے باہر نکلا۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، کیوں کہ اس نے جو کچھ سنا تھا، وہ نہایت خوف ناک تھا۔ سرگوشیاں کرنے والوں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بادشاہ اور ان کی والدہ بادشاہ بیگم کے خلاف کوئی سازش تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کو خبردار کرے۔ اتفاق سے وہ جونہی گھر

پہنچا تو ونو اپنے بڑے بیٹے آکاش کے ساتھ گھر پر موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی نے حضرت'' کی درگاہ پر منت مانی تھی کہ جب بچہ پانچ سال کا ہو جائے گا تو میں کسی غریب خاندان کی لڑکی کے لیے ایک معقول رقم دوں گی، جو اس کی شادی پر خرچ ہو سکے۔

یہ رقم اب وہ رحمان کی بہنوں کے لیے دینا چاہتا تھا، لیکن سعیدہ نے کہا کہ ان کے حالات پہلے سے بہتر ہیں۔ البتہ کھاری باؤلی کے پاس ایک بیوہ عورت رہتی ہے، جس کی تین بیٹیاں ہیں۔ یہ رقم اس عورت کو دے دی جائے کہ اس کی بیٹیاں سلائی کرکے اپنا گزارا کرتی ہیں۔ ونود فوراً ہی وہاں جانے کو تیار ہو گیا۔ وہ رحمان کے ساتھ سیدھا کھاری باؤلی پہنچا اور رقم بیوہ خاتون کے حوالے کی۔ جب وہ اور سعیدہ واپس آئے تو رحمان کو گم صم پایا، ونو نے جب وجہ معلوم کرنی چاہی تو رحمان اسے گھر سے باہر لے آیا اور ایک طرف بیٹھ کر ساری باتیں اسے بتا دی، ساتھ ہی ان دونوں کے نام بھی بتا دیے۔ ساری بات سن کر ونود نے فوری طور پر حاکم علی سے رابطہ کیا اور اعتماد میں لے کر اسے ساری بات بتا دی۔ حاکم علی نے توجہ سے بات سنی اور رحمان کو منع کر دیا کہ وہ اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرے۔

☆☆☆

دس بارہ دن کے بعد دربار عام لگا اور بادشاہ نے ایک ہولناک سازش کا انکشاف کیا۔ دربار میں وہ دونوں موجود تھے، جن کی سرگوشیاں رحمان نے سنی تھیں۔ ملکہ بھی دربار میں موجود تھی، یہ بادشاہ کی تیسری ملکہ تھی۔ بادشاہ بیگم بھی اپنی مخصوص نشست پر بیٹھی تھیں۔ انھوں نے دونوں آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا جرم بیان کریں اور سازش بے نقاب کریں۔ اس دن دربار میں قاضی صاحب اور رحمان بھی موجود تھے۔ دونوں آدمی ہاتھ جوڑتے اور روتے ہوئے ایک طرف کھڑے ہو گئے اور پھر روتے ہوئے بولے: ''ظلِ سبحانی کا اقبال بلند ہو، خدا بادشاہ بیگم کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ حضور! ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ بس ہم لالچ میں آ گئے تھے۔ ہماری جان بخش

دی جائے۔"

ان کی گفتگو سن کر ملکہ اور وزیر کے چہروں پہ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"تمھاری جان بخشی کی ایک ہی صورت ہے کہ جو کچھ جانتے ہو، سچ سچ کہو، نہ جھوٹ بولو، نہ کسی پہ غلط الزام لگاؤ۔" بادشاہ بیگم نے کہا۔

"اور ہاں، پہلے قاضی صاحب ان دونوں سے حلف لیں گے کہ جو کچھ کہیں گے، سچ کہیں گے۔" بادشاہ نے گرج دار آواز میں کہا۔

قاضی صاحب نے دونوں سے الگ الگ حلف لیا، پھر ایک شخص کو دربار سے باہر بھجوا دیا اور دوسرے کو اپنا بیان دینے کو کہا۔ وہ شخص آگے بڑھا اور اپنا بیان دینا شروع کیا:

"حضور کا اقبال بلند ہو۔ میرا نام دلدار حسین ہے۔ میں ذات کا دھوبی ہوں، لیکن میرے والد یہ پیشہ بہت پہلے ترک کر چکے تھے۔ اچھی تعلیم اور حساب کتاب میں ماہر ہونے کی بنا پر مجھے دربار میں نوکری مل گئی۔ یہ نوکری حاکم علی کی بدولت ملی تھی، جن کے والد کے کپڑے میرے ابا کبھی دھویا کرتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے مجھے اور میرے ساتھی نریندر سنگھ کو ایک بہت بڑے انعام کا لالچ دے کر کہا گیا کہ ملکہ عالیہ فوزیہ بانو کو چوں کہ بادشاہ بیگم پسند نہیں کرتی تھیں، اس لیے وہ ان کو ختم کروانا چاہتی تھی۔ اس کام کے لیے نریندر سنگھ کی بیوی کو منتخب کیا گیا، کیوں کہ وہ رحمان کی ماں سعیدہ کی پکی سہیلی ہے۔ طے یہ ہوا کہ جس دن سعیدہ ماش کی دال پکائے گی، نریندر سنگھ کی بیوی موقع پا کر اس میں زہر ملا دے گی، کیوں کہ باورچی خانے میں وہ بھی سعیدہ کی مدد کرتی ہے۔ ملکہ فوزیہ اس دن سر درد کا بہانہ بنا کر اپنے کمرے میں آرام کریں گی۔ جونہی بادشاہ بیگم اور بادشاہ کھانا کھا لیں گے، تمام کھانا ضائع کر دیا جائے گا۔" ابھی دلدار حسین یہیں تک پہنچا تھا کہ ملکہ بانو غصے سے اُٹھ کھڑی ہوئی: "کیا بک رہے ہو؟ میں کیوں اپنے شوہر اور ساس کو مارنا چاہوں گی؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟"

اچانک بادشاہ کے اشارے پر دو خادمائیں ملکہ کی طرف بڑھیں اور اسے اپنی جگہ بٹھا دیا۔

"آگے کہو۔" بادشاہ کی آواز بھرے دربار میں گونجی۔

"حضور! میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ ملکہ عالیہ آپ کی والدہ کو اس لیے مروانا چاہتی تھیں، کیوں کہ وہ ملکہ کو پسند نہیں کرتی تھیں اور حضور کو اس لیے ختم کروانا چاہتی تھیں کہ آپ پڑوسی ملک کے راجا کی حسین و جمیل بیٹی سے بیاہ کرنا چاہتے تھے اور...... اور ان تمام معاملات میں انھیں وزیر باتدبیر اعتماد الدولہ مرزا برہان بیگ کا تعاون حاصل تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے...... سراسر جھوٹ۔" اچانک وزیر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور کمر کے پٹکے سے بندھا خنجر باہر نکال لیا۔

فوراً ہی دو کسرتی بدن کے خادموں نے وزیر کو اپنی جگہ بٹھا دیا۔

"وزیر باتدبیر کا کیا فائدہ تھا ملکہ کا ساتھ دینے میں۔" بادشاہ نے غصے سے پوچھا۔

"حضور!" دلدار حسین گڑگڑایا: "وزیر باتدبیر خود بادشاہ بننا چاہتے تھے، اس لیے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے باہر لے جاؤ، مگر پہرے میں رکھو۔" بادشاہ نے حکم دیا۔

پھر نریندر سنگھ کو بلوایا گیا اور اسے گرونانک کی قسم دے کر اس کی مقدس کتاب پر حلف لیا گیا۔ اس کے بعد اس نے بھی وہی بیان دیا، جو دلدار حسین نے دیا تھا۔

"تم دونوں کو انعام دینے کا وعدہ کیا گیا تھا؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"حضور! دلدار حسین کو خزانے کا انچارج اور مجھے ایک ریاست کا حکمراں بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔" نریندر سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"کوئی گواہ ہے تم دونوں کا جو ان باتوں کی تصدیق کر سکے؟" بادشاہ بیگم نے پوچھا۔

"جی ہے۔" یہ کہہ کر نریندر سنگھ اور دلدار حسین نے چار مزید لوگوں کے نام بھی بتا دیے، جو اس وقت دربار میں موجود تھے۔ ان سب کو بھی ملکہ اور وزیر نے بڑے بڑے لالچ دیے تھے۔ بعد

میں نریندر سنگھ کی بیوی کو بھی دربار میں بلوایا گیا، جس نے اپنے شوہر کی باتوں کی تصدیق کی۔

بادشاہ نے اپنی والدہ کی طرف دیکھا اور کہا: ''اماں حضور! آپ سچ کہتی تھیں کہ خاندانی شرافت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آپ نے ہمیں فوزیہ سے شادی کرنے کو منع کیا تھا، لیکن ہم نے نہ مانی اور اس ناچنے والی کو اپنی ملکہ بنالیا۔''

تمام باتوں کی تصدیق ہونے کے بعد وزیر کو بغاوت کے جرم میں سرِ عام پھانسی دے دی گئی اور ملکہ فوزیہ کو عمر قید کی سزا دے کر قید میں ڈال دیا گیا۔ وہ جیتے جی اس قید خانے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ سازش میں شامل دوسرے چار افراد کی جائیداد ضبط کر کے انھیں دربار سے بے دخل کر دیا گیا۔

بادشاہ کو حاکم علی نے بتا دیا تھا کہ اس سازش کا پتا رحمان کی وجہ سے ملا۔ بادشاہ نے رحمان کو اپنا وزیر بنالیا اور حاکم علی کو ایک بڑے صوبے کا حکمران بنا دیا، ساتھ ہی ونود کو دِتی بلا کر وزیرِ خزانہ بنا دیا گیا۔ بادشاہ نے حسبِ وعدہ نریندر اور دلدار حسین کی جاں بخشی کر دی، لیکن انھیں دربار سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا، البتہ انھیں زندگی گزارنے کے لیے سونی پت اور لاہور میں زمینیں دے دی گئیں۔

حاکم علی، رحمان کی شرافت اور انسانی ہمدردی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کی شادی رحمان کی بہنوں فریدہ اور زبیدہ سے کر دیں۔ سعیدہ اب بھی بادشاہ بیگم کے پاس رہتی تھی، لیکن خادمہ بن کر نہیں بلکہ ساتھی اور سہیلی بن کر۔

سچ ہے، نیکی کبھی رایگاں نہیں جاتی اور یہ بھی سچ ہے کہ جیسا شاہ پور میں مولوی صاحب نے کہا تھا کہ نیکی کسی لالچ یا صلے کی اُمید پر نہ کی جائے، کیوں کہ نیکی خود ایک انعام ہے، جو انسانوں کی بے لوث خدمت اور مدد کرنے والوں کو ایک نہ ایک دن ضرور ملتا ہے۔

☆ ☆ ☆

تصویر خانہ

منیٰ ذاکر، شہداد پور — زینب بنت شکیل، کراچی

حمزہ اقبال، کراچی — محمد احمد علی، ملتان — محمد منعم یوسف، کراچی — محمد محمود عالم انصاری، میرپور خاص

کنزہ کشف کھتری، کراچی — مصیب ناصر، جگہ نامعلوم — ایمان اور مسکان، اسلام آباد

محمد انس شہریار، ملتان | اشرٰی عامر، کراچی | حبا عامر، کراچی

ہمایوں عبدالستار، کوٹ غلام محمد | صفدر علی شاہ، رتو ڈیرو | رانا ذوالفقار حیدر راجپوت، جھنڈو

علی بن جمال محی الدین، کراچی | ابوبکر بن جمال محی الدین، کراچی | محمد اعظم مغل، ڈگری

ایک حیرت ناک کہانی

دو رئیس آدمیوں کا قصہ

مسعود احمد برکاتی

پرانے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک ملک میں دو رئیس آدمی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کا محل سفید پتھروں کا بنا ہوا تھا اور دوسرے کا پیلے پتھروں کا۔ ان کے محلوں کی وجہ سے لوگوں نے انھیں سفید محل کا نواب اور پیلے محل کا نواب کہنا شروع کر دیا۔ سفید محل کے نواب کی ایک خوب صورت چھوٹی سی بیٹی تھی۔ اس کا نام نیلوفر تھا۔ سفید محل کا نواب اپنی بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔ پیلے محل کے نواب کا ایک خوب صورت سا لڑکا تھا۔ اس کا نام معظم تھا۔ معظم کا باپ یعنی پیلے محل کا نواب بھی اپنے بیٹے کو بہت چاہتا تھا۔ دونوں نوابوں میں بڑی پکی دوستی تھی، اتنی پکی کہ اگر وہ دوپہر کا کھانا سفید محل میں کھاتے تو رات کو پیلے محل میں۔

نیلوفر اور معظم میں بھی خوب دوستی تھی۔ دونوں ساتھ کھیلتے، ساتھ پڑھنے جاتے اور ساتھ ساتھ ہی کھاتے پیتے تھے۔ دونوں نوابوں نے آپس میں طے کر رکھا تھا کہ جب معظم اور نیلوفر بڑے ہو جائیں گے تو دونوں کی آپس میں شادی کرا دیں گے، اس طرح دونوں نوابوں اور دونوں بچوں کی دوستی اور پکی ہو جائے گی۔ دونوں نواب جب کھانا کھانے بیٹھتے تو عام طور پر ان کے درمیان یہی بات چیت ہوتی کہ جب معظم اور نیلوفر بڑے ہو جائیں گے تو دونوں محل ان کو مل جائیں گے۔ دونوں نوابوں کی زمینیں بھی ان کو مل جائیں گی۔ ان کی زندگی بڑے آرام سے گزرے گی۔ غرض نہ تو سفید محل کے نواب کو کوئی کام تھا اور نہ پیلے محل کے نواب کو۔ ان کی زمینوں پر کسان کام کرتے تھے۔ باغوں کی نگرانی باغبان کرتے اور محلوں کی حفاظت کے لیے ان کے پاس کئی نوکر تھے۔ زمینوں اور باغوں کی فصلوں سے ان کو ہر سال بہت سا روپیہ مل جاتا۔ ان کی زمینوں پر بہت سے چھوٹے چھوٹے مکانات بھی بنے ہوئے تھے، جن میں کرائے دار رہتے تھے۔ ان مکانوں سے بھی دونوں نوابوں کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی اور یوں دونوں آرام کی زندگی گزار

رہے تھے۔ ان کا کام تو بس سیر و تفریح کرنا اور اپنے بچوں کے متعلق باتیں کرتے رہنا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ سفید محل میں دونوں نواب رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ اُسی وقت ایک آدمی محل کے دروازے پر پہنچا۔ دونوں نوابوں کا قاعدہ تھا کہ وہ مسافروں کی بڑی خدمت کرتے، کوئی بھی آدمی گاؤں میں آ جاتا تو اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام یہ نواب خود ہی کرتے تھے۔ جب تک وہ مسافر ان کے گاؤں میں رہتا، دونوں میں سے کسی ایک نواب کا مہمان ہوتا۔ اُس روز جب وہ مسافر پہنچا تو سفید محل کے نواب نے فوراً اُسے اندر بلا لیا۔ اپنے ساتھ کھانا کھلایا، کھانا ختم ہونے کے بعد سفید محل کے نواب نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اس گاؤں میں کتنے دن ٹھیرے گا؟ تو اُس آدمی نے بتایا کہ وہ ایک سیاح ہے۔ اس نے بہت زیادہ سفر کیے ہیں۔ اسے صرف یہی ایک شوق ہے کہ ملک ملک اور شہر شہر گھوم کر دنیا دیکھے۔ سیاح کی یہ بات سن کر دونوں نوابوں کو شوق ہوا کہ اس کے سفر کی داستانیں سنیں۔ چناں چہ سفید محل کے نواب نے کہا: ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمیں بھی اپنے سفر کی کہانیاں سنائیں۔''

115x158mm

''میں نے تو دنیا میں اتنی عجیب و غریب چیزیں دیکھی ہیں کہ اگر ہر چیز کے متعلق بتانا شروع کروں تو اس کے لیے کئی مہینے درکار ہوں گے۔'' سیّاح نے کہا۔

''تو پھر ہمیں کم از کم کسی ایسی چیز کے متعلق بتائیے جو آپ کو سب سے زیادہ انوکھی اور عجیب و غریب معلوم ہوئی ہو۔'' سفید محل کے نواب نے کہا۔

''ہاں، ایک ایسی عجیب و غریب چیز کے متعلق میں آپ کو بتا سکتا ہوں، جسے دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی اور اب بھی سوچتا ہوں کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، کہیں وہ خواب تو نہیں، لیکن جو چیز اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور بڑی دیر تک وہاں ٹھیر کر اُسے دیکھتا رہا ہوں، اسے خواب کہہ کر ٹال بھی نہیں سکتا۔'' سیّاح نے کہا۔

سیّاح کے اس جملے سے دونوں نوابوں کا شوق اور بڑھ گیا۔ اس مرتبہ پیلے محل کے نواب نے کہا: ''آخر وہ ایسی کیا چیز ہے؟ اُس کے متعلق ہمیں ضرور بتائیے۔''

سیّاح نے کہنا شروع کیا: ''وہ چیز یہاں سے زیادہ دور نہیں، وہ سامنے مشرق کی طرف جو جنگل ہے، اس کے پار ایک ندی ہے۔ ندی کے ساتھ ساتھ جنوب کی سمت چلنے پر ایک اور گھنا جنگل ہے۔ اس جنگل میں پرانے زمانے کا بنا ہوا ایک لکڑی کا مکان ہے۔ اس مکان میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی اپنے بالوں کو کاٹ کاٹ کر اس کا کپڑا بُن رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب سُوت ختم ہو جاتا ہے تو وہ اُسترے سے اپنے بال کاٹ لیتی ہے۔ پھر جتنی دیر میں وہ بال کپڑا بُننے میں ختم کر دیتی ہے، اتنی دیر میں اس کے سر کے بال پھر اتنے ہی بڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ صبح اس نے اپنے بال کاٹے، لیکن دو تین گھنٹے بعد ہی اس کے بال پھر اتنے بڑھ گئے۔ اس کے چھوٹے سے مکان میں بالوں کے بنے ہوئے اس کے کپڑے کے بے شمار تھان رکھے ہیں۔''

سیّاح سے یہ کہانی سن کر دونوں نوابوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کے بعد سیّاح تو وہاں سے

چلا گیا، لیکن سفید محل کا نواب اُسی بڑھیا اور اس کے بنائے ہوئے کپڑے کے متعلق سوچنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد پیلے محل کا نواب بھی چلا گیا اور سفید محل کا نواب سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بستر پر تو لیٹ گیا، لیکن نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔ اُسے بس یہی دُھن سوار تھی کہ کسی طرح اُس بڑھیا کو دیکھا جائے، جو اپنے سر کے بالوں سے کپڑا تیار کرتی ہے۔ رات بھر وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس بڑھیا کو دیکھنے کے لیے سیّاح کے بتائے ہوئے جنگل میں پرانے زمانے کا وہ مکان ضرور تلاش کرے گا، جس میں بڑھیا رہتی ہے۔

دوسرے دن صبح ناشتے پر جب پیلے محل والے نواب سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے اپنے دوست سے بھی ذکر کیا کہ وہ بڑھیا کی تلاش میں جانا چاہتا ہے۔ پیلے محل کا نواب بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا۔ دونوں نے آپس میں یہ طے کر لیا کہ دونوں خاموشی

ے کسی دوسرے کو بتائے بغیر روانہ ہو جائیں گے۔ اب معاملہ تھا بچوں کا۔ سفید محل کے نواب کے ہاں ایک شخص کرمو رہا کرتا تھا۔ وہ نواب کا بہت پرانا ملازم تھا۔ نواب ہر کام کے سلسلے میں اُسی پر بھروسا کرتا تھا۔ چناں چہ اُس نے کرمو کو بلا کر کہا: ''میں اپنے دوست کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ میرے واپس ہونے تک تم نیلوفر کا خیال رکھنا اور ایسی کوئی بات نہ ہونے دینا، جس سے نیلوفر کو کسی قسم کا دکھ ہو۔''

پیلے محل کے نواب کے ہاں بھی ایک ملازم تھا۔ اس کا نام تھا نصرو۔ یہ بھی بہت پرانا ملازم تھا۔ پیلے محل کے نواب نے نصرو کو کہا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہے۔ اس کی واپسی تک معظم کا خیال رکھے اور اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دے۔

دونوں نواب اپنے بچوں کو اپنے ملازموں کے سپرد کر کے روانہ ہو گئے۔ جب یہ دونوں گھر سے جا رہے تھے تو دونوں بچے میٹھی نیند سو رہے تھے۔ نوابوں نے اپنے بچوں کو سوتے ہی میں پیار کیا اور خاموشی سے گھروں سے نکل گئے۔ صبح جب بچوں کی آنکھ کھلی تو انھیں معلوم ہوا کہ اُن کے باپ تو کسی لمبے سفر پر چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد سے نیلوفر اور معظم دونوں روزانہ ملتے اور آبادی سے دور ایک ٹیلے پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرتے تھے۔ اسی طرح سات مہینے گزر گئے، لیکن دونوں کے ابو واپس نہیں آئے۔ دونوں نواب شاید یہ سوچ رہے تھے کہ کرمو اور نصرو تو وفادار ملازم ہیں۔ وہ ضرور بچوں کا خیال رکھیں گے اور انھیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے، لیکن کرمو اور نصرو دونوں ہی اچھے آدمی ثابت نہیں ہوئے۔ نوابوں کے جانے کے بعد چوں کہ سارا انتظام ان کے ہاتھ میں آ گیا تھا، کھیتوں اور باغوں کی ساری آمدنی انھیں ملنے لگی تھی اور دوسرے جتنے ملازم تھے، وہ سب کے سب ان دونوں کی نگرانی میں آ گئے تھے، اس لیے دونوں اب بہت زیادہ مغرور ہو گئے تھے۔ وہ خود نواب بن کر رہنے لگے تھے، لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ دونوں جب بھی واپس آئیں گے تو اُن سے یہ عیش و آرام چھن جائے گا۔ اگر کسی وجہ سے دونوں نواب واپس نہ بھی آئے تو نیلوفر

اور معظم جب بڑے ہو جائیں گے تو یہ ساری دولت جو اب اُن کے قبضے میں آ رہی ہے، اُن سے چھن جائے گی۔ دونوں ملازم اپنے طور پر یہ باتیں سوچ رہے تھے۔ آخر ایک دن انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ دولت ہمیشہ کے لیے اپنے قبضے میں کیسے رکھی جائے۔ بڑی دیر کی بحث اور بات چیت کے بعد دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ نیلوفر اور معظم کو نوابوں کے بچوں کی طرح نہ رہنے دیا جائے، بلکہ انھیں غلاموں کی طرح رکھا جائے، تاکہ نہ وہ لکھ پڑھ سکیں اور نہ بڑے ہو کر ان میں اتنی ہمت باقی رہے کہ وہ ہم سے یہ دولت چھیننے کی بات سوچ بھی سکیں۔ اب رہ گیا دونوں نوابوں کا معاملہ تو اُن کے متعلق یہ مشہور کر دیا جائے کہ دونوں کے مرنے کی خبر آ گئی ہے۔ دو ایک ایسے آدمیوں کو پہرے پر بٹھا دیا جائے کہ اگر کبھی یہ دونوں نواب واپس آئیں بھی تو یہ آدمی انھیں راستے ہی میں مار ڈالیں۔ اس کے علاوہ کرمو اور نصرو نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ نیلوفر اور معظم کے بجائے وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں۔ آپس میں یہ فیصلہ کر کے دونوں نے نیلوفر اور معظم سے ان کے اچھے اچھے کپڑے چھین لیے اور پھٹے پرانے کپڑے دے کر اُن سے کہا کہ وہ روزانہ صبح اٹھ کر بھیڑیں چرایا کریں، ورنہ انھیں کھانا بھی نہیں ملے گا۔

نیلوفر اور معظم اب روزانہ بھیڑیں چراتے۔ صبح سے شام تک وہ جنگل میں رہتے۔ شام کو جب گھر پہنچتے تو انھیں ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ پڑتی۔ کبھی کبھی کسی معمولی بات پر مار بھی کھانی پڑتی۔ سونے کے لیے دونوں کو ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں دے دی گئی تھیں، جن پر وہ بھیڑوں کے پاس ہی سو جایا کرتے۔ اسی طرح دو مہینے اور گزر گئے۔ ایک دن ان کی دو بھیڑیں چرتے چرتے جنگل میں بڑی دور نکل گئیں۔ پہلے تو دونوں بچے یہ سوچتے رہے کہ یہ بھیڑیں پیٹ بھرنے کے بعد لوٹ آئیں گی، لیکن جب بڑی دیر تک واپس نہیں آئیں تو دونوں نے انھیں تلاش کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ شام کو بھیڑیں کم ہونے کی وجہ سے انھیں مار نہ کھانی پڑے۔ وہ اپنی بھیڑوں کو تلاش کرتے ہوئے خود بھی جنگل میں بڑی دور نکل گئے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اب انھیں

اندھیرے کی وجہ سے راستہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ گھبرا کر وہ دونوں رونے لگے۔ اُسی وقت ایک بوڑھی عورت ان کے پاس پہنچی۔ اُس نے دونوں بچوں کو روتے دیکھا تو اُن سے پوچھا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں؟ دونوں بچوں نے اُس عورت کو اپنی پوری کہانی سنا دی۔ عورت نے پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ اب اگر بھیڑوں کے بغیر گھر واپس گئے تو کرمو اور نصرو تمھیں بہت ماریں گے، اس لیے یہی بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ رہو۔

''لیکن آپ کہاں رہتی ہیں؟'' نیلوفر نے پوچھا۔

''اسی جنگل میں رہتی ہوں۔'' بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

''اس جنگل میں آپ کہاں رہتی ہیں؟ یہاں آپ کو ڈر نہیں لگتا؟ یہاں تو بڑا اندھیرا ہے۔ رات کو جنگلی جانور بھی آتے ہوں گے۔'' معظم نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔ اس کے جواب میں پہلے تو عورت ہنس پڑی، پھر اس نے کہا: ''تم دونوں میرے ساتھ چلو تو سہی، خود ہی دیکھ لو گے کہ میں اس جنگل میں کیسے رہتی ہوں، کہاں رہتی ہوں اور مجھے یہاں ڈر کیوں نہیں لگتا۔''

معظم اور نیلوفر نے ایک دوسرے کو دیکھا، جیسے آپس میں مشورہ کر رہے ہوں کہ اس عورت کے ساتھ جانا بھی چاہیے یا نہیں۔ وہ یہ بات تو جانتے تھے کہ بھیڑوں کے بغیر گھر گئے تو کرمو اور نصرو واقعی انھیں بہت ماریں گے۔ اس مار سے تو بہتر یہی ہے کہ اسی عورت کے ساتھ چلے جائیں۔ پھر وہ دونوں اس عورت کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ بوڑھی عورت انھیں اپنے ساتھ لے کر جنگل میں ایسے درخت کے سامنے پہنچی، جو بہت ہی موٹا تھا۔ اس درخت کے تنے میں ایک لکڑی اس طرح آگے نکلی ہوئی تھی، جیسے وہ کسی زمانے میں درخت کی شاخ رہی ہو اور بعد میں کسی نے اس شاخ کو کاٹ دیا ہو۔ عورت نے اس کٹی ہوئی شاخ کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو درخت کا تنا اس طرح الگ ہو گیا، جیسے کوئی دروازہ کھلتا ہے۔ عورت اس دروازے میں داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے نیلوفر اور معظم بھی اس دروازے میں داخل ہو گئے۔ اس تنے کے

اندر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ جب سیڑھیوں سے نیچے اُترے تو ان کے سامنے ایک شان دار
سجایا کمرا تھا۔ یہاں اُس عورت نے اُنھیں بتایا کہ زمین کے نیچے بھی ایک شہر آباد ہے اور وہ ا
شہر کی ملکہ ہے۔ وہ تھوڑے دن اس کے ساتھ رہیں، یہاں تک کہ بہار کا موسم آ جائے۔ بہار
موسم میں وہ اوپر جائے گی، کیوں کہ بہار کے موسم میں دور دور کے جنگلوں کے جانور اس کے پا
آتے ہیں۔ یہ جانور اُسے ہر جگہ کی خبریں سناتے ہیں۔ انھی جانوروں میں سے کسی نہ کسی کی زبا
دونوں نوابوں کے بارے میں اطلاع ملے گی۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ اُن کو واپس لانے
لیے کیا کرنا چاہیے۔ پھر ملکہ نے زور سے تالی بجائی تو کئی خوب صورت عورتیں کمرے میں
آ گئیں۔ یہ سب شاید اُس ملکہ کی خادمائیں تھیں۔ ملکہ نے انھیں حکم دیا کہ نیلوفر اور معظم کے
پرانے کپڑے بدلوائے جائیں۔

ملکہ کے حکم سے نیلوفر اور معظم کو نہلا دھلا کر خاداماؤں نے اچھے اچھے کپڑے پہنا دیے
نہایت عمدہ اور مزے دار کھانا کھلایا۔ اب دونوں اس ملکہ کے محل میں رہنے لگے۔ یوں تو انھیں کو
تکلیف نہ تھی، ہر طرح کا آرام تھا، بس وہ زمین کے اوپر نہیں جا سکتے تھے۔ وہ دونوں اپنے ا
ابو کو یاد کرتے رہتے۔ اس طرح رہتے ہوئے نہ جانے کتنے دن گزر گئے کہ ایک روز ملکہ
دونوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ زمین کے اوپر بہار کا موسم آ گیا ہے۔ اب وہ اوپر چلنے کے لیے
تیار ہو جائیں۔ یہ سن کر دونوں بہت خوش ہوئے اور جلدی جلدی کپڑے پہن کر ملکہ کے پاس پہنچ
گئے۔ تھوڑی دیر بعد تینوں اُسی راستے سے اوپر پہنچے، جس راستے سے بہت دن پہلے وہ زمین کے
نیچے کے شہر میں پہنچے تھے۔ جنگل میں پہنچے ہوئے انھیں تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک طرف
ایک بڑا سا ریچھ ان کے پاس آیا۔ اس نے آتے ہی ملکہ کے قدموں میں اپنا سر رکھ کر ایک اگلا پ
سر کے اوپر تک اُٹھا لیا، جیسے جھک کر سلام کر رہا ہو۔ ملکہ نے ریچھ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
کہا: ”سناؤ بھئی، تمھارے اڑوس پڑوس کا کیا حال ہے؟ کیا خبر لائے ہو؟“

ملکہ کی بات سنتے ہی ریچھ زمین پر اپنے دونوں اگلے پیر ٹکا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ”ملکہ
عالیہ! میں جس جنگل میں رہتا ہوں، اُس کے قریب ہی دو نواب رہتے تھے۔ ایک سفید محل والا اور
ایک پیلے محل والا۔ وہ دونوں ایک رات اچانک غائب ہو گئے تھے، جس کا حال میں آپ کو پچھلے
موسمِ بہار میں سنا چکا ہوں۔ چند مہینے پہلے ان کے دونوں بچے نیلوفر اور معظم بھی غائب ہو گئے۔
نوابوں کے دونوں نوکروں کرمو اور نصرو کا کہنا ہے کہ بچے کھیلتے ہوئے جنگل میں نکل گئے تھے،
جہاں انھیں جنگلی جانوروں نے کھا لیا، لیکن میں نے جنگل کے بادشاہ شیر سے پوچھا، بھائی چیتے
سے بھی، بھیڑیے میاں سے بھی معلوم کیا اور تمام ریچھ بھائیوں سے بھی، کسی نے بھی مجھے یہ نہیں
بتایا کہ اُس نے ان دونوں بچوں کو کھایا ہے۔ بہر حال اب کرمو اور نصرو نوابوں کی جائیداد پر عیش
کر رہے ہیں۔ البتہ اب وہ عام لوگوں پر بڑا ظلم کرنے لگے ہیں۔“

”شیر، چیتے، بھیڑیے اور ریچھوں نے تمھیں ٹھیک ہی بتایا ہے۔“ ملکہ نے ریچھ کو جواب
دیا اور دونوں بچوں کو سامنے کرتے ہوئے کہا: ”دیکھو، دونوں بچے میرے پاس ہیں۔ اب رہ گیا
کرمو اور نصرو کے ظلم کا قصہ تو وہ بھی جلد ہی ختم ہو جائے گا۔“

ملکہ نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ بہت بڑا کالا کوّا اُڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس کوّے نے ملکہ
کے پیروں میں بیٹھ کر تین بار اپنی چونچ زمین پر ماری۔ شاید یہ کوّے کا سلام تھا۔ ملکہ نے اس کے
سر پر ہاتھ پھیرا اور اُس سے بھی اپنے اڑوس پڑوس کی خبریں سنانے کے لیے کہا تو کوّے نے
کہا: ”ہمارے پڑوس کے جنگل میں کسی بزرگ نے کسی شہر کے دو نوابوں کو سزا دی ہے اور وہ اب
سب کچھ بھول کر رات دن چرونجی کے درخت لگاتے رہتے ہیں۔“

”ان لوگوں کے متعلق ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“ ملکہ نے کہا تو کوّے نے بتانا شروع کیا:
”کسی شہر کے دو نوابوں کو کسی سیّاح نے بتایا تھا کہ ہمارے پڑوس کے جنگل میں ایک بوڑھی عورت
اپنے ہی بالوں سے کپڑا بنتی رہتی ہے۔ نوابوں نے سوچے سمجھے بغیر اس سیّاح کی بات کا یقین

کرلیا۔ انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ کوئی عورت اپنے سر کے بال کاٹ کر اس کا کپڑا کیسے بُن سکتی
ہے اور کسی عورت کے سر پر اتنے بال کیسے پیدا ہوں گے کہ ان سے لگاتار کپڑا بنا جا سکے۔ سیّاح کی
جھوٹی بات پر یقین کر کے دونوں نواب اپنے بچوں، اپنی زمینوں اور اپنے باغوں کو چھوڑ کر اس
بوڑھی عورت کو دیکھنے کے شوق میں گھر سے نکل پڑے۔ جب وہ ہمارے جنگل میں پہنچے اور انھیں
وہ عورت نہ ملی تو بھی انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ممکن ہے، سیّاح نے جھوٹ کہا ہو۔ وہ عورت کی
تلاش میں جنگل ہی میں رہ گئے۔ جنگلی جانوروں سے بچنے کے لیے انھوں نے جنگل کے سایہ دار
درخت کاٹ کاٹ کر جلانا شروع کر دیے۔ ان درختوں پر پرندے بسیرا کرتے تھے۔ ان کے پھل
کھاتے تھے۔ مسافر اگر اِدھر سے گزرتے تو ان درختوں کے سائے میں آرام کرتے تھے۔ جب
یہ درخت کم ہونے لگے تو جنگل کے پرندوں نے بزرگ سے شکایت کی۔ بزرگ ایک شکاری کا
بھیس بنا کر ان کے پاس پہنچے اور انھیں درخت کاٹنے سے منع کیا، لیکن دونوں نوابوں نے ان کی
بات نہ سنی۔ دوسرے دن وہ بزرگ ایک دوسرے شکاری کے بھیس میں وہاں پہنچے، اس وقت
دوپہر تھی۔ بزرگ نے دونوں نوابوں کو ایک شربت پینے کے لیے دیا۔ گرمی تو تھی ہی، نوابوں نے
وہ شربت غٹاغٹ پی لیا۔ اس شربت کا اثر یہ تھا کہ ان کی یادداشت ختم ہو گئی۔ وہ سب کچھ بھول
گئے۔ اُس وقت بزرگ نے انھیں حکم دیا کہ وہ دونوں اس جنگل میں سایہ دار درخت لگائیں۔
شربت کے اثر سے بزرگ کا حکم انھیں یاد رہ گیا ہے۔ اب وہ رات دن ایسے درخت وہاں لگا رہے
ہیں، جو بڑے ہو کر گھنے اور سایہ دار ہو جائیں۔ اس شربت کا اثر صرف اس وقت ختم ہو گا جب وہ
کم سے کم دو گھنٹے تک بے کار بیٹھے رہیں۔ ابھی تو نہ انھیں نیند آتی ہے نہ بھوک لگتی ہے۔ بس وہ
رات دن درخت لگانے میں مصروف ہیں۔''

کوّے کے بعد اور بھی کئی جانور آئے اور انھوں نے مختلف علاقوں کی خبریں ملکہ کو سنائیں،
لیکن معظم اور نیلوفر کو ان تمام خبروں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ غرض اسی طرح جانور آتے رہے

اور خبریں سناتے رہے۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ معظم اور نیلوفر، ملکہ کے ساتھ ایک مرتبہ پھر اُسی
درخت کے راستے سے زمین کے نیچے ملکہ کے محل میں آ گئے۔ دوسرے دن معظم اور نیلوفر نے ملکہ
سے اجازت مانگی کہ وہ دونوں نوابوں کو اس سزا سے بچانے کے لیے جانا چاہتے ہیں۔

ملکہ نے کہا: ''میں خود تو تمھارے ساتھ چل نہیں سکتی، البتہ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے
ارادے میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ اپنے اپنے ابو کو کام سے روکنے کی
کوشش شام سے پہلے نہ کرنا، اس وقت کرنا جب اندھیرا پھیلنے والا ہو۔ دوسرے یہ کہ جب تم
دونوں کو پیاس لگے تو کسی بہتی ہوئی ندی کے پانی کے سوا کوئی چیز نہ پینا۔''

پھر ملکہ نے انھیں اپنے جنگل کا راستہ سمجھایا اور کھانے کے لیے روٹیاں باندھ دیں، تاکہ
بھوک لگے تو دونوں بچے یہ روٹیاں کھا لیں۔ دونوں بچے ملکہ سے رخصت ہو کر اپنی منزل کی طرف
روانہ ہو گئے۔ تین چار دن سفر کرنے کے بعد ایک دن انھیں اپنے ابو نظر آ گئے۔ وہ دونوں دوڑ کر
اپنے اپنے ابو سے چمٹ گئے، لیکن دونوں نوابوں کو تو جیسے اپنے بچے نظر ہی نہیں آئے تھے۔ دونوں
نے ان بچوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے کام میں مصروف رہے۔ معظم نے اپنے ابو کو کام سے
روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن اس کے ابو تو جیسے بہرے ہی ہو گئے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر نیلوفر نے
معظم کو ملکہ کی نصیحت یاد دلائی کہ دونوں کو کام سے روکنے کوشش اس وقت کی جائے، جب شام
ہونے لگے اور سورج غروب ہونے والا ہو۔ معظم کو بھی نصیحت یاد آ گئی تو دونوں بچے تھوڑی دور
ہٹ کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ابھی چوں کہ دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی، اس لیے
انھیں بڑی دیر تک انتظار کرنا تھا۔ دونوں نے ملکہ کی دی ہوئی روٹیاں نکالیں اور ایک ایک روٹی کھا
کر وہ پانی پینے کے لیے ندی کے کنارے پہنچے۔ اسی وقت ایک شکاری تیز تیز چلتا ہوا ان کے
پاس آیا اور اُن سے کہنے لگا: ''بچو! یہ گندا پانی نہ پیو۔ میں تمھیں شربت دے رہا ہوں۔ اپنی پیاس
اس سے بجھاؤ۔'' پھر اُس نے شربت سے بھرا ہوا ایک بڑا سا مگ ان کی طرف بڑھایا۔

لیکن نیلوفر نے کہا: ”نہیں، ہم شربت نہیں پییں گے، ہم صرف بہتی ہوئی ندی کا پانی پییں گے۔“

اتنا سننا تھا کہ شکاری نے سارا شربت زمین پر اُنڈیل دیا اور پیر پٹختا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد دونوں بچوں نے سیر ہو کر پانی پیا اور اُسی درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گئے، جہاں سے وہ دونوں نوابوں کو کام کرتا دیکھ رہے تھے۔ جب انھیں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی اور دوپہر بھی ڈھل گئی تو دونوں کو ایک مرتبہ پھر بھوک لگنے لگی۔ انھوں روٹی نکالی، تاکہ پھر ایک روٹی کھا کر ندی کا پانی پی لیں۔ اب ان کے پاس صرف یہی دو روٹیاں رہ گئی تھیں۔ انھوں نے جیسے ہی روٹی نکالی، ایک بڑا کوّا آ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ نیلوفر سمجھ گئی کہ کوّا بھوکا ہے۔ اس نے اپنی روٹی سے ایک ٹکڑا توڑ کر کوّے کو کھلا دیا۔ معظم نے بھی ایک ٹکڑا توڑ کر کوّے کو دے دیا۔ کوّا دونوں ٹکڑے کھا کر ان کی طرف دیکھنے لگا، تو دونوں نے پھر ایک ایک ٹکڑا دے دیا، لیکن کوّا پھر بھی سیر نہیں ہوا۔ اس نے اُچھل کر نیلوفر کے ہاتھ سے بچی ہوئی روٹی چھین لی۔ اس کے بعد اس نے معظم کی روٹی بھی اسی طرح چھین لی۔ دونوں بچوں نے سوچا کہ شاید کوّا بہت بھوکا تھا، اس لیے وہ خاموش ہو رہے اور پانی پینے کے لیے ایک مرتبہ پھر ندی پر پہنچے، جہاں وہی شکاری دوبارہ ملا۔ اس نے بچوں سے کہا: ”تم لوگ ندی کا یہ گندا پانی نہ پیو، میں تمھارے لیے دودھ لایا ہوں، یہ دودھ پی لو۔“

نیلوفر اور معظم نے اس بار بھی دودھ پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ندی کا بہتا ہوا پانی ضرور پییں گے۔ شکاری نے غصے میں دودھ زمین پر پھینک دیا اور چلا گیا۔ کوّا ایک درخت پر بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ میں نے بچوں کی روٹی بھی چھین کر کھالی ہے، اب اُسے ان بچوں کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے بچوں سے کہا:

”بچو! اب شام ہو رہی ہے۔ تم تھوڑی دیر بعد دونوں نوابوں کے پاس جانا اور انھیں اپنی کہانی سنانا کہ کس طرح کرمو اور نصرو نے تمھیں بھیڑیں چرانے پر مجبور کیا اور کس طرح نوابوں کی

جائیداد پر قبضہ کیا، پھر تم کس طرح بوڑھی ملکہ کے پاس پہنچے اور یہاں کیسے پہنچے۔ یہ کہانی سنتے ہوئے دونوں نواب اپنے بیلچے زمین پر رکھ دیں گے۔ تم کوشش کرنا کہ یہ بیلچے اُٹھا کر دور پھینک دو اور اپنی کہانی سناتے رہو۔ اتنی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا تو دونوں نوابوں پر سے شربت کا اثر ختم ہو جائے گا۔“

کوّے کی یہ بات سن کر معظم اور نیلوفر بہت خوش ہوئے۔ ندی سے پانی پی کر وہ دونوں ان کے پاس پہنچے اور انھیں وہ تمام حالات سنانے شروع کیے، جن سے وہ گزر چکے تھے۔ بچوں کی باتیں سن کر دونوں نواب ان کی باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ انھوں نے اپنے بیلچے زمین پر رکھ دیے۔ بچوں کو تو یہ موقع چاہیے ہی تھا۔ نیلوفر نے فوراً بیلچے اُٹھا لیے اور بھاگ کر انھیں ندی میں پھینک آئی۔ بچوں کی کہانی جاری ہی تھی کہ اندھیرا پھیل گیا۔ اس وقت دونوں نوابوں پر سے شربت کا اثر بھی ختم ہو گیا۔ پھر تو جیسے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انھوں نے چونک کر اپنے بچوں کو دیکھا اور ایسے گلے لگا لیا، جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔ پھر وہ چاروں رات کو ہی اپنے شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں نوابوں نے ایک مرتبہ پھر بچوں سے پورے حالات سنے اور طے کر لیا کہ آیندہ وہ کسی آدمی کی بات پر سوچے سمجھے بغیر یقین نہیں کریں گے۔ گھر پہنچ کر دونوں نوابوں نے کرمو اور نصرو کو نوکری سے الگ کر دیا اور آرام کی زندگی گزارنے لگے۔

☆ ☆ ☆

ای-میل کے ذریعے سے

ای-میل کے ذریعے سے خط وغیرہ بھیجنے والے اپنی تحریر اردو (ان پیج نستعلیق) میں ٹائپ کر کے بھیجا کریں اور ساتھ ہی ڈاک کا مکمل پتا اور ٹیلے فون نمبر بھی ضرور لکھیں، تاکہ جواب دینے اور رابطہ کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے بغیر ہمارے لیے جواب ممکن نہ ہوگا۔

نیک لڑکے کی دعا

امان اللہ نیر شوکت

اے میرے مالک! اے میرے داتا! تیرا دیا ہے ہر ایک کھانا

تُو نے بنائی یہ ساری دنیا یہ خوب صورت، یہ پیاری دنیا

ہیں نام تیرے، کیا پیارے پیارے دنیا ہے قائم، تیرے سہارے

چاند اور سورج تُو نے بنائے بخشش کے دریا تُو نے بہائے

ٹھنڈی ہوائیں تُو نے چلائیں باغوں میں کلیاں تُو نے کھلائیں

ساجھی نہیں ہے کوئی بھی تیرا رحمت نے تیری، ہے سب کو گھیرا

شاہ و گدا ہیں تیرے سوالی تُو سب کا داتا، تُو سب کا والی

تیرے کرم کے محتاج ہیں سب تُو سب کا خالق، تُو سب کا یا رب!

دے مجھ کو طاقت، دے مجھ کو ہمت کچھ کر سکوں میں خلقت کی خدمت

دولت عطا کر علم و ہنر کی ہو میرا کام ہر اک سے نیکی

مجھ کو بنا دے تُو نیک لڑکا

مجھ کو سکھا دے تُو لکھنا پڑھنا

گلاب بادشاہ کا فیصلہ

حمیرا سعید

موسم خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جب پھولوں کو چھوتی ہوئی گزرتی تو پھول خوشی سے جھوم جھوم جاتے۔ رنگ برنگی حسین تتلیاں پھولوں کے اوپر منڈلا رہی تھیں۔ آج چھٹیوں کا آخری دن تھا۔ ہادی اور فارعہ باغ کی سیر کو آئے ہوئے تھے۔ ہادی ساتویں جماعت کا طالب علم تھا، جب کہ فارعہ چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔

”ہادی بھائی! وہ دیکھیں! کتنی خوب صورت تتلی ہے۔“ فارعہ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

ہادی، جو درخت پر اپنا نام لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فارعہ کی آواز پر تتلی کو پکڑنے بھاگا۔

”ہادی بھائی! رک جاؤ...... رک جاؤ...... بھائی!“ فارعہ، ہادی کو آوازیں دیتی رہ گئی۔

ہادی نے چاروں طرف دیکھا، ”ارے! تتلی کہاں غائب ہوگئی۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

ہادی کی نظر سامنے بوڑھے برگد کے درخت پر پڑی۔ برگد کا بوڑھا درخت سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی بوڑھے برگد کی آنکھ لگی ہی تھی کہ اچانک تکلیف سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

”یہ کون بدتمیز ہے، جس نے میرے سینے میں چاقو مارا ہے؟“ بوڑھا برگد غصے اور تکلیف سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

یہ ہادی تھا، جو چاقو سے اپنا نام لکھ رہا تھا۔ تکلیف کی وجہ سے بوڑھے برگد کے آنسو بہ رہے تھے۔

ہادی کو تتلیاں پکڑنے، درختوں پر نام لکھنے اور پھولوں کو توڑنے کا بہت شوق تھا۔ حال آنکہ اس کے امی، ابو اور ننھی فارعہ اسے ایسا کرنے سے ہمیشہ منع کرتے تھے۔ آج بھی ہادی نے کسی کی ایک نہ سنی۔ تتلی پکڑنے کے چکر میں وہ بہت دور نکل گیا تھا۔

ہادی نے بوڑھے برگد پر اپنا نام لکھنے کے بعد اردگرد کا جائزہ لیا، جہاں نیم، املی، جامن

اور آم کے درختوں کے علاوہ دوسرے درخت بھی تھے۔

''کیوں نہ میں ان سب درختوں پر اپنا نام لکھ دوں۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ نیم کے درخت کے نیچے ستانے بیٹھ گیا۔ جب نیم کے درخت نے ہادی کو اپنے نیچے بیٹھے دیکھا، تو ڈر کر بولا: ''اب میری باری ہے۔''

املی بولی: ''بھائی نیم! پریشان مت ہو۔ آج ہم اس شریر لڑکے کو ایسا سبق دیں گے کہ یہ کسی درخت پر نام لکھنا ہمیشہ کے لیے بھول جائے گا۔''

آم نے اپنی گردن اوپر کرتے ہوئے کہا: ''املی بہن! کیا تمھارے ذہن میں کوئی ترکیب ہے، جس سے اس نامعقول لڑکے کو سبق سکھائیں۔''

''ہاں!'' املی نے سر کے اشارے سے کہا اور امر بیل کو آواز دی: ''امر بیل بہن! اس لڑکے کو جکڑ لو۔''

املی کی بات سنتے ہی امر بیل، ہادی کے اوپر پھیل گئی۔

''چھوڑو، چھوڑو، مجھے چھوڑ دو۔'' ہادی کا خوف اور تکلیف سے بُرا حال ہو رہا تھا۔

وہ سب درخت زور زور سے بول رہے تھے: ''ہاں، ہاں یہی لڑکا ہے۔ اسے چھوڑنا مت، اس نے ہماری زندگیاں اور سکون برباد کر دیا ہے۔ اسے سزا ملنی چاہیے۔ جیسے اس نے ہمارے ساتھ سلوک کیا ہے، ویسے ہی ہم بھی اس کے سینے پر چاقو سے نام لکھیں گے۔'' بوڑھے برگد نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

ہادی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ آس پاس دیکھنے لگا۔ یہ آوازیں درختوں اور پھولوں کی تھیں، جو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ گلاب بادشاہ کے آتے ہی سب خاموش ہو گئے۔ گلاب بادشاہ نے حکم دیا: ''اس لڑکے کو یہاں کھڑا کیا جائے۔''

پھر گلاب بادشاہ نے کہا: ''ہاں! برگد چاچا! پہلے آپ بتائیے کہ اس لڑکے نے آپ

ساتھ کیا کیا ہے؟''

''جناب! میں بوڑھا درخت ہوں۔ مجھ میں اتنی جان نہیں کہ میں کوئی تکلیف برداشت سکوں۔ مجھے بہت مشکلوں سے نیند آئی تھی کہ اس لڑکے نے اپنے چاقو سے میرے تنے پر اپنا لکھ دیا ہے۔'' اتنا کہہ کر برگد کے درخت کے ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ کانپتی آواز میں بول رہا تھا۔

گلاب بادشاہ نے چنبیلی کے پھول سے پوچھا: ''ہاں، بہن چنبیلی! تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟''

''ہاں کیوں نہیں! یہ وہی لڑکا ہے، جس نے اسکول جاتے وقت مجھے میری شاخ سے لیا تھا۔ مجھے بے دردی سے نوچ کر پھینک دیا تھا اور اب میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں بھی اس کے کے ہاتھ پاؤں نوچ دوں۔'' چنبیلی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''ہاں، یہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم سب کی بھی یہی رائے ہے۔ ہم سب اس کو اسی طرح سزا گے۔'' سب پھولوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

گلاب بادشاہ نے آرڈر آرڈر کہہ کر سب کو خاموش کروایا۔ ایک کونے میں پڑی اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''ارے کتاب، بہن! تمھیں کیا ہوا؟'' گلاب بادشاہ نے کتاب کو روتے دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بتاؤں گلاب بھائی! میں بھی اس لڑکے کے ہاتھوں برباد ہوئی ہوں۔ جب میں نئی تو بہت صاف ستھری تھی۔ جب میں اور میرے ساتھی اس لڑکے کے ہاتھوں میں پہنچے تو اس نے ب کو گندا کر دیا۔ کہیں سے پھاڑ دیا، تو کہیں کسی صفحے کو موڑ دیا۔ کبھی اپنے منھ میں ڈال کر چباتا اب میں اور میرے ساتھی بھی اس لڑکے کو اسی طرح چبانا اور اس کے کان مروڑنا چاہتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی ایک بار پھر سب درختوں، پھولوں نے، گھر کی چھوٹی بڑی چیزوں، گھاس اور دوں، کاپیوں وغیرہ نے شور مچا دیا: ''ہاں ہاں، ہمیں بھی یہی فیصلہ منظور ہے۔''

گلاب بادشاہ نے ایک بار پھر سب کو خاموش کروایا۔

''تم سب اس لڑکے سے اپنا بدلہ لے لو۔'' یہ کہتے ہی گلاب بادشاہ نے سب سے پہلے خود ہادی کے قریب جا کر اُسے کانٹا چبھو دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہادی کو نوچا جانے لگا۔ ببول کا پیڑ اپنے نوکیلے کانٹے سے ہادی کے سینے پر اپنا نام لکھ رہا تھا۔ کوئی اس کے کانوں کو مروڑ رہا تھا۔ ہادی تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔

''مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ یقیناً مجھے ظلم کرنے کی سزا مل رہی ہے۔'' ہادی رو رو کر اپنی زیادتی کی معافی مانگ رہا تھا: ''آج کے بعد میں کبھی کسی درخت پر اپنا نام نہیں لکھوں گا اور نہ کسی پھول کو توڑوں گا اور نہ کتاب، کاپی کے صفحوں کو موڑوں گا۔''

وہ اپنے جسم پر جگہ جگہ نیل اور نام دیکھ کر چیخ رہا تھا۔

''ہادی...... ہادی بیٹا! آنکھیں کھولو۔'' اس کی امی نے اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہادی اپنی امی کی گود میں چھپتے ہوئے بولا: ''امی! مجھے ان درختوں اور پھولوں سے بچا لیجیے۔ میں آیندہ کسی درخت پر اپنا نام نہیں لکھوں گا اور نہ کسی پھول کو بے دردی سے نوچوں گا۔ امی! مجھے پتا چل گیا ہے کہ یہ بھی ہماری طرح جان دار ہوتے ہیں۔ ان کی بھی آنکھیں اور زبان ہوتی ہے۔''

ہادی کے آنسو پونچھتے ہوئے امی اپنے دھیمے لہجے میں سمجھا رہی تھیں: ''دیکھو بیٹا! درخت ہوں یا پھول، پودے یا پھر کوئی جانور، ہمیں سب کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ بھی ہماری طرح جان دار ہوتے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ نے انھیں بولنے کی صلاحیت نہیں دی، ہمیں چاہیے کہ ان کا ہر طرح سے خیال رکھیں اور ان کو کوئی تکلیف نہ دیں۔''

''امی! آپ سچ کہتی ہیں۔'' ہادی نے کہا: ''امی! اب میں اپنے تمام دوستوں کو بھی بتاؤں گا کہ کسی درخت پر اپنا نام لکھنا، پھولوں کو توڑنا، کتابوں اور کاپیوں کو گندا کرنا اور جانوروں

...بہت بری بات ہے۔''

''ہادی بھائی! ہم تو آپ سے پہلے ہی کہتے تھے، مگر آپ سنتے ہی نہیں تھے۔ اب آپ ...نا چلانا! ابھی تو یہ سب خواب میں آپ کے پاس آئے ہیں، کہیں سچ مچ نہ آ جائیں۔'' فارعہ ...ت سے بولی۔

''ہاں! میری چھوٹی دادی جان! مجھے سبق مل گیا ہے اور میں نے اپنے اللہ میاں سے معافی مانگ لی ہے۔''

ہادی نے اپنی چھوٹی بہن فارعہ کی نقل اتارتے ہوئے کہا تو سب مسکرا اُٹھے!

☆ ☆ ☆

آگے بڑھنا سیکھو

کرشن پرو

بچو! آگے بڑھنا سیکھو

ہر مشکل سے لڑنا سیکھو

زیست کی چادر میں تم سب کی

پیار کے موتی جڑنا سیکھو

نفرت کے پَربت سے اُترو

پیار کی سیڑھی چڑھنا سیکھو

ٹی وی پر کیوں وقت گنواتے

اچھی باتیں پڑھنا سیکھو

پیار کی خوشبو سب پہ لٹاؤ

پھولوں جیسے جھڑنا سیکھو

میں نے ''ہمدرد نونہال'' سے کیا سیکھا

شائستہ زرین

بچپن کا کمال یہ ہے کہ یہ جا کر بھی نہیں جاتا عمر کی ہر منزل میں ہمارے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس وقت بھی بچپن کی ایک یاد اور پھر اُس سے جڑی کئی یادوں اور باتوں نے مجھے اپنے حصار میں لیا ہوا ہے۔ بالکل بچپن ہی سے مطالعہ میری عادت ہے۔ جب مجھے ڈھنگ سے لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا، اُس وقت بھی مجھے کتاب اور قلم اپنی جانب کھینچ لیا کرتے تھے۔ اُن دنوں ہمارے گھر میں ایک رسالہ آتا تھا، جسے میرے بڑے بہن بھائی ہی نہیں امی ابا بھی نہایت ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے اور میں صرف دیکھا کرتی تھی۔ رسالے کا سرورق اور اس کے اندر کی تصویریں بہت بھلی معلوم ہوتیں اور میں انھیں دیکھ کر ہی خوش ہو جایا کرتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ اسکول میں میرا داخلہ ہو گیا۔ رسالہ پڑھنے کے شوق میں اُردو پڑھنی بھی جلدی سیکھ لی۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ رسالے میں چھپی ہوئی ایک کہانی میں نے پہلی مرتبہ ہجے کر کے ہی پڑھی تھی۔ جی ہاں، وہ رسالہ تھا ''ہمدرد نونہال۔'' اور جب میں باقاعدگی سے ہر ماہ ہمدرد نونہال پڑھنے لگی تو مجھے جلد ہی احساس ہو گیا تھا کہ یہ رسالہ حقیقت میں نونہالوں کا ہمدرد ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی ہمدرد نونہال کی پہلی کہانی پڑھنے کی، جو بے شک میں نے ہجے کر کے پڑھی تھی لیکن اتنی اچھی لگی تھی کہ فوراً امی کو زبانی سنا دی۔ افسوس صد افسوس، اب وہ کہانی مجھے یاد نہیں، ورنہ آپ کو اس کا خلاصہ ہی بتا دیتی۔

پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ پہلی جماعت کی طالبہ تھی تو نونہال فر فر پڑھ لیا کرتی تھی۔ پہلی مرتبہ جب اٹک اٹک کر ہجے کر کے پڑھ رہی تھی تو کئی الفاظ ایسے بھی تھے، جن کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ امی سے اُن کے معنی معلوم کیے تو امی نے نونہال کا آخری صفحہ دکھایا، جس میں مشکل الفاظ اور اُن کے معنی درج تھے اور الفاظ کا درست تلفظ بھی۔ اُس روز پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ

لغت اور تلفظ کسے کہتے ہیں۔ میرے ہاتھ ایک دل چسپ مشغلہ آ گیا۔ ایک لفظ کے کئی معنی؟ واہ! مزہ آ گیا۔ یہ پہلا تبصرہ تھا، جو میں نے ہمدرد نونہال پر کیا۔ اُس وقت میں کے۔ جی کی طالبہ تھی۔ اس کے بعد تو نونہال لغت سے دوستی ایسی مستحکم ہو گئی کہ ہر ماہ رسالہ آتے ہی سب سے پہلے ''مشکل الفاظ، معنی'' پڑھتی۔ درست تلفظ اور معنی ذہن نشین کر کے پورا رسالہ مزے سے پڑھ لیتی۔ اگر کسی اور کو ہمدرد نونہال پڑھتے ہوئے کسی لفظ کا مطلب نہ آتا تو میں جھٹ بتا دیتی۔ ایک مرتبہ ایسے ہی ایک موقع پر جب میں اپنی ذہانت کی داد سمیٹ رہی تھی کہ اتنی سی بچّی کو ایک لفظ کے کئی معنی معلوم ہیں، تب میں نے نہایت فخر اور مسرت سے سب کو بتایا کہ ہمدرد نونہال میں مشکل الفاظ معنی سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد ہمدرد نونہال کا یہ صفحہ میرے ساتھ ساتھ مجھ پر رشک کرنے والوں کی بھی اولین ضرورت اور دل چسپ مشغلہ بن گیا، جو آگے جا کر تحریری وتقریری مقابلوں میں کام یابی کی ضمانت بھی بنا۔ آپس کی بات ہے، میں آج بھی نونہال لغت سب سے پہلے پڑھتی ہوں اور نونہال لغت کی بنیاد ڈالنے والے محترم مسعود احمد برکاتی سے آج بھی اس ضمن میں فیض اُٹھاتی ہوں۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ ہمدرد نونہال کا انتظار گھر کے چھوٹے بڑے یکساں شوق سے کرتے تھے اور اسی ذوق وشوق سے پڑھتے بھی تھے۔ رسالے کے حصول کے لیے بے ضرر سے جھگڑے بھی ہوتے۔ جو پہلے پڑھ لیتا، وہ اوروں کی آتشِ شوق کو بھڑکاتا اور ہمدرد نونہال کے قارئین (ہر عمر کے اور ایک ہی نشست میں) آپس میں تحریروں پر تبادلۂ خیال بھی کرتے، جس سے نہ صرف مکالمے کی عادت پڑی بلکہ خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا، جو آج بہت کام آ رہا ہے۔

مشکل الفاظ معنی کے بعد جو صفحہ پڑھتی وہ ''جاگو جگاؤ'' تھا، اور یہ اسی کا اثر ہے کہ آج بھی کوئی رسالہ پڑھتی ہوں تو اولین ترجیح اس کا اداریہ ہوتا ہے۔ اداریہ کسی بھی رسالے کا مغز ہوتا ہے۔ جاگو جگاؤ ہمدرد نونہال کا اداریہ ہوتا ہے، جو نہایت پُر مغز ہوتا ہے۔ اس کا موضوع جتنا اچھا ہے،

اتنے ہی اچھے اس کے اثرات بچوں پر مرتب ہوتے اور حکیم محمد سعید صاحب کا پیغام ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے بچے تک اور پھر مزید آگے پھیلتا۔ یوں بیداری کا یہ عمل نیکی کے فروغ کے ساتھ جاری رہتا۔ ہمدرد نونہال پڑھتے پڑھتے ہم ثانوی جماعتوں تک پہنچ گئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے، ایک مرتبہ جاگو جگاؤ پڑھ کر میں نے کہا تھا کہ ارے! یہ تو واقعی نونہالوں کا ہمدرد ہے۔ نونہالوں کے بھلے کے لیے حکیم صاحب کیسی کار آمد بات کہہ گئے۔ حکیم صاحب نے لکھا تھا:

''بہت سے لوگ اپنے کام میں جلدی میں نظرِ ثانی نہیں کرتے، اس لیے اُن کے کام میں وہ خوبی اور حُسن پیدا نہیں ہوتا، جو اطمینان، توجہ اور یکسوئی سے پیدا ہو سکتا ہے، اسی لیے جلد بازی کو شیطان کا کام کہا گیا ہے۔''

آج بھی شعوری اور لاشعوری طور پر حکیم صاحب کی اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

ایک اور دل چسپ سلسلہ ''معلوماتِ عامہ'' پر مشتمل تھا، جس میں ایک ماہ نونہالوں کے لیے سوال شائع ہوتے۔ نونہال اس کے جواب ارسال کرتے اور آیندہ ماہ ان سوالوں کے درست جواب اور اس سلسلے میں شرکت کرنے والے اور کام یاب ہونے والے بچوں کے نام اور تصویریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ دھان پان سے عصمت علی پٹیل کے توسط سے خاصی توانا معلومات ہم تک پہنچتی تھیں۔ ''اخبار نونہال'' کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس سلسلے سے دنیا بھر کی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔ ان تمام سلسلوں کی وجہ سے اسکول سے لے کر جامعہ کی سطح تک بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آج تک کچھ نہ کچھ سیکھ ہی رہی ہوں۔

''پہلی بات'' اور اس کے بیان سے قبل محض ایک فقرے میں اس ماہ کا خیال نہایت جامع اور عمدہ ہوتا ہے، ایسا خیال جس پر عمل کرنے سے زندگی سنور جائے۔ میرا کام یاب اور

خوش گوار تجربہ تو یہی بتاتا ہے۔ میری اور آپ کی تو بات ہی کیا ہے، اس ماہ کے خیال سے بڑے بڑے لوگوں اور اداروں نے فیض اُٹھایا ہے۔ مثلاً دسمبر ۱۹۹۱ء کا خیال تھا "حرکت میں صحت ہے۔"

بلا شبہ یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے، جہاں بچوں نے اس پر عمل کیا، وہاں عالمی ادارۂ صحت (W.H.O) کو یہ خیال ایسا بھایا کہ اسے 2002 کے عالمی یوم صحت کا موضوع ہی بنا لیا یعنی MOVE FOR HEALTH۔ گویا مسعود احمد برکاتی کا خیال درست تھا اور کیوں نہ ہوتا، برکاتی صاحب کئی نسلوں کے بچوں کے ہمدرد جو ہیں۔ جب ہی تو گزشتہ ساٹھ برسوں سے ہمدرد نونہال سے وابستہ ہیں۔ عمر اور تجربے میں اضافے کے ساتھ آپ کا منصب اور منصبی ذمہ داریاں بدلتی اور بڑھتی رہیں، لیکن آپ کی لگن، حوصلہ، ہمت اور جذبہ وہی رہا۔ برکاتی صاحب نے اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ بچوں اور نوجوانوں کی آبیاری کے لیے وقف کر دیا اور ایسی ہر ساعت پر آپ کو فخر ہے اور خوشی بھی، جو آپ نے نونہالانِ وطن کے لیے مختص کر دی۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ آج سے ساٹھ سال پہلے جو بچے تھے، آج اُن کی اولاد کی اولاد بھی ہمدرد نونہال سے فیض یاب ہونے والوں میں شامل ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بچہ بوڑھا برابر، اور ہمدرد نونہال نے اس کی سچائی ثابت بھی کر دکھائی۔ کتنا اچھا لگتا ہے جب دادا، باپ، پوتا، ایک ہی جذبے، ایک ہی اُمنگ، ایک ہی ترنگ سے ہمدرد نونہال پڑھتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی رسالے کے اُن سلسلوں کی، جن کے باقاعدہ مطالعے کی عادت ہمیں ابتدائی بچپن سے پڑ گئی تھی۔ نونہال کی کہانیوں کا اپنا لطف تھا۔ کہانیاں پڑھ کر ان پر دھواں دھار تبصرے بھی ہوتے۔ آج جب کسی کتاب پر لکھے جانے والے میرے تبصرے کو پسندیدگی کی سند ملتی ہے تو دل سے ایک ہی صدا نکلتی ہے: "شکریہ ہمدرد نونہال۔" کہانیاں بھی خوب ہوا کرتی تھیں۔ جنوں اور پریوں کی تصوراتی کہانیوں سے اخلاقی درس مل جاتا، ذہنی تربیت بھی ہو جاتی۔ حقیقت پر مبنی معاشرتی کہانیوں کا مزہ ہی اور تھا۔ کہانی لکھنے کی خواہش بھی تو اسی رسالے کے مطالعے کی مرہونِ منت ہے۔ جب میرا پہلا افسانہ شائع ہوا تو بچپن، نونہال اور کہانی لکھنے کی معصوم سی خواہش نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

بچے اپنے گھریلو اور اطراف کے ماحول، اساتذہ، درس گاہ اور کتاب سے سیکھتے ہیں اور میں نے یہ اَن مول گوہر اپنے والدین اور اساتذہ کے ساتھ نہایت کم سنی ہی سے ہمدرد نونہال سے حاصل کیے ہیں۔ اس رسالے سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، اتنا کہ پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ

"عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں"

آج جب کہ میں خود بچوں کے ادب اور صحافت کے حوالے اپنا عملی کردار ادا کر رہی ہوں تو اب بھی نہ صرف ہمدرد نونہال بلکہ بچوں کے ادب کے رہنما جناب مسعود احمد برکاتی سے کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیتی ہوں۔ آپ کے بارے میں ممتاز و منفرد مزاح نگار جناب مشتاق احمد یوسفی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ "ساٹھ سال تک پاکستان کے نونہالوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت پر انھوں نے جو اَن تھک اور بے لوث خدمت کی ہے، وہ قابلِ ستائش بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی، پانچ نسلیں اُن کی احسان مند ہیں۔"

یہ بجا کہ مجھ جیسے کتنے لوگوں کو ادب و صحافت کا راستہ دکھانے اور جذبۂ شوق کو بڑھانے والے حکیم محمد سعید، سعدیہ راشد اور مسعود احمد برکاتی ہی ہیں۔ اس مثلث نے جانے کتنے لوگوں کا بھلا کیا ہے۔ اپنے بھلے کا تو میں اعتراف کر رہی ہوں۔ ہمدرد نونہال محض ایک رسالہ ہی نہیں، تربیت علم و فن کا ادارہ بھی ہے، جس سے میں نے ماضی میں بھی بہت کچھ سیکھا اور آج بھی یہ سفر جاری و ساری ہے۔

"ہمدرد نونہال زندہ باد، شاد باش، پائندہ باد"

☆ ☆ ☆

گُبرا نیم

حسن منظر

نتو کے گھر کے احاطے میں ایک نیم کا درخت تھا، جس سے کسی کو لگاؤ نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے سال پہلے خود اُگ آیا تھا اور بڑا ہوتا گیا۔ نتو اور اس کے بھائی، بہنوں کو کبھی نہ اوپر چڑھنے کا خیال آیا نہ جھولا ڈالنے کا۔ گھر کے بچے بڑے اُسے گبرا نیم کہتے تھے، حال آنکہ وہ گبرا نہیں تھا۔ اس سے اُن کی مراد یہ ہوتی تھی کہ نیم بوڑھا ہو چکا ہے۔

پیڑوں سے محبت رکھنے والے چھوٹے پودوں کی طرح کبھی درختوں کو بھی پانی دے دیتے یا جڑوں کے پاس کھاد پھیلا دیتے، مگر نتو کے گھر والوں کو کبھی بھی یہ توفیق نہیں ہوئی۔ یوں بھی اس کے گھر میں کسی کو نہ کبھی پودوں کی کیاریاں بنانے کا شوق ہوا، نہ پھولوں کے گملے رکھنے کا۔ پورا احاطہ خود اُجڑا پڑا تھا۔ ایک طرف کی دیوار ڈھے گئی تھی۔ اُسے بھی بڑوں نے ٹھیک نہیں کرایا۔ جب نیم کے پھول گرتے تو نتو کی ماں کو شکایت ہوتی تھی: ”بالکل بے مصرف پیڑ ہے۔ اس پھول اور پتے سوکھ سوکھ کر گرتے رہتے ہیں، کوڑا ہوتا ہے، آم، امرود کا پیڑ ہوتا تو بات تھی۔ املی کا ہوتا تو کتارے کھانے کو ملتے یا شریفہ ہوتا اور کچھ نہ سہی، گوند کا پیڑ ہی ہوتا۔“

غرض سب کو نیم کے پیڑ سے شکایت تھی۔ جب نبولیاں پک کر ٹپکتی تھیں تو کبھی کبھار محلے کے بچے نیچی دیوار پھاند کر آتے اور دو چار نبولیاں چوس کر ان کی گٹھلیاں تھوک کر چلے جاتے تھے۔ اتنے ہی سے ان کا دل بھر جاتا تھا۔ جدھر سے دیوار ٹوٹی تھی، وہاں سے کتے، گدھے اور بھینسیں آ جاتیں۔ ان میں سے کوئی بھی نبولیوں کو منھ نہیں لگاتا تھا۔ نتو کے باپ نے ایک دفعہ نیم کی ایک شاخ توڑ کر اس کی مسواک بنائی، لیکن تھوڑی ہی دیر تک دانتوں پر پھیر کر لاحول ولاقوۃ کہتے ہوئے پھینک دی اور بولے: ”یہ بھی کوئی مسواک ہے۔“

نتو کے دادا نے کہا: ”جڑیں زمین چھوڑ رہی ہیں۔ اس کے دن پورے ہو گئے ہیں۔“

نیم کے جیسے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ خود اس اُجاڑ گھر میں کب خوش تھا، جس کے احاطے میں نہ کبھی جھاڑو دی جاتی تھی، نہ گرمیوں میں شام کو پانی چھڑکا جاتا تھا۔ وہاں تو گدھے لوٹتے تھے۔ اردگرد ٹھیکرے اور کنکر پڑے تھے اور ہاں لید اور گوبر بھی، مگر ''دن پورے ہوگئے ہیں'' والی بات نیم کو کھل گئی۔ ''یہ لوگ بھول گئے ہیں، ان کے پردادا کا جب انتقال ہوا تھا تو میرے ہی سائے میں سیاہ کپڑے سے ڈھکی ہوئی ان کی میت رکھی گئی تھی اور یہیں نمازِ جنازہ ہوئی تھی۔ انھیں نہیں معلوم، ان سے پہلے ان کے کتنے ہی مرنے والوں کے جنازے میرے ہی سائے میں رکھے گئے تھے اور ان سب کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تھی۔'' نیم بے چارہ یہ سب سوچتے ہوئے رو پڑا۔ اسے وہ وقت بھی یاد آ رہا تھا، جب کسی کو یرقان یا چیچک ہوتا تھا تو اس کے پتوں کی ہوا دینے کے لیے محلے والے اس کی شاخ کاٹ کر لے جاتے تھے اور یہ کام خود نتو کے گھر والے بھی کئی بار کر چکے تھے۔ دادا نے اپنی کتابوں میں اس کی سوکھی پتیاں رکھی ہوئی تھیں کہ کتابوں کو دیمک نہ لگے۔ آج یہ لوگ سب احسان بھول گئے تھے۔ نیم کا دل بھر آیا۔

اصل میں اس گھرانے کے بچے گلیوں میں کھیلتے تھے یا اپنے اسکول میں۔ شام کو ان کے پاس ٹیلے وژن دیکھنے کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔ بس سب ٹیلے وژن کو گھیرے رہتے، کوئی ملنے والا آئے، اس کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا، وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا کھاتے تھے یا آپس میں لڑتے تھے۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ صرف اس کی پسند کا پروگرام دیکھا جائے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سب کو نیند آنے لگتی تھی۔

''دن پورے ہوگئے'' والی بات پر، نیم اتنا رو دیا کہ گھر میں کام کرنے کے لیے آنے والی بڑھیا جو اس کے پاس سے ہو کر اندر آئی تھی، بولی: ''بی بی! تمھارا نیم بڈھا ہوگیا ہے، رو رہا ہے۔''

پہلے گھر کے سب بچے نیم کو دیکھنے گئے اور پہلی بار انھیں اس میں دل چسپی ہوئی۔ پھر نتو کے باوا اور اُن کے بھائی بھی باہر نکل آئے اور آخر میں دادا ابا۔

دادا بولے: ''پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس کی جڑیں باہر نکل آئی ہیں۔ بچے گا نہیں، مرجائے گا۔''

ایک لڑکی نے کہا: ''دادا ابا! اسے دیمک بھی کھا رہی ہے۔'' مگر حقیقت میں اس نے مٹی کی اس لکیر کو دیکھا تھا جو جوہڑ میں نہا کر آنے والی بھینس کے اپنے پُٹھے اور کھوے کو درخت کے تنے سے رگڑنے سے بن گئی تھی۔ اُسے مٹی کی یہ لکیر دیمک کا گھر لگی۔ انھیں اوپر چڑھتی ہوئی چیونٹیوں کی قطار نظر آئی۔ دوسرے بچے بولے: ''ہاں، اور دیمک چل بھی رہی ہے۔''

نتو کے دادا نے کہا: ''ایک دن تو اسے مرنا ہی تھا۔ شاید میرے تایا ابا نے اسے لگایا تھا۔''

''پھر؟'' اندر سے نتو کی دادی کی آواز آئی۔

''پھر یہ کہ اس کا رونا دنوں تک نہیں تھمے گا اور جو روئے گا، وہ اس کا تیل ہوگا۔ نیب کا تیل۔ اُسے بوتلوں میں بھر لینا۔''

''اُسے کون پیئے گا؟'' ایک چچی نے کڑواہٹ سے کہا۔

دادا نے کہا: ''بڑے کام کی چیز ہے، اسے گھاؤ پر لگاؤ یا آبلوں اور دانوں پر۔ اگر اسے پیو تو اندر کے زہر مار دیتا ہے۔''

تائی نے کہا: ''تو اب کیا ہم اس کا انتظار کریں کہ کسی کے گھاؤ لگے تو اس پر لگائیں گے اور پیئے گا کون؟''

نتو کے دادا نے کہا: ''جب اس کا رونا تھمے اور یہ سوکھ جائے تو اسے کٹوا لینا۔ لکڑی جلانے کے کام آئے گی۔''

لیکن سب کی رائے ہوئی کہ اس کا رونا ایسا ہے جیسے اُلو کا بولنا۔ ایک دم منحوس۔ نہ جانے یہ رونا کب تھمے۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں کو کئی بار نیم کو کٹوانے کا خیال آیا تھا، لیکن ہر دفعہ کسی نہ کسی کے کہنے سے کہ ہرے بھرے پیڑ کو کٹوانا گناہ ہے، اس کی جان بچتی رہی تھی۔ نتو کے باوا نے کہا: ''تو ٹھیک ہے۔ کل میں مزدوروں کو بلوا کر اسے کٹوا دوں گا۔''

شام ہو گئی تھی۔ سب لوگ اندر چلے گئے۔

نیم کا درخت سوچنے لگا کہ کتنے ناشکرے لوگ ہیں، میرے مرنے کا انتظار کر رہے تھے اور آج مجھے کٹوانے کی سوچ رہے ہیں۔ آج تک کبھی کسی سے اتنا تو ہوا نہیں کہ میری جڑوں پر ایک کٹورا پانی ہی ڈال دیتا۔ نیم رو رہا تھا۔ آس پاس کوئی اور درخت بھی نہیں تھا، جسے وہ اپنا دکھڑا سنا سکتا۔ حد یہ تھی کہ احاطے میں گھاس تک نہ تھی، جو اس کے دکھ میں شریک ہو جاتی۔ واقعی عجیب بے حس اور سنگ دل لوگ تھے۔

رات اندھیری تھی اور ہر طرف سناٹا تھا۔ یہ گھر محلے کے دوسرے گھروں سے تھوڑا ہٹ کر تھا۔ آج سے پہلے نیم کو کبھی ڈر نہیں لگا تھا، لیکن اس رات اس کا ایک پتا تک نہیں ہلا۔ کوئی دیکھتا تو کہتا: "کھڑے کھڑے سو گیا ہے یا سوگ میں ہے۔"

آسمان میں اُدھر ہلکی سرخی آ چلی تھی۔ نیم نے جی کڑا کر کے ایک فیصلہ کر لیا: "ابھی وقت ہے ان بے رحم لوگوں سے دور نکل جانے کا۔ ذرا دن اور نکلا تو یہ لوگ کسی لکڑہارے کو بلا لائیں گے اور وہ بے دردی سے میری ان خوب صورت، مضبوط جڑوں پر کلہاڑا چلانا شروع کر دے گا۔ میں نے درختوں کا یہ حشر پہلے بھی کئی بار دیکھا ہے! زندہ جڑوں کو کاٹتے ہیں، پھر زندہ ہرے تنے پر کلہاڑے اور آرا چلاتے ہیں اور جب وہ ادھ موا ہو جاتا ہے تو رسّے ڈال کر اسے گرا دیتے ہیں۔ پہلے یہاں کتنے درخت تھے۔ اب ایک بھی دیکھنے میں نہیں آتا اور تو اور میرے سائے میں آگ جلا کر اس پر دیگیں چڑھاتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں سوچتے، اس سے میرے پتے جھلس جائیں گے۔"

سوچتے سوچتے اس کا خون کھولنے لگا۔ جی کڑا کر کے اس نے ہلنے کی کوشش کی اور خود سے بولا: "میری بلا سے...... زور لگانے سے جڑیں باہر آ جائیں۔ زندگی ہوئی تو پھر کہیں لگ جائیں گی۔ ان سنگ دلوں سے نجات تو مل جائے گی۔"

اس نے گھر کے صحن پر نظر ڈالی، کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ "ابھی وقت ہے۔" اس

نے خود سے کہا اور زور لگا کر جڑوں کو اُکھیڑنا شروع کیا، لیکن سال ہا سال گزرنے کے بعد ان جڑوں کو کوئی زوردار آندھی بھی نہیں اُکھاڑ سکی تھی، بھلا اب وہ اتنی آسانی سے زمین کو کیسے چھوڑ دیتیں۔ دن نکل رہا تھا۔ نیم کا درخت پوری قوت سے زور لگانے لگا اور آخرکار جب جڑوں سے زمین چھوٹی تو نیم خود ہل گیا۔ اس کے ساتھ ہی درخت پر بیٹھے ہوئے کوے کائیں کائیں کرتے ہوئے اُڑے۔ وہ خوف زدہ بھی تھے، کیوں کہ ان کے گھونسلوں میں انڈے بھی تھے اور ان کے گرنے کا ڈر تھا۔ درخت نے شکر ادا کیا اور احاطے سے باہر نکلنے کے لیے بھاگنا شروع کر دیا۔

راستے میں جو دیوار تھی، وہ پہلے ہی اتنی مضبوط کب تھی، جو اب اس کا راستہ روک سکتی۔ تھوڑی دیر میں جڑوں پر چلتا ہوا وہ نتو کے گھر سے اتنی دور جا چکا تھا کہ اگر وہاں کوئی چھت پر چڑھ کر بھی دیکھتا تو اسے نظر نہ آتا۔

باہر کھلی ہوا میں پہنچ کر اس کا خوف دور ہوا اور کچھ دیر ایک جگہ رک کر اس نے اپنی سانس درست کی۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے کھیت ابھی تک سوئے ہوئے سے تھے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہیں رک جائے، لیکن یہ جگہ آبادی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ تھوڑی دور اور چل کر اسے ایک طرف دریا کا کنارا نظر آیا اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے مکان اور بنگلے نظر آ رہے تھے۔

اس نے خود سے کہا: "یہ جگہ مستقل قیام کے لیے ٹھیک رہے گی۔ دل کہتا ہے کہ یہاں کے لوگ نیک ہوں گے اور نتو کے گھر والوں کی طرح احسان فراموش نہیں ہوں گے۔" نیم کے درخت نے دیکھا کہ یہاں دوسرے درخت بھی تھے اور لگتا تھا، لوگوں کو باغیچوں سے دل چسپی ہے۔

دن نکل آیا تھا۔ آبادی میں لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ باقی عمر اسی جگہ گزارنے کے بارے میں سوچنے لگا، پھر اچانک اس نے دیکھا کہ لوگ لکڑی کے تختوں کی پیٹیاں بنا رہے تھے۔ نیم کے درخت کو دیکھ کر انھوں نے ایک ساتھ کہا: "ارے واہ! یہ درخت کہاں سے آ گیا؟ ہم تو اچھی لکڑی کے لیے ترس رہے تھے۔"

ایک بولا: ''نیم ہے، کڑوا نیم۔''

دوسرا بولا: ''اس کے تختے تابوت بنانے کے لیے بھی اچھے ہوں گے اور قبر کے اوپر رکھنے کے لیے بھی۔''

تیسرے نے کہا: ''اسے دیمک نہیں لگے گی اور ہمیں اس کی لکڑی سے بنائے ہوئے تابوت اور قبر کے تختوں کے دام زیادہ ملیں گے۔''

نیم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے دل میں کہا: ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔'' وہ سمجھ گیا، یہ لوگ بڑھئی ہیں اور کسی درخت کو ان سے بھلائی کی اُمید نہیں ہو سکتی۔

پلک جھپکتے میں سب کے سب بڑھئی اس کی طرف آریاں اور کلہاڑے لیے دوڑے آرہے تھے۔ نیم نے اپنی جڑوں سے کہا: ''ایک بار پھر ہمت کر جاؤ، ورنہ پل بھر میں تم الگ ہوگی اور تنا، شاخیں، پتے الگ الگ۔'' تھکی ہوئی جڑیں ایک بار پھر چرچرائیں اور چل پڑیں۔

جو بڑھئی سب سے آگے تھا، رک گیا: ''ارے! یہ کیسا درخت ہے؟ بھاگے جا رہا ہے۔''

دوسرے نے کہا: ''لگتا ہے، جادو کا ہے اور اس سے دور رہنے ہی میں ہماری بھلائی ہے۔''

لیکن باقی لوگوں نے اس کا پیچھا کرنا بند نہیں کیا۔ وہ کہہ رہے تھے: ''کٹنے کے بعد اس کا جادو سب نکل جائے گا۔ ایسی لکڑی اور بالکل مفت کہاں ملے گی۔''

مگر جڑیں اتنی تیز رفتاری سے چل رہی تھیں کہ دیکھنے والوں کو لگا کہ جیسے کوئی دیو ہیکل جانور بھاگا جا رہا ہے۔ نیم کو سمندر کے کنارے کنارے بھاگنے میں عافیت نظر آئی، مگر وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک جگہ مچھیروں کی بستی نظر آئی۔ ''یہ جگہ ٹھیک رہے گی۔'' نیم نے خود سے کہا اور ٹھیر گیا۔

سمندر کے کنارے جو جھونپڑیاں تھیں، ان میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور ہر جھونپڑے میں چائے بن رہی تھی اور شاید گھی لگی روٹیاں۔ وہیں کنارے پر کشتیاں بندھی تھیں۔

کچھ کشتیاں ریت پر اوندھی پڑی تھیں۔ ان پر بچے چڑھ اُتر رہے تھے۔ نیم کو یہ منظر بہت اچھا لگا اس نے فیصلہ کیا کہ یہ جگہ رہنے کے لیے اچھی رہے گی، لیکن ابھی اس نے ٹھیک طرح سے اپنی جڑیں نہیں جمائی تھیں کہ اسے چند آدمی ایک ادھوری بنی ہوئی کشتی کے پاس باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ساری کشتیاں تو سمندر میں نہیں جا سکتیں، کیوں کہ ان کے پیندے کا تختہ گل گیا ہے اور کسی کا سامنے کا حصہ۔ پھر بڑی مشکل یہ بھی ہے جو کشتی ادھوری ہے، اسے پورا کرنے کے لیے اچھی لکڑی نہیں مل رہی۔

یہ باتیں سن کر درخت کے کان کھڑے ہو گئے، لیکن اسے دیکھ کر ان سب کی باچھیں کھل گئیں۔

''ارے! اتنا اچھا درخت یہاں ہے اور ہم نے آج تک اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔''

دوسرے نے کہا: ''اس اکیلے درخت سے تو اتنی لکڑی نکلے گی کہ ساری ٹوٹی ہوئی کشتیاں بن جائیں گی۔''

تیسرے مچھیرے نے کہا: ''اور نئی کشتی کے لیے تختے ڈھونڈنے شہر بھی نہیں جانا پڑے گا۔''

وہ سب اپنے اپنے اوزار لے کر نیم کی طرف بڑھے اور بے چارہ نیم تھکا ہارا ایک بار پھر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔

ایک مچھیرا بولا: ''ارے! یہ کیا؟ ہم درخت کی طرف دوڑ رہے ہیں اور فاصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ درخت ہے یا آسمان کا کنارہ، جو دور ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔''

نیم کا درخت ایک بار پھر سنسان علاقے میں تھا، جہاں کی مٹی اسے اچھی نہیں لگی۔ اس میں الٹی ہی نمک تھا۔ چلتے چلتے آخر وہ ایک آبادی کے نزدیک آ پہنچا، مگر اس مسلسل سفر سے اس کی جڑیں خشک ہو گئی تھیں اور جب جڑیں خشک ہوں تو تنے، شاخوں اور پتوں کی پیاس کیسے بجھ سکتی ہے۔ ایک جگہ جہاں وہ رکنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کوئلا بنانے والی چھوٹی چھوٹی بھٹیاں نظر

آئیں، جن میں اکثر سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

کچھ مزدور کوئلے کی بوریاں گدھوں کی پیٹھ پر لاد رہے تھے۔ اس نے دل میں کہا: ”بڑا خیر ہوئی کہ میں نے وقت پہ دیکھ لیا، ورنہ تھوڑی دیر میں وہ ان کو کلا بنانے کی بھٹیوں میں ہوتا۔“

ابھی آرام سے بیٹھنا، اس کے نصیب میں نہیں تھا۔

شہر سے گزرتے ہوئے ایک علاقے میں اسے جگہ جگہ فرنیچر بنانے کے کارخانے آئے، جن میں چیرے ہوئے تختوں کے آریوں کی مدد سے ٹکڑے کر کے انھیں رندے سے ہموار کیا جا رہا تھا۔ کہیں برمے سے لکڑی میں سوراخ بنائے جا رہے تھے اور کہیں بنے ہوئے فرنیچر پالش کی جا رہی تھی۔ ایک کارخانے میں جس کی ہوا میں بُرادہ ہی بُرادہ تھا، درختوں کے تنوں کو آ مشین سے چیرا جا رہا تھا۔ اس سے زیادہ اس سے نہیں دیکھا گیا۔

اس نے دل میں کہا: ”اگر یہاں رک گیا تو جلد ہی کسی مکان کے دروازے اور کھڑکیاں بن جاؤں گا یا اسکول کے ڈیسک اور کرسیاں۔“

ایک بار پھر اسے اپنی جڑوں سے کہنا پڑا: ”بھاگو، بھاگو۔“ اور اب جہاں جا کر اس نے د لیا، وہاں آبادی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ بس چند گھر نظر آ رہے تھے۔

ایک لڑکی اپنے گھر کے باہر نیم کو دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اس نے اپنے بھائی، بہنوں آوازیں دینا شروع کر دیں: ”ارے! جلدی آؤ۔ دیکھو، ہمارے گھر ایک پیڑ آیا ہے۔“

سب بچے اس عجیب خبر کو سن کر دوڑے آئے۔ کئی بچوں کے پیر میں جوتیاں، چپلیں تک نہیں تھیں۔ یہی نہیں اس لڑکی کے والد صاحب بھی ہڑ بڑا کر گھر سے نکلے اور والدہ دروازے پردہ اُٹھا کر اس درخت کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

والد نے پاس آ کر پیڑ کو اوپر سے نیچے تک عینک کے شیشوں میں سے دیکھا، چھوا اور بولے: ”ہے تو پیڑ ہی۔“

تھکے ہارے نیم نے سوچا: ”اب یہ میری موت کا حکم سنانے والے ہیں۔“ اس کی جڑوں میں اب اس سے آگے جانے کا دم نہیں تھا۔

مگر اسی وقت اس لڑکی نے نیم سے اس طرح چمٹ کر اور اسے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”ابا! اسے ہم یہیں کھڑا رہنے دیں گے۔“

باپ نے کہا: ”اس کی جڑیں باہر نکل آئی ہیں، انھیں دھوپ لگ چکی ہے۔ اب یہ بچے کا نہیں۔“

لڑکی نے کہا: ”ابا! اس کے لیے میں امی سے وہی دعا پڑھوالوں گی، جو انھوں نے اس وقت پڑھی تھی، جب بھیا بیمار ہوا تھا اور اس کے بچنے کی اُمید نہیں رہی تھی۔ یہاں ایک بھی درخت نہیں۔“

اس کے بھائی نے کہا: ”ہمارے ہاں صرف ایک کیلے کا پیڑ تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔“

باپ نے کہا: ”مگر اس میں پھل نہیں آئیں گے۔“

”تو کیا ہوا! اسے لگا لو۔ میں اس میں جھولا ڈالوں گی۔ روز اس کی جڑوں میں پانی دیا کروں گی۔“

لڑکے، لڑکیاں سب یہی کہہ رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا، میں گرمیوں کی دوپہر میں اس کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کروں گا۔

کوئی کہہ رہا تھا، میں اس کی چھاؤں میں کھٹولا بچھا کر سویا کروں گا۔

آخر میں باپ کو نیم کے تنے کو کہنا پڑا: ”اچھا بھئی، تو یہیں رہ۔ خدا کرے، ایک دن تو گھنا نیم بنے۔“

نیم کے درخت کی جڑوں کا اکڑاؤ ختم ہو گیا اور دھیرے دھیرے اس کی شاخیں اور پتے ہلنے لگے۔

☆

ہمیں سب سے آگے بڑھنا ہے

نینا عادل

صبح سویرے اُٹھنا ہے
اور اسکول پہنچنا ہے
عزم و لگن سے پڑھنا ہے
جی جان سے محنت کرنا ہے
ہمیں سب سے آگے بڑھنا ہے

علم ہے اللہ کو پیارا
یہی نبیؐ نے فرمایا
اور والدین نے سمجھایا
نیک مسلماں بننا ہے
ہمیں سب سے آگے بڑھنا ہے

کرنے میں مدد ہم آگے ہوں
کام سے نہ گھبراتے ہوں
سب کی دعائیں پاتے ہوں
ہر سیدھی راہ پہ چلنا ہے
ہمیں سب سے آگے بڑھنا ہے

ہم پاکستان کا مستقبل
اقبال کے خوابوں کا حاصل
ہم عزم و ہمت کے قائل
قائد کی راہ پہ چلنا ہے
ہمیں سب سے آگے بڑھنا ہے

سندھ کی ایک ممتاز علمی شخصیت

محمد عمران اسحاق

ڈاکٹر غلام علی الانا سندھ کی ممتاز علمی وادبی شخصیت ہیں۔ ضلع ٹھٹھ کے ایک گاؤں ''ترخواجہ'' میں ۱۵- مارچ ۱۹۳۰ء کو ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بنیادی تعلیم اپنے گاؤں میں جب کہ ثانوی تعلیم میر پور بٹھورو اور ٹنڈو محمد خان سے حاصل کرنے کے بعد کراچی کے این۔ جے۔ وی ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ بی۔ اے آنرز کے بعد ۱۹۵۵ء میں سندھ یونی ورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد لندن یونی ورسٹی کے شعبہ لسانیات اور صوتیات کے پہلے پاکستانی طالب علم کی حیثیت سے ایم۔ اے کیا۔ مشہور علمی شخصیت علامہ غلام مصطفےٰ قاسمی کی رہنمائی میں ''سندھ کی ادبی اور ثقافتی تاریخ'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

جناب غلام علی الانا کی تمام زندگی درس وتدریس میں گزری۔ وہ وسیع علم رکھنے والے استاد اور قابلِ فخر انسان ہیں۔ سٹی کالج حیدر آباد میں ۲۶ جنوری ۱۹۵۸ء تک بہ حیثیت لیکچرار پڑھاتے رہے۔ ۱۹۷۶ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سندھی ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر کی حیثیت سے ۱۹۹۰ء میں ریٹائرڈ ہونے کے بعد ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۵ء تک سندھ یونی ورسٹی میں بہ حیثیت وائس چانسلر اہم خدمات انجام دیں۔ انھیں پروفیسر ایمریٹس ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

ڈاکٹر غلام علی الانا پاکستان سمیت دنیا کی مختلف تعلیمی تنظیموں کے ممبر رہے اور علم وتحقیق کے سلسلے میں دنیا کے بہت سے ملکوں کے بین الاقوامی سیمناروں اور کانفرنسوں میں علمی وتحقیقی مقالات پڑھے۔ ان کو لسانیات، ، تحقیق، ادب اور دیگر علمی خدمات پر اعلا ملکی و غیر ملکی اعزازات بھی حاصل ہوئے۔ پاکستان بھر میں آپ کی علمی اور تحقیقی خدمات کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ☆

نونہال مصور

محمد سعد افراہیم، کورنگی

اریبہ وکیل صدیقی، کراچی

طوبیٰ فاروق حسین شیخ، شکارپور

مریم جنت حاجی امداد حسین، کوٹ غلام محمد

عمر طلحہ مغل، ڈگری

ماسٹر اویس اشتیاق، کراچی

عروبہ شریف، راسوامی

رافعہ خالد، ایف بی ایریا

وقار حسین، کراچی

اقصیٰ راؤ عبدالغفار، کراچی

طیبہ عرفان، کراچی

اقصیٰ جاوید جھول، سانگھڑ

سویرا اسلم، حسین آباد

اسماء سلیم، بہاول نگر

گاؤں کا ڈاکٹر

یاسمین حفیظ

شاداب نگر بہت خوب صورت گاؤں تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ دور دور تک کھیت کھلیان اپنی بہاریں دکھاتے تھے اور نہر کے پل پر شہر کی طرف جانے والے لوگوں کا ایک سلسلہ لگا رہتا تھا۔ بیل گاڑیاں، سائیکلیں اور دو مختلف اوقات میں چلنے والی بسیں، جس میں آنے جانے والے لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا تھا۔ وہ گاؤں سرسبز و شاداب وادیوں، گھنے جنگل اور چاروں طرف لہلہاتے کھیتوں کی وجہ سے واقعی شاداب نگر ہی لگتا تھا۔ نورالدین شاداب نگر میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والدین غریب ضرور تھے، مگر بہت خوددار تھے۔ نورالدین کے والد مولوی علیم الدین گاؤں کی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ وہ دینی علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل وہ یوں چٹکیوں میں حل کر دیا

کرتے تھے کہ گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ نورالدین دس سال کا ایک خوب صورت بچہ تھا۔ علیم الدین صاحب نے اسے دینی تعلیم کے ساتھ اسکول کی تعلیم بھی دلانا چاہتے تھے۔ گاؤں میں صرف ایک ہی پرائمری اسکول تھا۔ اسکول کی عمارت کے چند کمروں میں گاؤں کے چودھری نعیم کے جانوروں کا چارا، گھاس پھوس اور غلہ رکھا جاتا تھا۔ عمارت کے احاطے میں گائے، بھینس اور بکریاں بندھی رہتی تھیں۔ اسی احاطے میں ایک جگہ کو صاف ستھرا کر کے استاد جی بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ استاد جی کو پڑھانے کا اتنا شوق نہ تھا۔ وہ لگی بندھی نوکری کر رہے تھے اور جو تھوڑا بہت پڑھاتے بھی تھے تو وہ بھی مولوی علیم الدین کی وجہ سے، کیوں کہ وہ نورالدین کے ساتھ آ کر دری پر بیٹھ جاتے تھے اور بچوں کو پڑھانے میں استاد جی کی مدد کیا کرتے تھے۔ گاؤں کے جاگیر دار چودھری کو مولوی صاحب کا یوں دل چسپی لینا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، مگر وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا، کیوں کہ مولوی صاحب کی بڑی عزت تھی۔ وہ صاف صاف انھیں منع نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ اس کے اپنے بیٹے سفید چمچماتی کار میں روزانہ شہر تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ کسانوں کے بچوں کے لیے یہ سرکاری اسکول تھا، جس کو انھوں نے اپنے جانور باندھنے کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ استاد جی کو بھی حویلی سے بڑی سہولتیں حاصل تھیں، اس لیے وہ بھی بچوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دیتے تھے۔

اسکول کی ایسی حالت دیکھ کر بہت سے بچے اسکول چھوڑ کر کھیتوں میں کام کاج پر لگ گئے تھے۔ کچھ بچے ایسے تھے، جن کی والدین حویلی میں کام کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی ماں یا اپنے باپ کے ساتھ حویلی کے کاموں میں لگ گئے۔ جو ہاتھ قلم تھاما کرتے تھے، ان ہاتھوں سے وہ حویلی کا فرش چمکاتے رہتے تھے۔ نورالدین بہت ذہین اور محنتی بچہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے امی ابو کو پڑھانے کا بہت شوق ہے، اس لیے وہ دل لگا کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ مولوی

صاحب کے پاس تھوڑی سی زمین تھی، جس پر کاشت کر کے وہ گزر بسر کرتے تھے۔

نورالدین کی ماں ایک دین دار اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ انھیں نورالدین کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانے کا شوق تھا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں اپنے لختِ جگر کو کبھی ڈاکٹر کے روپ میں تو کبھی بڑے بڑے قانون داں کے روپ میں دیکھتی تھیں۔

دن اسی طرح ہنسی خوشی میں گزر رہے تھے کہ نورالدین کی دس سالہ زندگی میں اچانک ایک طوفان سا آ گیا۔ مولوی صاحب کافی عرصے سے دمے کے مرض میں مبتلا تھے۔ ایک دن زبردست مٹی دھول کا طوفان آیا۔ مولوی صاحب بھی اناج کو دھول مٹی سے بچانے کے لیے بورے اُٹھا اُٹھا کر محفوظ مقام پر رکھ رہے تھے۔ ریت اور مٹی کے طوفان نے ان کی سانس کی تکلیف کو بڑھا دیا۔ ریت اور مٹی کا طوفان تو گزر گیا، مگر مولوی صاحب کی حالت نہ سنبھل سکی۔ نورالدین اور اس کی ماں روزانہ مرکز صحت جاتے، مگر وہاں ڈاکٹر

ی کرسی خالی رہتی تھی۔ حکومت کی طرف سے یہاں ڈاکٹر کی تعیناتی تو تھی، مگر خدمتِ انسانیت
کا دعوا کرنے والا ڈاکٹر موجود نہ تھا۔

مولوی صاحب کی حالت روز بہ روز خراب ہوتی جا رہی تھی اور آخر ایک رات وہ
ر الدین کو اور اس کی ماں کو روتا چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے۔ نور الدین کو صدمے کے علاوہ
یشانی بھی ہوئی، لیکن آخر اس نے حوصلے سے کام لے کر فیصلہ کیا کہ وہ تعلیم ضرور حاصل
رے گا، پوری لگن اور دیانت داری کے ساتھ، زندگی کے ہر پل کو علم کی طلب میں
رکرے گا اور ڈاکٹر بن کر خلوص کے ساتھ مریضوں کی خدمت کرے گا۔

اب نور الدین اور اس کی امی کی زندگی بہت مشکل ہوگئی تھی۔ نور الدین کی ماں
حوصلے اور ہمت والی تھیں۔ انھوں نے اپنی زمین کسی کسان کو کاشت کرنے کے لیے دینے
فیصلہ کیا تو انکشاف ہوا کہ زمین پر چودھری نعیم نے قبضہ کرلیا ہے اور جعلی کاغذات
اکر زمین اپنے نام کرلی ہے۔ وہ پڑھی لکھی خاتون نہ تھیں، اس لیے اپنے حق کے لیے
واز بلند نہ کرسکیں۔

حالات کے بگڑتے ہی دونوں ماں بیٹے گاؤں چھوڑ کر شہر آ گئے۔ ماں بہت محنتی
یں، اس لیے وہ جلد ہی کئی گھروں میں کام کرنے لگیں۔ وہ ایمان دار اور نیک عورت
یں، اس لیے ایک مالکن نے دونوں ماں بیٹے کو سر چھپانے کی جگہ دے دی۔ غلام محی
الدین صاحب اور ان کی بیگم خدا ترس انسان تھے۔ دوسروں کے کام آنا، انھوں نے اپنی
ندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ چناں چہ نور الدین اور اس کی ماں کو ایک نیک اور شریف انسان
اور ان کی بیگم کا ساتھ مل گیا تھا۔ نور الدین اور اس کی ماں کی زندگی میں مشکلیں تو تھیں، مگر
ان کا حوصلہ چٹانوں کی طرح تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسا سخت
محنت، لگن اور علم ان کے حالات سدھار دیں گے۔

نورالدین شدید محنت لگن اور پوری دل جمعی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ آخر وہ ایک قابل ڈاکٹر بن گیا۔ اس دن ماں اور نورالدین کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ جس دن اس کا نتیجہ آیا، نورالدین کا سر سجدۂ شکر بجالانے کے لیے جھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور بار بار اس کے سامنے اپنے والد مولوی علیم الدین کا چہرہ آ جاتا تھا، جو بغیر علاج کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

حالات موافق ہو گئے تھے۔ نورالدین کچھ عرصے شہر میں رہا، پھر اس نے گاؤں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ ایک خوش گوار صبح تھی۔ نورالدین اور اس کی ماں اپنے مالک غلام محی الدین صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ سے رخصت ہوئے۔ اب نورالدین ایک کار کا مالک بھی تھا۔ ماں بہت خوش تھیں۔ انھیں اپنے گاؤں سے اور گاؤں کے لوگوں سے بہت پیار تھا اور پھر اس بات کی بھی خوشی تھی کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو ایک کام یاب انسان بنا دیا تھا۔ گاؤں کا مرکزِ صحت جو ہمیشہ سے ڈاکٹر سے محروم تھا، اس مرکز کے لیے وہ ڈاکٹر لے کر جا رہی تھیں۔

نورالدین جب اس گاؤں سے گیا تو وہ صرف دس سال کا بچہ تھا اور اب وہ بائیس سال کا ایک کام یاب ڈاکٹر تھا۔ نورالدین نے اپنی انتہائی قابلِ قدر ماں کو بڑے فخر سے اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ یہ ماں ہی تھی جس نے اس کے راستے کے تمام مشکلات کو برداشت کیا تھا۔ نورالدین کا گاؤں آج بھی ویسا ہی تھا۔ ترقی کی رفتار کو جاگیر دار چودھری نعیم جیسے خودغرض لوگوں نے روک رکھا تھا۔ پل سے گزرتے ہوئے نورالدین کو اپنا بچپن یاد آیا۔ وہ اکثر نہر کے پانی کو بہتے ہوئے دور تک دیکھا کرتا تھا۔ تب مولوی صاحب اسے سمجھاتے تھے کہ بیٹا! وقت بہت قیمتی شے ہے۔ گزرا ہوا وقت اور پل کے نیچے سے گزرتا ہوا پانی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ نورالدین گاڑی چلاتے ہوئے یہ بات یاد کر کے مسکرا دیا۔ اس نے اپنے وقت کا صحیح استعمال کیا تھا اور ایک ڈاکٹر بن گیا تھا۔

گاؤں کے لوگ نورالدین اور اس کی ماں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اپنا ...ا سا گھر کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ گاؤں کے لوگوں نے مل جل کر تھوڑی ہی دیر میں گھر ...ف کر ڈالا۔ پڑوسی کریم دین نے گرم گرم روٹی اور گائے کے گوشت کا سالن بنا کر بھیجا۔

دوسرے دن کا سورج شاداب نگر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، کیوں کہ نورالدین نے نہ ...ف مرکزِ صحت کو آباد کر دیا تھا بلکہ بچوں کے اسکول کو بھی گاؤں والوں کی مدد سے ...ف ستھرا کر دیا تھا۔ جاگیر دار چودھری نعیم نے نورالدین کو دیکھ کر خاموش سے اپنے ...ور اور گھاس پھوس اُٹھوا کر اسکول صاف کروا دیا تھا، کیوں کہ وہ جان چکا تھا کہ وہ تعلیم کو ...لنے سے نہیں روک سکتا اور اب اس نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ گاؤں کا بچہ بچہ زیورِ علم ...ے آراستہ ہوگا، کیوں کہ جاگو اور جگاؤ کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ ☆

شاعر اور پہلوان

یونان کے ایک مشہور شاعر سے ایک پہلوان اپنی شہ زوری کی تعریفیں کرنے لگا۔
آخر شاعر نے اُکتا کر اس سے پوچھا: ''تم اپنے سے زیادہ طاقت ور کو پچھاڑتے ہو یا اپنے برابر کو یا اپنے سے کم تر کو پچھاڑتے ہو؟''
پہلوان نے سینہ تان کر جواب دیا: ''اپنے سے طاقت ور کو۔''
شاعر نے کہا: ''یہ غلط ہے، کیوں کہ تم جسے پچھاڑ لو، وہ تم سے زیادہ طاقت ور نہیں ہوسکتا۔''
پہلوان نے خفت سے کہا: ''اپنے سے برابر کو۔''
''یہ بھی غلط ہے۔'' شاعر نے کہا: ''اگر تمھارا حریف تمھارے برابر ہو تو تم اسے کبھی نہیں پچھاڑ سکتے۔''
پہلوان نے مجبور ہو کر کہا: ''اچھا اپنے سے کم تر کو۔''
شاعر نے ایک قہقہہ لگایا: ''یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اپنے سے کم تر پر ہر شخص غالب آ جاتا ہے۔''

مرسلہ: مہک اکرم، لیاقت آباد

میرا بچپن

پروفیسر مشتاق اعظمی آسنسول (انڈیا)

وہ بھی کیا دن تھے، جب ہم اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔

فکر اور پریشانی نے ہمیں چھوا تک نہیں تھا۔ کسی کی پریشانی کا ذکر سنتے تو یوں لگتا تھا جیسے رنگ برنگے غبارے ہماری نگاہوں کے سامنے ہوا میں تیر رہے ہیں۔ ہماری زندگی کا سرخ، سبز اور زرد رنگوں والا گلوب گھومنے والے جھولے کی طرح بڑے ہی پُرلطف چکر لگایا کرتا تھا۔ جب اس کی سالانہ گردش ہوتی تو ہم اپنے امتحان کی تیاری کرتے تھے۔

ہم پانچویں جماعت میں تھے، جب اسکول کے ایک ٹیچر حفیظ اللہ صاحب کا رویہ ہمارے ساتھ بڑا مشفقانہ، بلکہ یوں کہیے کہ دوستانہ تھا۔ انھوں نے اپنی استادی کا رعب ہم پر جمانے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی۔ ہماری شوخیوں کو مسکرا کر ٹال دینا ان کی عادت تھی۔ شاید ان کو اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ وہ خود بھی کبھی ہماری طرح بچے تھے۔

ایک بار انھوں نے ایک لڑکے عین الحق کو کیتلی دے کر ہوٹل سے چائے لانے کے لیے کہا۔ ہدایت یہ کی کہ چائے میں شکر زیادہ ڈلوانا، لیکن عین الحق نے اس میں شکر زیادہ ڈلوانے کے بجائے سرے سے شکر ڈلوائی ہی نہیں۔ حفیظ اللہ صاحب نے چائے پیالی میں انڈیل کر چسکی لی۔ چائے میٹھی نہیں لگی تو انھوں نے سمجھا کہ شکر گھلی نہیں ہے۔ چائے کیتلی میں واپس ڈال کر انھوں نے چمچہ خوب ہلایا، پھر پیالی میں ڈال کر گھونٹ بھرا۔ چائے اب بھی بے مزہ تھی۔ انھوں نے مسکرا کر عین الحق کی طرف دیکھا، جو ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کیتلی اور پیالی ایک طرف سرکائی اور مصنوعی غصے سے بولے: ''چلو، الجبرا کے سوالات حل کرو۔''

حفیظ اللہ صاحب کو الجبرا کے سوالات حل کرنے میں بڑی دل چسپی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ تاریخ کے طالب علم رہے تھے اور تاریخ میں غور و فکر سے کہیں زیادہ حافظے سے کام

لینا پڑتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے الجبرا کے سوالات حل کرنے میں غور وفکر کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی، بس رٹے رٹائے فارمولے پر سوال کو منطبق کر دینے سے صحیح جواب مل جاتا ہے۔ الجبرا میں ہماری دل چسپی کم تھی، اس لیے حفیظ اللہ صاحب ہمیں الجبرا بہتر بنانے کی متواتر تلقین کرتے رہتے تھے۔ وہ رات کو ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے۔

برسات کی ایک اندھیری شام تھی۔ ایک شاگرد ریاض پڑھنے کے لیے کچھ دیر سے آیا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ راستے میں ایک شخص کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ ایک سپیرے کو بلوا کر اس کا زہر اتروایا جا رہا تھا۔ یہ تماشا دیکھنے میں اسے دیر ہو گئی۔

یہ سن کر سب نے اپنی اپنی کتابیں بند کر دیں۔ سانپ سے متعلق سنی سنائی باتوں کے قصے چھڑ گئے۔ فرش پر چٹائی بچھی تھی۔ حفیظ اللہ صاحب اس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے تو سانپ کے بارے میں ایسی ایسی حیرت انگیز باتیں بتائیں کہ لالٹین کی زرد مدھم روشنی میں ماحول بالکل بھیانک ہو گیا اور ہمارے چاروں طرف سانپ ہی سانپ رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اتنے میں چھت سے کوئی چیز اچانک پٹ سے حفیظ اللہ صاحب کی گود میں آ گری۔ وہ ''ارے!'' کہہ کر کپڑے جھاڑتے ہوئے اتنے زور سے اچھلے کہ ایک ہی جست میں فرش سے پلنگ پر جا پڑے۔ ایک لمحے کے لیے تو ہمارے بھی اوسان خطا ہو گئے، لیکن جب پلنگ کے نیچے بھاگتی ہوئی چھپکلی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو منھ میں رومال ٹھونس لینے کے باوجود ہماری ہنسی قابو میں نہ آ سکی۔ مارے ہنسی کے برا حال ہو گیا۔ اس عرصے میں حفیظ اللہ صاحب کے حواس درست ہو چکے تھے۔ جھینپے ہوئے انداز میں مسکرا کر انھوں نے ہماری طرف دیکھا اور بولے: ''چلو، الجبرا کے سوالات حل کرو۔''

ہم آٹھویں جماعت میں پہنچ چکے تھے اور سالانہ امتحان کے دن نزدیک تھے۔ انھوں نے پوچھا: ''رات میں کتنے بجے تک پڑھتے ہو؟''

''سر! رات کو بالکل نہیں پڑھ پاتا۔'' معین الحق نے جواب دیا: ''یہاں سے جانے کے بعد کھانا کھاتا ہوں۔ اس کے بعد نیند آنے لگتی ہے۔''

حفیظ اللہ صاحب بولے: ''کھانا کھانے کے بعد چائے پی لیا کرو، اس طرح نیند نہیں آئے گی۔''

''لیکن سر! جن کو چائے کی عادت ہوتی ہے، انھیں چائے پینے کے بعد بھی نیند آتی ہے۔'' ریاض نے پتے کی بات بتائی، جس کی تائید میں ایک اور لڑکے ابوالخیر نے کہا: ''میں تو خود نیند سے پریشان ہوں سر! کتنی بار چائے پی کر دیکھ چکا ہوں، مگر دس یا بہت زیادہ تو ساڑھے دس بجے کے بعد جاگ کر پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

اب اکرام کی باری تھی۔ اس نے ایک تجویز پیش کی: ''یہ حالت ہے تو تم لوگ لال گولی کیوں نہیں استعمال کرتے؟''

''یہ لال گولی کیا چیز ہے؟'' حفیظ اللہ صاحب نے پوچھا۔

اکرام نے مجھے کہنی سے ٹہوکا دیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ میں بات کو آگے بڑھاؤں۔ میں نے کہا: ''سر! یہ فوری اثر دکھانے والی سرخ رنگ کی گولی ہوتی ہے۔ نیند آتے وقت اگر یہ گولی آنکھ کے پپوٹوں پر ہلکے سے رگڑ لی جائے تو تھوڑی دیر کے لیے بڑا آرام ہو جاتا ہے اور نیند کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے۔''

ہمارے ساتھی اور حفیظ اللہ صاحب کچھ یقین اور کچھ بے یقینی کے عالم میں میرا منھ تک رہے تھے۔ اکرام نے گفتگو کا سلسلہ وہاں سے جوڑا، جہاں سے میں نے ختم کیا تھا: ''میں اور مشتاق اس جادو اثر گولی کے سہارے رات گئے تک پڑھتے رہتے ہیں۔ جب ذرا پلکیں بوجھل ہوتی محسوس ہوتی ہیں، گولی کو پپوٹوں پر رگڑ لیتے ہیں اور نیند غائب ہو جاتی ہے۔''

''یہ گولی کتنے کی ملتی ہے؟'' ریاض نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"صرف دو آنے کی۔" میں نے کہا۔

ریاض، ابوالخیر اور عین الحق ہمیں کچھ اس انداز میں گھورنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ تم لوگوں نے جاگنے اور نیند کا خمار دور کرنے کے لیے اس سہل اور آسان نسخے سے ہمیں اب تک بے خبر کیوں رکھا تھا؟ انھوں نے فوراً ہی جیب سے دو دو آنے کے سکے نکال کر ہماری طرف بڑھا دیے اور اگلے دن گولی لے آنے کی گزارش کی۔

ایک چمک دار کاغذ میں لپٹی ہوئی مٹر کے دانے سے کچھ بڑے سائز کی سرخ سرخ گولیاں جب دوسرے دن لے کر ہم ٹیوشن پڑھنے کے لیے گئے تو ریاض کسی وجہ سے غیر حاضر تھا۔ ابوالخیر اور عین الحق نے اپنی اپنی گولیاں لے لیں اور پپوٹے پر رگڑ کر دیکھا تو ان کی آنکھوں کو بڑی خوش گوار ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

حفیظ اللہ صاحب نے کہا: "ریاض کے لیے جو گولی تم لائے ہو، وہ مجھے دے دو، کیوں کہ آج مجھے رات گئے تک جاگ کر اسکول سے ملے ہوئے کچھ ضروری کاغذات دیکھنے ہیں۔"

اکرام نے گولی دینے میں کچھ پس و پیش کیا، لیکن انھوں نے ہاتھ بڑھا کر خود گولی لے لی اور کہا: "یہ لو پیسے!"

دوسرے روز اسکول میں نہ عین الحق آیا اور نہ ابوالخیر۔ اس دن حفیظ اللہ صاحب کا بھی کوئی پیریڈ ہم لوگوں کے ساتھ نہیں تھا۔

شام کے وقت قاعدے کے مطابق ہم حفیظ اللہ صاحب کے یہاں پڑھنے گئے۔ وہاں ریاض، ابوالخیر اور عین الحق حسب معمول چٹائی پر بیٹھے ہوئے ملے۔ حفیظ اللہ صاحب خلاف معمول پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ عین الحق، ریاض سے کہہ رہا تھا: "کوئی ایک بجے رات تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ ہر پانچ منٹ پر جب بھی آنکھ بند ہونے لگتی، میں لال گولی پپوٹے پر رگڑ لیتا۔ آخر سو گیا۔ صبح سو کر اٹھا تو آنکھوں میں بے حد تکلیف تھی اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔"

ابوالخیر بالکل خاموش تھا۔ اس کی کہانی بھی تقریباً وہی تھی، جو عین الحق کی تھی۔

اپنے مذاق کا یہ تکلیف دہ انجام دیکھ کر افسوس سے ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے، لیکن پشیمانی کے ان آنسوؤں کو نہ ابوالخیر دیکھ سکا اور نہ عین الحق۔ حفیظ اللہ صاحب کے دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ میں ندامت کے لہجے میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا: "معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے گولی پپوٹے پر زیادہ زور دے کر رگڑی ہے۔"

اس واقعے کو برسوں بیت چکے ہیں۔ اب ہمیں ربر کے رنگین غبارے ہوا میں اُڑتے دکھائی نہیں دیتے، بلکہ فکر و پریشانی کی ہوا چلتی ہے تو ہمارے ہوش ضرور اُڑا دیتی ہے۔ عین الحق آسنسول میں فٹ پاتھ پر سلے سلائے کپڑوں کی چھوٹی سی دکان لگاتا ہے اور اپنی پچھلی زندگی کی طرف کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا۔ ابوالخیر کی ریلوے میں ملازمت ہوگئی ہے، جہاں انجن کی چھک چھک میں اس کی تمام بیتی یادیں اور آوازیں ڈوب کر ختم ہوگئی ہیں۔ اکرام انڈین آئرن اسٹیل کمپنی، برن پور میں فورمین ہو چکا ہے۔

اس لیے اب یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ گولیاں میں نے اور اکرام نے چاک کے ٹکڑوں کو گھس کر بنائی تھیں اور انھیں لال روشنائی میں ڈبو کر رنگ لیا گیا تھا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ ریاض، عین الحق اور ابوالخیر تو چکمے میں آگئے تھے اور انھوں نے نیند بھگانے کے لیے سرخ گولی کو اپنے پپوٹوں پر خوب رگڑا تھا، لیکن حفیظ اللہ صاحب نے گولی کو توڑ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ محض چاک کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا ان کی آنکھوں کو نقصان نہیں پہنچ سکا۔

حفیظ اللہ صاحب اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے اور یہ مضمون پڑھتے تو عجب نہیں کہ بے ساختہ بول اُٹھتے: "چلو، الجبرا کے سوال حل کرو۔"

☆ ☆ ☆

معلومات افزا

سلیم فرخی

معلومات افزا کے سلسلے میں حسبِ معمول سولہ سوالات دیے جا رہے ہیں۔ سوالوں کے سامنے تین جوابات بھی لکھے ہیں، جن میں سے کوئی ایک صحیح ہے۔ کم سے کم گیارہ صحیح جوابات دینے والے نونہال انعام کے مستحق ہو سکتے ہیں، لیکن انعام کے لیے گیارہ سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے نونہالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر ۱۶ جوابات صحیح دینے والے نونہال ۱۵ سے زیادہ ہوئے تو پندرہ نام قرعہ اندازی کے ذریعے سے نکالے جائیں گے۔ قرعہ اندازی میں شامل ہونے والے باقی نونہالوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ گیارہ سے کم صحیح جوابات دینے والوں کے نام شائع نہیں کیے جائیں گے۔ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ جوابات صحیح دیں اور انعام میں ایک سو روپے نقد حاصل کریں۔ صرف جوابات (سوالات نہ لکھیں) صاف صاف لکھ کر کوپن کے ساتھ اس طرح بھیجیں کہ ۱۸-جون ۲۰۱۲ء تک ہمیں مل جائیں۔ جوابات کے کاغذ پر بھی اپنا نام پتا بہت صاف لکھیں۔ ادارہ ہمدرد کے ملازمین / کارکنان انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔ ☆

۱۔ توحید کی ضد .... ہے۔ (عقیدہ ۔ گناہ ۔ شرک)

۲۔ مدینہ منورہ سے تین میل دور حضور اکرمؐ نے .... تعمیر کرائی تھی۔ (مسجد نبوی ۔ مسجد قبا ۔ مسجد بنو امیہ)

۳۔ قرآن مجید کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' .... نے لکھی تھی۔ (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۔ ڈاکٹر اسرار احمد ۔ ڈاکٹر ماہر القادری)

۴۔ پاکستان کی واحد خاتون .... تھیں جنھوں نے پاکستان کا صدارتی انتخاب لڑا تھا۔ (محترمہ بے نظیر بھٹو ۔ محترمہ فاطمہ جناح ۔ بیگم رعنا لیاقت علی خاں)

۵۔ پاکستان کا پہلا ایٹمی بجلی گھر ۲۸ نومبر .... میں کراچی میں قائم کیا گیا تھا۔ (۱۹۷۰ء ۔ ۱۹۷۱ء ۔ ۱۹۷۲ء)

۶۔ جب پاکستان میں دن کے بارہ بجتے ہیں تو اس وقت کینیڈا میں رات کے .... بجے کا وقت ہوتا ہے۔ (ایک ۔ دو ۔ تین)

۷۔ مشہور ریاضی داں ارشمیدس .... کا باشندہ تھا۔ (یونان ۔ اٹلی ۔ پرتگال)

۸۔ ناصر الدین محمود شاہ .... میں ہندستان کا حکمران بنا تھا۔ (۱۲۳۰ء ۔ ۱۲۴۳ء ۔ ۱۲۴۶ء)

۹۔ امیر کروڑ کو .... زبان کا پہلا تحریری شاعر کہا جاتا ہے۔ (بلوچی ۔ پشتو ۔ سرائیکی)

۱۰۔ مشہور شاعر .... کا اصل نام شوکت علی خاں تھا۔ (فانی بدایونی ۔ آرزو لکھنوی ۔ خاطر غزنوی)

۱۱۔ ہندستان کے مغل بادشاہوں کا تعلق .... کی نسل سے ہے۔ (سکندر اعظم ۔ سائرس اعظم ۔ چنگیز خاں)

۱۲۔ رومن ہندسوں میں ۴۹ کا عدد انگریزی کے حروف .... سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ (IL-XL-VL)

۱۳۔ اوساکا .... مشہور شہر ہے۔ (چین ۔ جرمنی ۔ جاپان)

۱۴۔ آئس لینڈ کی کرنسی .... کہلاتی ہے۔ (کولون ۔ کرونا ۔ کورنل)

۱۵۔ اردو زبان کا ایک محاورہ ہے: ''لاتوں کے .... باتوں سے نہیں مانتے۔'' (بھوت ۔ پوت ۔ سپوت)

۱۶۔ اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کا دوسرا مصرع مکمل کیجیے:

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
.... لیڈر کو بہت ہے، مگر آرام کے ساتھ
(دکھ ۔ رنج ۔ فکر)

کوپن برائے معلومات افزا نمبر ۱۹۸ (جون ۲۰۱۲ء)

نام: ....

پتا: ....

....

....

کوپن پر صاف صاف نام، پتا لکھیے اور اپنے جوابات (سوال نہ لکھیں، صرف جواب لکھیں) کے ساتھ لفافے میں ڈال کر دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۷۴۶۰۰ کے پتے پر اس طرح بھیجیں کہ ۱۸ جون ۲۰۱۲ء تک ہمیں مل جائیں۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام لکھیں۔ کوپن کو کاٹ کر جوابات کے صفحے پر چپکا دیں۔

کوپن برائے بلاعنوان انعامی کہانی (جون ۲۰۱۲ء)

عنوان: ....

نام: ....

پتا: ....

....

یہ کوپن اس طرح بھیجیں کہ ۱۸ جون ۲۰۱۲ء تک دفتر پہنچ جائے۔ بعد میں آنے والے کوپن قبول نہیں کیے جائیں گے۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام اور ایک عنوان لکھیں۔ کوپن کو کاٹ کر کاپی سائز کے کاغذ پر درمیان میں چپکائیے۔

علم دریچے

زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے کی عادت ڈالیے اور اچھی اچھی مختصر تحریریں جو آپ پڑھیں، وہ صاف نقل کر کے یا اس تحریر کی فوٹو کاپی ہمیں بھیج دیں، مگر اپنے نام کے علاوہ اصل تحریر لکھنے والے کا نام بھی ضرور لکھیں۔

سچی توبہ

مرسلہ : ریحانہ راجپوت

حضرت عمرؓ ایک دفعہ گلی سے گزر رہے تھے۔ آپؓ کی نگاہ ایک ایسے نوجوان پر پڑی جو کپڑوں کے نیچے شراب کی بوتل چھپائے ہوئے تھا۔

آپؓ نے پوچھا: ''اے نوجوان! اس بوتل میں کیا ہے؟''

وہ نوجوان ڈر گیا۔ ندامت اور شرمندگی سے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ باری تعالیٰ! مجھے امیر المومنین کے روبرو شرمندگی اور رسوائی سے بچا۔ میں آیندہ شراب کبھی نہیں پیوں گا۔

پھر اس نے کہا: ''یا امیر المومنین! یہ سرکہ ہے۔''

آپؓ نے فرمایا: ''مجھے دکھاؤ۔''

دیکھا تو سرکہ ہی تھا۔

سخاوت اور فضول خرچی میں فرق

مرسلہ : محمد حبیب عباسی، سکھر

ایک بار ایک شخص کو تجارت میں اس قدر نقصان ہوا کہ وہ لوگوں کا مقروض ہو گیا۔ قرض ادا ہونے کی جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ شخص حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپؓ اپنے خادم کی اس بات پر خفا ہو رہے ہیں کہ اس نے چراغ میں بتی موٹی ڈال دی تھی۔ اس شخص نے جب یہ حال دیکھا تو بغیر کچھ کہے واپس جانے لگا۔

آپؓ نے اس کو واپس جاتے ہوئے دیکھا تو اپنے پاس بلا لیا اور آنے کا سبب دریافت کیا۔

اس نے اپنی ضرورت بیان کی۔ آپؓ نے فوراً اس کی ضرورت کے مطابق رقم عنایت کر دی۔

اس نے رقم لے کر رخصت ہونے سے پہلے حضرت عثمان غنیؓ سے پوچھا: ''آپ نے میری مدد تو فوراً فرما دی، مگر یہ کیا بات ہے کہ آپ خادم پر بتی موٹی ڈالنے کی وجہ سے خفا ہو رہے تھے؟''

آپؓ نے فرمایا: ''سخاوت اور فضول خرچی میں بڑا فرق ہے۔ تمھاری مدد میں نے اس لیے کی ہے کہ تمھارا ان روپوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا

تھا، البتہ چراغ میں پتلی بتی بھی جل سکتی تھی۔"

غیر ملکی کہاوتیں

مرسلہ : نور محمد، خیر پور میرس

☆ بزدل مریض کو کوئی ڈاکٹر اچھا نہیں کر سکتا۔ (افغانی کہاوت)

☆ بغیر دیکھے کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو اور بغیر پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہ کرو۔ (اسپینی کہاوت)

☆ عمدہ دوا اکثر کڑوی ہوتی ہے۔ (جاپانی کہاوت)

☆ گھر میں حقیقی معنوں میں صرف ایک نوکر کام کرتا ہے، وہ ہے گھر کا مالک۔ (جرمن کہاوت)

☆ دولت جب بولتی ہے تو سچائی اکثر خاموش ہو جاتی ہے۔ (مصری کہاوت)

☆ جہاں صدق و خلوص نظر آئے، وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، ورنہ تنہائی ہی تمھاری بہترین رفیق ہے۔ (ایرانی کہاوت)

دعوتوں پر پابندی

مرسلہ : سکندر پرویز، کراچی

حکومت نے دعوتوں میں کھانے پلانے کے لیے دو سو مہمانوں کی پابندی لگا دی ہے۔ اس پر بعض لوگ بہت پریشان ہیں۔ ایک صاحب نے کہا، غریب آدمی ہوں۔ لڑکی کی شادی کر رہا ہوں اور پچیس تیس آدمیوں کو بلانے کا ارادہ تھا، لیکن اب حکومت دو سو پر اصرار کر رہی ہے۔ کیا کروں؟ ہم نے انھیں سمجھایا کہ کہیں سے دو سو تک پورے کرو۔ قانون کی پابندی تو لازم ہے۔ (ابنِ انشا)

گہری بات

مرسلہ : محمد اعظم مغل، ڈگری

جب ناخن بڑے ہو جاتے ہیں تو ناخن کاٹے جاتے ہیں، انگلیاں نہیں۔ بالکل اسی طرح جب رشتے داروں میں غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو غلط فہمیاں ختم کرنی چاہییں، رشتے نہیں۔

جب کافر غالب ہوئے

مرسلہ : شاہ زیب اسلم، حسین آباد

مرزا غالب اور مولانا امام شہید میں ظریفانہ نوک جھونک ہو رہی تھی۔ مرزا غالب نے ظریفانہ انداز میں کہا: "اجی حضرت! یہ تو بتائیے آپ شہید کب ہوئے؟"

امام نے برجستہ جواب دیا: "جب آپ غالب ہوئے۔"

حسد

مرسلہ : محمد جعفر، گروٹ

امام اصمعیؒ بوڑھے ہو چکے تھے، لیکن صحت و توانائی قابلِ رشک تھی۔ کسی نے پوچھا: "حضرت! آپ کی عمر کیا ہے؟"

امام اصمعیؒ نے جواب دیا: "ایک سو بیس سال۔"

اس شخص نے حیرت سے کہا: "اول تو اتنی عمر ہر ایک کو ملتی نہیں اور دوم آپ کی قابلِ رشک صحت و توانائی! آخر اس کا کیا راز ہے؟"

امام اصمعیؒ نے جواب دیا: "اس کا کوئی راز نہیں۔ زندگی کی قاتل ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے حسد۔ میں زندگی بھر حسد سے دور رہا ہوں۔"

معلومات

مرسلہ : ربیعہ نعیم، ملتان

☆ پرندوں میں سب سے زیادہ عمر "گدھ" کی ہوتی ہے۔

☆ مور کی پسندیدہ خوراک "سانپ" ہے۔

☆ مچھر کے ۲۲ دانت ہوتے ہیں۔

☆ جگنو کی روشنی بغیر حرارت کے پیدا ہوتی ہے۔

☆ شہد کی مکھیاں شہد کے علاوہ موم بھی بناتی ہیں۔

☆ انسانی آنکھیں مرنے کے بعد ۳۰ منٹ تک زندہ رہتی ہیں۔

☆ کیکڑے کے دانت اس کے جسم کے اندر ہوتے ہیں۔

☆ بچوں کا محبوب رسالہ "ہمدرد نونہال" ۱۹۵۲ء میں جاری کیا گیا۔

گورنر کو یحییٰ برمکی کا جواب

مرسلہ : شائطہ خرم، کورنگی

یحییٰ بن برمکی، خلیفہ ہارون الرشید کا وزیرِ اعظم تھا۔ ایک مرتبہ ایک گورنر نے اسے خط لکھا: "یہاں ایک مسافر تاجر فوت ہو گیا ہے اور پیچھے بے اندازہ دولت، ایک چھوٹا سا بچہ اور ایک حسین کنیز چھوڑ گیا ہے۔ میری رائے میں ان تمام اشیا کی مستحق آپ کی ذاتِ گرامی ہے۔"

یحییٰ نے جواب میں لکھا: "اللہ تعالیٰ مرنے والے پر رحم کرے۔ مال میں برکت ڈالے۔ بچے کو آغوشِ شفقت میں لے۔ کنیز کو اپنی حفاظت میں رکھے اور تم پر ہزار لعنت بھیجے۔"

کیا آپ جانتے ہیں؟

مرسلہ : وجیہہ الطاف، کراچی

۱۷۴۰ء میں روس کے ایک بادشاہ نے

برفانی علاقے میں برف کی سلیں کٹوا کر ایک محل بنوایا تھا، یعنی اس کی تعمیر میں صرف برف اور لکڑی استعمال ہوئی تھی۔

شاعروں کی نوک جھوک

مرسلہ : کامران اسلام، کراچی

اردو کے مشہور شاعروں سودا اور میر ضاحک میں زبردست نوک جھوک ہو رہی تھی۔ اتفاقاً میر ضاحک، سودا کی زندگی میں انتقال کر گئے۔ سودا تعزیت کے لیے ان کے گھر گئے۔ تعزیت کے بعد انھوں نے اپنی بیاض منگوائی اور میر ضاحک کے خلاف جتنی برائیاں لکھی تھیں، سب نکال کر پھاڑ دیں۔

میر ضاحک کا بیٹا سودا کے اس عمل سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے بھی اپنے والد کی بیاض منگوائی اور اس میں سودا کے خلاف جتنی برائیاں لکھی تھیں، سب پھاڑ ڈالیں۔

معصومیت

مرسلہ : افشاں ناز، کراچی

امریکی اداکارہ ڈورس ڈے جب فلموں میں نہیں آئی تھی تو ایک بیکری میں ملازمت کرتی تھی۔ ایک روز ایک چھوٹا سا بچہ اس کے کاؤنٹر پر آیا اور ایک پیسٹری خرید کر اسے وہیں کھڑا ہو کر کھانے لگا۔ پیسٹری ختم ہو جانے کے بعد بھی وہیں کھڑا رہا۔

ڈورس ڈے نے محسوس کیا کہ وہ اور پیسٹری کھانا چاہتا ہے، لیکن شاید اس کی جیب خالی تھی۔ ڈورس ڈے نے دوسرے گاہک سے فارغ ہو کر اس ننھے بچے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

اسے مسکراتا دیکھ کر بچے نے اس سے کہا:

''کیا آپ مجھ سے شادی کر سکتی ہیں؟''

''لیکن تم تو ابھی بہت چھوٹے ہو۔'' ڈورس ڈے اس کی معصوم گفتگو سے محظوظ ہوتی ہوئی بولی۔

''میرا مطلب ہے، جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔''

''یقیناً جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔''

بچہ چند لمحے تک سر جھکائے کھڑا رہا، پھر بولا: ''کیا آپ اپنے ہونے والے شوہر کو ایک پیسٹری نہیں دے سکتیں؟''

ڈورس ڈے نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک پیسٹری پکڑا دی۔ ☆

بچپن کی یادیں

سعدیہ راشد

ہمارے گھر میں کھانے کے بڑے ادب آداب تھے۔ جب ابا جان کے ساتھ ہم رات کو کھانا کھاتے تو کھانے کی میز پر زیادہ تر خاموشی رہتی۔ زیادہ بات چیت کا سوال ہی نہیں تھا۔ ابا جان تو خیر کم گو تھے ہی، امی جان ایک آدھ جملہ کہہ دیتیں۔ میں بھی بہت احتیاط کرتی۔ کھانے پر اعتراض کرنا تو ہم نے سیکھا ہی نہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے دیا، چپ چاپ کھا لیا۔ چمچے کانٹے کی آواز بھی نہ آنے پائے۔ سوپ پئیں تو ''سڑپ سڑپ'' کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ گودے کی ہڈی کا شوق جب ابا جان میز پر سے اُٹھ جاتے تو پورا ہوتا۔

دن میں ہماری کمانڈ پھوپی اماں کے ہاتھ میں ہوتی۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے با آواز بلند بسم اللہ کہنا پڑتا، تاکہ پھوپی اماں سن لیں، پھر کھانا پلیٹ میں لیتے۔ پہلے نوالے پر بوٹی پر ہاتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ پہلے تین چار نوالے روٹی اور شوربے کے کھا کر بوٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے۔ اب میں اس کی حکمت سمجھتی ہوں کہ یہ نہ لگے کہ ہم ندیدے ہیں اور کبھی ہم نے گوشت کھایا ہی نہیں۔ کھانا سب ساتھ شروع کرتے اور ساتھ ختم کرتے۔ بیچ میں کوئی بہت ہی مجبوری ہو تو اجازت لے کر اُٹھ جائے۔ میٹھے کا شوق ابا جان کو تھا، خاص طور پر دہی میں چینی ملا کر کھاتے۔ میٹھا بھی سب ساتھ شروع کرتے۔ میز پر انواع واقسام کے کھانے نہیں ہوتے تھے۔ ابا جان کی اجازت صرف ایک ڈش کی تھی۔ امی

جان ہر سبزی گوشت کے ساتھ پکاتیں۔ مثلاً گاجر گوشت، بھنڈی گوشت، پالک گوشت۔ خان بھائی اور یونس بھائی پرانے وفادار ملازم تھے۔ ہمدرد ہاؤس میں کبھی ملازموں کے لیے الگ کھانا نہیں پکا۔ امی جان جب رات کو کھانا نکالتیں تو پہلے خان بھائی اور یونس بھائی کے لیے نکالتیں، پھر ڈش میز پر آتی۔ بہت سالوں کے بعد جب میں کالج میں تھی تو مجھے احساس ہوا کہ اگر امی جان یہ سمجھتیں کہ خان اور یونس کو وہ کچھ نہیں دے سکتیں تو وہ خود وہ چیز نہیں کھاتیں۔

ہمارے گھر میں سونے اور جاگنے کے بھی اصول تھے۔ صبح جلدی اُٹھنا اور رات جلد سونا، تاکہ دین اور دنیا دونوں اچھے ہوں! ایک دفعہ ماموں جان (ڈاکٹر حافظ محمد الیاس صاحب) حیدرآباد سندھ سے آئے۔ ہم اُن کے ساتھ رات لیٹ شو فلم دیکھنے چلے گئے۔ میں تو بھول ہی گئی کہ مجھے تو دیر تک جاگنے کی اجازت نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھ ماہ کے لیے فلم بند۔ خان بھائی اور یونس بھائی کو بھی رات نو بجے کے بعد گھر میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اس وقت تک کام سمیٹ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ ہاں اگر کبھی مہمان آئے ہوئے ہوتے تو وہ دیر تک گھر میں رہتے۔

اس زمانے میں گھریلو ملازم کا ہفتہ وار چھٹی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بہت ہی ضرورت کے تحت وہ چھٹی کرتے۔ مجھے یاد ہے، ابا جان امی جان سے کہتے کہ ان کا دن مقرر کر دیجیے۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ کھڑے ہو کر مطالبہ کریں گے، تو کیوں نہ آپ مطالبہ سے پہلے ہی ہفتہ وار چھٹی کا دن مقرر کر لیں۔

ابا جان کا ذاتی کتب خانہ گھر، ہمدرد ہاؤس میں تھا۔ شاید صرف یہ کتابیں ہی دلی سے ساتھ آسکیں۔ باقی چیزیں تو سب ابا جان دلی ہی میں چھوڑ آئے۔ ان کتابوں کے درمیان ہی میری بچیاں اور میں پلے بڑھے۔ اس وجہ سے ہمیں کتابیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق ہے۔ ایک بات یہ بھی بتانے کی ہے کہ جب بھی کوئی نئی کتاب گھر میں آتی، چاہے

وہ کورس کی ہو یا مطالعے کی، امی جان اس کتاب پر کاغذ کا کور ضرور چڑھواتیں۔ میرا شوق تو اور ذمے داریوں کی وجہ سے بہت کم رہ گیا، لیکن تینوں بچیاں بہت شوق سے کتابیں پڑھتی ہیں۔ پاکستان میں کتاب پڑھنے کا شوق اب بہت کم ہو گیا ہے۔ ہم سب کو چاہیے کہ سمجھیں کہ کتاب سب سے اچھی دوست اور ساتھی ہوتی ہے۔ ہمدرد ہاؤس سے ابا جان کا ذاتی کتب خانہ ہمدرد سینٹر، ناظم آباد منتقل ہوا، اور اب بیت الحکمہ (مدینۃ الحکمہ) میں ایک بہت بڑی لائبریری کی شکل میں ہمدرد یونی ورسٹی کے استادوں اور طالب علموں کی خدمت کر رہا ہے۔ ہمدرد نونہال کے قاری بچوں کو میرا پیغام ہے کہ کتاب کو اپنا دوست بنائیں اور اپنے گھروں میں اپنے ایک چھوٹے سے کتب خانہ کا آغاز کر دیں۔ میرے بڑے ماموں جان (حکیم محمد یحییٰ صاحب) جب اپنی بیٹیوں اور مجھے نئی کلاس کی کتابیں خریدنے لے جاتے تو کورس کی کتب کے ساتھ ساتھ معلوماتی اور کہانیوں کی کتابیں بھی ضرور دلواتے۔ یہ کتابیں اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں اور رہیں گی۔ ☆

پتنگا

بظاہر پتنگے اور تتلیاں آپس میں بہت حد تک ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں ۷۰ مختلف قسم کی تتلیاں پائی جاتی ہیں جب کہ پتنگوں کی ۱۰۰۰ سے زیادہ قسمیں موجود ہیں۔ پتنگے کا طرزِ زندگی بھی تتلی سے ملتا جلتا ہے۔ یہ دونوں حشرات پودوں کے پتوں پر انڈے دے دیتے ہیں۔ تقریباً ایک مہینے بعد ان انڈوں سے سنڈیاں نکلتی ہیں اور انہی انڈوں کے چھلکے سنڈیوں کی ابتدائی خوراک بنتے ہیں۔ بعد میں یہ سنڈیاں پودے کے پتوں وغیرہ کے ذریعے سے اپنی غذا حاصل کرتی ہیں۔ اگلے دو مہینے کے بعد یہ سنڈیاں مُجّھ روپ (PUPA) میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور مزید دو مہینے کے بعد آخر ایک ننھے پتنگے کا روپ دھار لیتی ہیں۔

مرسلہ: افشاں ناز، لیاقت آباد

انتخاب

وقار محسن

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا وہ بہت لائق، ایمان دار اور رعایا کے دکھ درد کا ساتھی تھا۔ اس کے عہد حکومت میں ہر طرف خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ جب وہ بادشاہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے سوچا کہ اسے اپنی زندگی ہی میں اپنے وارث کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ رسم کے مطابق اپنے چاروں بیٹوں میں سے سب سے بڑے لڑکے کو تاج پہنا دے، لیکن چوں کہ چاروں بیٹے نالائق تھے، اس لیے بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی سلطنت میں ہی سے چند نوجوانوں کو منتخب کر کے ان کا امتحان لے کر ان میں سے ایک نوجوان کو بادشاہ منتخب کرے گا۔

بادشاہ نے ملک بھر میں اعلان کرا دیا کہ تمام نوجوان جو خود کو محنتی اور ذہین سمجھتے ہوں

بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو جائیں۔ مقررہ تاریخ پر جب بے شمار نوجوان، بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے تو ان میں سے چار نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا۔ بادشاہ نے ان منتخب شدہ نوجوانوں سے کہا: ''میرے ملک کے ذہین نوجوانو! اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں نے طے کیا ہے کہ آیندہ کے بادشاہ کا انتخاب تم لوگوں میں سے کروں۔ میں تم کو ایک نایاب گلاب کے بیج دے رہا ہوں۔ تم چاروں اپنے اپنے بیج لے جاؤ۔ خوب محنت کرو۔ عمدہ مٹی لگاؤ۔ پابندی سے کھاد اور پانی دو اور مناسب روشنی کا انتظام کرو۔ دو مہینے کے بعد اپنے اپنے پودے میرے پاس لے کر آنا۔ جس کا پودا سب سے زیادہ سرسبز و شاداب ہوگا، وہی آیندہ کا بادشاہ ہوگا۔''

ان چاروں نوجوانوں میں ایک کا نام گل باز خاں تھا۔ وہ اپنا بیج بہت احتیاط سے اپنے گھر لے گیا اور اپنی ماں کو پوری کہانی سنائی۔ گل باز کی ماں ایک ذہین اور نیک دل خاتون تھی۔ اس نے پودا اگانے میں گل باز کی پوری مدد کی اور پودے کو ترو تازہ رکھنے کے سارے طریقے بتائے۔

گل باز خاں روز صبح اٹھتا اور بے صبری سے بھاگتا ہوا لان میں جاتا، جہاں اس نے ایک خوب صورت گملے میں وہ بیج بویا تھا۔ وہ ہر صبح اس امید سے جاتا کہ آج ضرور کوئی نازک سی کونپل پھوٹی ہوگی، مگر اسے مایوسی ہوتی۔ پھر بھی وہ ہر صبح ایک نئی امید کے ساتھ اپنے پودے کو ضرور دیکھتا کہ شاید آج اس کی امیدوں کی کرن پھوٹی ہوگی، لیکن اس کو روز نا اُمیدی ہوتی۔

جب ایک ہفتے تک اس کے گملے میں کوئی کونپل نہیں پھوٹی تو وہ بہت فکر مند ہوا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس گیا کہ ان کے پودوں کے بارے میں معلوم کرے۔ پہلے ساتھی نے کہا: ''گل باز! میرا پودا تو پانچ دن بعد ہی پھوٹ گیا تھا۔ اب تو نرم کونپل سے نازک پتے بھی نکل آئے ہیں۔ بہت حسین پودا تیار ہو رہا ہے۔ دو مہینے کے بعد تو اس پودے کی شان دیکھنے کے لائق ہوگی۔''

باقی دو ساتھیوں نے بھی اپنے اپنے پودوں کی بہت تعریف کی۔ ہر کسی کو یقین تھا کہ اس کا پودا سب سے خوب صورت ہوگا اور وہی اس مقابلہ میں کام یاب ہوگا۔

گل باز نے کسی سے اپنے پودے کا ذکر نہیں کیا اور سر جھکا کر گھر آ گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ گل باز بہت افسردہ اور غمگین تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس سے پودے کی نگہداشت میں کوئی کوتاہی رہ گئی، جس کی وجہ سے اس کا پودا مرجھا گیا۔

دو مہینے گزرنے کے بعد وہ دن آ گیا، جب ان چاروں نوجوانوں کو اپنے اپنے پودے لے کر بادشاہ کے سامنے پیش ہونا تھا۔ گل باز نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ خالی گملا لے کر نہیں جانا چاہتا، کیوں کہ سب لوگ اس کا مذاق اُڑائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ بادشاہ ناراض ہو کر اسے سزا بھی دے دے۔ گل باز کی ماں نے سمجھایا کہ وہ بادشاہ کے سامنے ضرور پیش ہو اور سچ ساری حقیقت بیان کر دے۔ انسان کا کام محنت کرنا ہوتا ہے، پھل دینے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

گل باز تھکے تھکے قدموں سے سر جھکائے ہوئے اپنا گملا لے کر بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ لوگ اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے اور آوازیں کس رہے تھے۔ اس نے خاموشی سے اپنا خالی

گملا تینوں گملوں کے ساتھ رکھ دیا، جن میں خوش نما پودے لہلہا رہے تھے۔ سب لوگ ان پودوں کی تعریف کر رہے تھے اور منتظر تھے کہ ان تینوں میں سے کس کا انتخاب ہوتا ہے۔

بادشاہ پہلے گملے کے پاس آیا اور سرخ گلاب دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ باقی دو گملوں میں کھلے حسین پھولوں کی بھی بادشاہ نے بہت تعریف کی۔ آخر میں بادشاہ خالی گملے کے سامنے آ ہوگیا، جس کے نزدیک گل باز سر جھکائے کھڑا تھا۔ بادشاہ نے کرخت لہجے میں گل باز سے کہا: ''نوجوان! یہ کیا مذاق ہے؟ اس کا پودا کہاں ہے؟''

گل باز نے افسردہ لہجے میں کہا: ''حضور! میں نے اپنی ہر ممکن کوشش کی۔ اچھی مٹی ڈالی۔ وقت پر کھاد اور پانی دیا، لیکن افسوس کہ بیج نہیں پھوٹا۔ میری ماں کہتی ہے کہ انسان کا کام محنت کرنا ہے، پھل اللہ تعالیٰ عنایت کرتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اتنی محنت کے بعد بھی بیج نہیں پھوٹا۔''

دربار میں سب لوگوں کو یقین تھا کہ گل باز کو بادشاہ کے قہر کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن سب لوگ حیران رہ گئے، جب بادشاہ نے گل باز کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے قریب بٹھایا اور اعلان کیا: ''یہ نوجوان آپ کا اگلا بادشاہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایمان دار اور نوجوان کام یاب حکمران ثابت ہوگا۔ اب آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے اس نوجوان کا انتخاب کیوں کیا تو سنیے۔ میں نے ان چاروں نوجوانوں کو اُبلے ہوئے بیج دیے تھے، جن کا پھوٹنا اور پودے میں تبدیل ہونا ناممکن تھا۔ گل باز کے علاوہ باقی تین نوجوانوں کے بیج بھی سڑ گئے ہوں گے، لیکن انھوں نے مجھے دھوکا دینے کے لئے گملوں میں دوسرے بیج لگا دیے اور اپنی کارکردگی دکھانے آ گئے، جب کہ گل باز نے ساری حقیقت سچ سچ بیان کر دی اور اس کی پروا نہیں کی کہ اس کو اس ایمان داری کی کیا سزا مل سکتی ہے۔''

کہتے ہیں، گل باز خان نے ایک طویل عرصے تک حکومت کی۔ اس کے دور میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا ہر طرح سے خوش حال رہی۔

☆

چنگ چیا

نوشاد عادل

واحد بھائی نے اس بار پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے نئے کاربار کا سہیل بھائی اور ریاض بھائی سے ذکر نہیں کریں گے۔ انھوں نے بڑی مشکلوں سے کچھ خاصی رقم جمع کر لی تھی اور ساتھ ہی نئے کاربار کا بھی سوچ لیا تھا۔

واحد بھائی ایک دفتر میں کام کرتے تھے، لیکن ان کے کنبے میں دس عدد شیطان صفت بچے اور ایک پہلوان جیسی بیوی شامل تھی۔ واحد بھائی کی پوری تنخواہ ان سب کے انڈے پراٹھوں میں ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اوپر سے مہنگائی عوام کی کمر توڑنے میں مصروف تھی۔

اس سے پہلے بھی واحد بھائی نوکری کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹے موٹے کاربار کر چکے تھے۔ کبھی انھوں نے ہری مرچوں کے ٹھیلے پر پیسا لگایا تو کبھی چوزے پالے، لیکن جب تک خیر سے نقصان نہیں ہوا، وہ چین سے نہیں بیٹھے۔

کئی سال بعد واحد بھائی کے دماغ میں دوبارہ کاربار کرنے کا خیال آنے لگا۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ واحد بھائی گھر میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ان کے بچوں نے پورے گھر میں ہلڑ مچا رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں کوئی سیاسی جلسہ ہو رہا ہے۔ کہیں کوئی حلق پھاڑ کر چلا رہا تھا، کہیں دو بچے مل کر تیسرے کی چمپی کر رہے تھے۔ ایک بچہ واحد بھائی کی شلوار کھینچتے ہوئے چیز کے پیسے مانگ رہا تھا۔ دو بچے باورچی خانے سے چاول کی دیگچی اُڑا لائے تھے اور ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر چاول کھا رہے تھے۔ باقی کے تین بچے صحن میں اپنی اماں کی پٹائی کھا رہے تھے۔

واحد بھائی ان ہنگاموں سے لاتعلق ہو کر کاربار پر غور کر رہے تھے۔ اتنے میں ان کی بیوی چنگھاڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور خونی نظروں سے واحد بھائی کو دیکھتے ہوئے چیخی: ''بس ...... بیٹھے رہو آرام سے ٹی وی کے آگے، یہ نہیں کہ ذرا بچوں کو بھی دیکھ لو کہ کیا

ستیاناس کر رہے ہیں یہ جنگلی بچے۔''

واحد بھائی کا بیوی پر تو بس نہیں چلتا تھا۔ انھوں نے شلوار کھینچنے والے گڈو کو زور سے تھپڑ مارا: ''شلوار چھوڑ اور دفع ہو جا، نہیں ہیں پیسے ویسے۔'' بچے کا اسپیکر آن ہو گیا۔

بیوی بولی: ''اسی لیے تو کہتی ہوں نوکری کے علاوہ کچھ اور بھی کر لو، مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے۔''

واحد بھائی نے سر ہلا کر کہا: ''بے فکر رہو بیگم! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں کوئی نہ کوئی کاروبار بھی کروں گا۔'' اتنے میں چاول کھانے والے بچوں نے دیگچی اُلٹ دی اور بیگم صاحبہ نے ان کی خبر لینا شروع کر دی۔

تیسرے روز محلے والوں نے واحد بھائی کے گھر کے دروازے پر ایک عجیب و غریب مشین دیکھی۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہے کیا بلا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ پانی کی موٹر ہے۔ کوئی اسے جنریٹر قرار دے چکا تھا۔ ایک عورت نے اسے جوس نکالنے والی مشین کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ ایک بزرگ نے حد کر دی۔ وہ اپنے چشمے کی اوٹ سے اس مشین کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر اعلان کرنے والے انداز میں بولے: ''لو بھئی، اب میں سمجھ گیا۔''

ایک نوجوان حیرت سے بولا: ''ماموں! اتنی عمر گزارنے کے بعد اب بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے۔''

ماموں تلملا کر بولے: ''میاں! میں اس چیز کی بات کر رہا ہوں۔ یہ اُڑن کھٹولا ہے، اُڑن کھٹولا۔''

اسی وقت واحد بھائی گھر سے بالٹی اُٹھائے باہر نکلے۔ انھوں نے ماموں کی بات سن لی تھی۔ بُرا سا منھ بنا کر بولے: ''ماموں! ایسا کرو گے تو کون آئے گا۔''

ماموں نے جواب دیا: ''تو تم آ گئے ہو میاں! میں نے ٹھیک پہچانا ہے نا؟''

واحد بھائی نے بالٹی رکھ دی اور کہا: ''کسی حد تک تو ٹھیک ہی پہچانا ہے۔ ویسے یہ چنگ چی ہے۔ آج ہی خرید کر لایا ہوں۔ اُڑن کھٹولے جیسی ہی رفتار ہے اس کی۔''

ایک بوڑھی عورت نے پان چباتے ہوئے کہا: ''اے بھیا! یہ کیا نام ہوا بھلا...... چنگ چی۔ مجھ سے پوچھ کر کوئی اچھا سا نام رکھ لیتے۔''

وہی چلبلا نوجوان بولا: ''خالہ! ایسا کرو جاپان یا چین چلی جاؤ۔ وہاں بہت سی چیزیں بن رہی ہیں۔ وہ لوگ تم سے پوچھ پوچھ کر چیزوں کے نام رکھ لیں گے۔''

بوڑھی عورت غرّا کر اس کی جانب گھومی تو وہ کھسک لیا۔

واحد بھائی اپنی چنگ چی کو غسل دینے کے لیے بالٹی میں پانی لائے تھے۔ لوگ چلے گئے تو انھوں نے چنگ چی کو دھونا شروع کیا۔ گاڑی کی حالت بڑی خراب تھی۔ اس کا کیبن اور آگے لگی موٹر سائیکل کا آدھا حصہ ڈھیلا ڈھالا لگ رہا تھا۔ اسے جس مکینک نے بنایا تھا، وہ شاید ہیرو نچی تھا۔ بے چارے واحد بھائی کے پاس جتنی رقم تھی، اس میں صرف یہی چیز آ سکتی تھی۔ جس شخص نے یہ چنگ چی واحد بھائی کو فروخت کی تھی، اس نے ان پیسوں سے گدھا خرید لیا تھا اور بڑے سکون میں تھا، کیوں کہ اس کی زندگی میں ایک ٹھیراؤ اور گدھا آ گیا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے روز تک محلے بھر کو معلوم ہو گیا تھا کہ واحد بھائی نے چنگ چی رکشا خریدا ہے۔ بس پھر کیا تھا، لوگ جوق در جوق مبارک باد دینے چلے آ رہے تھے۔ کوئی بھی مٹھائی کھائے بغیر نہیں ٹل رہا تھا۔ واحد بھائی ہزار روپے کی مٹھائی لے آئے تھے اور ہر آنے والے کا منھ میٹھا کرا رہے تھے۔

ابھی چار دوستوں کو مٹھائی کھلا کر انھوں نے زبردستی رخصت کیا ہی تھا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ واحد بھائی جھنجلا کر اُٹھے اور دروازہ کھولا۔ سامنے ایک بزرگ رشتے دار کھڑے تھے۔ واحد بھائی پر نظر پڑتے ہی وہ ہاتھ پھیلا کر لپکے: ''آ خا...... میاں......''

یقیناً وہ "مبارک باد" کہنا چاہتے تھے کہ واحد بھائی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بالوشاہی ان کے کھلے ہوئے منھ میں بڑی بے دردی سے ٹھونس دی اور ان کا رخ گلی کی جانب کر کے چلتا کر دیا۔ دروازہ بند کر کے دوبارہ اندر آ بیٹھے۔ انھیں جس شخص کا انتظار تھا، وہ اب تک نہیں آیا تھا۔ واحد بھائی نے چنگ چی چلانے کے لیے اپنے ایک دوست سے کسی ڈرائیور کا بندوبست کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس دوست نے موبائل پر کال کر کے کہا تھا کہ وہ ایک آدمی کو بھیج رہا ہے، جس کا نام دھڑیں بخش ہے۔ اُسے ڈرائیور کی نوکری دے دینا۔

اب واحد بھائی دھڑیں بخش کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ شام ہوگئی، دھڑیں بخش تو نہیں آیا، البتہ بیگم کی بڑی بہن اپنے چار خطرناک بچوں کے ساتھ آ دھمکیں۔

آتے ہی ان کے بچے چنگ چی سے ایسے چمٹ گئے جیسے وہ ان کے "ابو" ہیں۔ سالی صاحبہ نے صحن میں کھڑی چنگ چی کو دیکھتے ہی اس کی بلائیں لینی شروع کر دیں: "آئے خدا نظر بد سے بچائے۔ کیا خوب صورت شکل ہے ماشاء اللہ...... ارے بھائی! بہت بہت مبارک ہو تمھیں۔ آخر اللہ نے تمھیں بھی عزت دے ہی دی۔"

واحد بھائی ان کے آخری جملے پر غور کرتے ہوئے بولے: "باجی جی! اسے چنگ چی رکشا کہتے ہیں۔ آپ اندر جائیں، مٹھائی وہیں رکھی ہے۔"

مٹھائی کا سنتے ہی چاروں بے چین بچے مٹھائی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ باجی جی نخریلے لہجے میں بولیں: "آئے، وہ تو میں ضرور کھاؤں گی اور کھانا بھی کھاؤں گی۔ ساتھ ساتھ آج ہم اس "چاچی" پر سیر کرنے بھی جائیں گے۔" یہ سنتے ہی واحد بھائی کا دورانِ خون سُست ہو گیا اور منھ چپیتے کی طرح لٹک گیا۔ اتنے میں ان کی بیگم صاحبہ اندر سے نکلیں اور دونوں بہنوں کی ملاقات کا دہشت ناک منظر واحد بھائی نے سہمے ہوئے انداز میں دیکھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر واحد بھائی نے چنگ چی رکشا گلی میں نکالا۔ باجی جی کے

چاروں بچے اور اُن کے اپنے سات بچے شور مچاتے ہوئے چنگ چی پر چڑھ گئے۔ پھر ان کی بیگم صاحبہ اور باجی جی سوار ہوئیں تو اُن کے وزن سے چنگ چی کا اگلا حصہ فضا میں معلق ہو گیا، جیسے گدھا گاڑی پر زیادہ بوجھ ڈالنے سے گدھا ہوا میں بلند ہو جاتا ہے۔ اس پر واحد بھائی بیٹھے تھے۔ بس ہوا یہ کہ باجی جی فٹ بال کی طرح لڑھک کر زمین پر جا گریں، پھر جو انھوں نے چنگ چی کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو بغیر رکے بولتی ہی چلی گئیں۔

بیگم صاحبہ نے واحد بھائی کی کمر پر گھونسا مارا: "ارے گرا دیا میری بہن کو...... کیا میری بہن سے دشمنی تھی۔ تھوڑی سی خوشی نہیں دیکھی گئی میری بہن کی......"

واحد بھائی کی جان عذاب میں پھنس گئی تھی۔ بڑی مشکل سے گاڑی کو سیدھا کیا اور چند بچوں کو آگے بٹھا کر وزن برابر کیا۔ پھر سارے شہر میں بیگم صاحبہ اور باجی جی کو سیر کروائی۔ بچوں نے ایسا شور مچا رکھا تھا، جیسے میچ جیت کر آ رہے ہوں۔ لوگ مڑ مڑ کر چنگ چی کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی جلوس جا رہا ہو۔

☆......☆......☆

صبح صبح دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی، جیسے کوئی ہتھوڑے سے دروازہ توڑ رہا ہو۔ واحد بھائی ہڑبڑا کر اُٹھے اور بڑے غصیلے انداز میں گلی کا دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سامنے ایک عجیب سے حلیے کا آدمی کھڑا سر کھجا رہا تھا۔ واحد بھائی غصے سے بولے: "اب تم لوگوں کی اتنی ہمت ہوگئی ہے کہ دروازے بجا کر بھیک مانگتے ہو۔"

آدمی ہکلا کر بولا: "مم...... میں فقیر نہیں ہوں سائیں! میرا نام دھڑیں بخش ہے۔"

واحد بھائی چونکے: "اچھا تو تم ہو...... کل کیوں نہیں آئے تھے؟"

"سائیں! میں تو کل سے آپ کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں، اب جا کے ملا ہے۔" اس نے بتایا: "اور سائیں! میں نے ناشتا بھی نہیں کیا۔"

"شکل سے تو لگتا ہے کہ دو مہینوں سے بھوکے ہو۔" واحد بھائی اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولے: "اچھا تم رکو اِدھر، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" واحد بھائی نے اُسے بڑی عزت سے گٹر کے ڈھکن پر بٹھایا اور خود اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے چنگ چی رکشا باہر نکالا اور دھڑیں بخش سے کہا: "چلو بھئی، کک مارو۔"

دھڑیں بخش نے اپنی بڑے گھیر والی شلوار کے پائنچے چڑھائے اور "یا ہو" کر کے واحد بھائی کی کمر پر زور سے لات ماری۔ وہ "ہائے میں مرا" کا نعرہ لگا کر چنگ چی سے جا ٹکرائے، پھر بڑے غصے میں پلٹ کر بولے: "احمق انسان! یہ کیا کیا؟"

دھڑیں بخش معصومیت سے بولا: "سائیں! تم نے تو کہا تھا کہ کک مارو، میں نے ماردی۔ سائیں! اگر ٹھیک سے نہیں لگی ہو تو ایک اور ماروں؟"

واحد بھائی نے اپنے سر کے بال نوچے اور بولے: "بے وقوف! میں نے چنگ چی اسٹارٹ کرنے کا کہا تھا۔"

واحد بھائی کی مجبوری یہ تھی کہ جس دوست نے دھڑیں بخش کو بھیجا تھا، وہ ان کے بچپن کا دوست تھا۔ واحد بھائی گاڑی میں بیٹھے اور کہا: "چلو، گاڑی چلا کر دکھاؤ۔" انھوں نے چابی پہلے ہی لگا رکھی تھی۔

دھڑیں بخش آگے بڑھا اور بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ ایک دم کلچ چھوڑا تو واحد بھائی اُلٹے گرتے گرتے بچے۔ ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ دھڑیں بخش نے راکٹ کی رفتار سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ واحد بھائی نے بڑی مضبوطی سے سیٹ پکڑ لی اور چلائے: "ہلکے چلا بھائی! اپنے ساتھ مجھے بھی اسپتال لے جائے گا کیا؟"

دھڑیں بخش نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ واحد بھائی کو اپنی مہارت سے متاثر کرنا چاہتا تھا، لہٰذا سڑک پر چنگ چی کے کرتب دکھانے شروع کر دیے۔ کبھی وہ رفتار

ایک دم بڑھا دیتا تو کبھی جھٹکے سے بریک لگا دیتا، کبھی ایک دم گاڑی موڑ دیتا تھا، اسپیڈ بریکر پر گاڑی زور سے اُچھال دیتا۔ واحد بھائی کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے گناہوں کی توبہ کر رہے تھے۔ پھر دھڑیں بخش نے گاڑی گلیوں میں موڑ دی۔ کچی گلیوں میں گاڑی ایک ایک فٹ اور واحد بھائی ڈیڑھ سے دو فیٹ اوپر اُچھل رہے تھے۔ اچانک ایک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت ٹوکری اُٹھائے باہر نکلی۔

دھڑیں بخش زور سے چلایا: "بچ مائی! ہٹ جا راستے سے۔"

مائی پان چوسنے میں مصروف تھی، کیوں کہ چبانے کے لیے دانتوں کا ہونا ضروری تھا۔ اس نے چشمے کے پیچھے سے چنگ چی کو آندھی طوفان کی طرح اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو حیرت ناک رفتار سے دوسری طرف دوڑ لگا دی۔ بھاگتے بھاگتے وہ کوسنے بھی دے رہی تھی۔ واحد بھائی، دھڑیں بخش کو بریک لگانے کا کہہ رہے تھے: "بریک لگا...... او بھائی! بریک لگا دے...... روک اپنے چاچے کو۔"

دھڑیں بخش نے سوال کیا: "کہاں ہوتا ہے بریک؟"

واحد بھائی کی جان نکل گئی: "قبرستان میں۔"

چند منٹ بعد چنگ چی رکشا اس علاقے کے قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ واحد بھائی آنکھیں بند کر کے یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے تھے۔

"آ گیا قبرستان سائیں! اب کیا کروں؟"

"کوئی اچھی سی قبر دیکھ کر مجھے دفنا دے۔" واحد بھائی تکلیف دہ آواز میں بولے۔

دھڑیں بخش نے حد ہی کر دی، وہ قبرستان کے کھلے دروازے سے گاڑی اندر لے آیا اور ایک پختہ قبر سے ٹکرا کر گاڑی روکی۔ جیسے ہی گاڑی ٹکرائی، ایک چیخ اُبھری۔ دوسری چیخ واحد بھائی کی نکلی۔

''یہ...... یہ مُردے کی چیخ تھی۔'' واحد بھائی پُر یقین لہجے میں بولے۔
''نہیں سائیں! مُردے کی نہیں، تمھاری چیخ تھی۔''
''میں پہلی چیخ کی بات کر رہا ہوں۔''
''وہ...... اچھا...... وہ تو کتا تھا، جو قبر کے ساتھ بیٹھا تھا۔'' دھڑیں بخش نے ہنستے ہوئے بتایا۔ واحد بھائی نیچے اُترے اور ڈپٹ کر بولے: ''اُترو...... اُترو نیچے...... تم اس قابل نہیں کہ ڈرائیوری کر سکو۔''
''تو سائیں! میں کنڈیکٹری کرلوں گا، ڈرائیوری آپ کرلینا۔'' دھڑیں بخش نے ہاتھ جوڑ لیے۔ واحد بھائی نہیں مانے تو وہ ان کی شلوار سے لپٹ گیا اور آخر واحد بھائی سے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔

☆......☆......☆

دھڑیں بخش نے چنگ چی رکشا چلانا شروع کر دیا۔ واحد بھائی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر اس نے خراب انداز میں گاڑی چلائی تو وہ اسے نوکری سے نکال دیں گے۔ اب واحد بھائی کو روز کی بچت کے پیسے بھی ملنے لگے۔ وہ خوش ہو گئے۔ چند دن بعد دھڑیں بخش گاڑی سمیت غائب ہو گیا۔ تین دن گزر گئے۔ واحد بھائی نے اسے ہر جگہ تلاش کر لیا، وہ نہیں ملا۔ وہ سمجھے کہ دھڑیں بخش چنگ چی لے کر بھاگ گیا۔ پانچویں دن وہ تھانے میں رپورٹ کرانے کے ارادے سے نکلے تو دیکھا کہ دھڑیں بخش چنگ چی لیے چلا آ رہا ہے۔
واحد بھائی نے پریشانی اور غصے سے پوچھا: ''کہاں مر گئے تھے اتنے دنوں سے؟''
''مرا نہیں تھا سائیں! زندہ سلامت ہوں۔ اپنے گاؤں چلا گیا تھا چنگ چی لے کر۔ میرا گدھا بیمار تھا، اسے دیکھنے گیا تھا۔''
''آئینے میں اپنی شکل دیکھ لیتے، تمھارا مقصد اِدھر ہی پورا ہو جاتا۔''
''معاف کر دو سائیں! اب گدھا بیمار ہو گا تو آپ کو بتا کے جاؤں گا۔'' دھڑیں بخش

ہاتھ جوڑ لیے۔
واحد بھائی نے منھ بنایا: ''بس بس میں کوئی جانوروں کا ڈاکٹر ہوں، جو گدھے کی بیماری مجھے بتاؤ گے۔ آئندہ ایسی حرکت مت کرنا، سمجھے۔'' دھڑیں بخش نے کھوپڑی ہلا دی۔
ایک ہفتے بعد دھڑیں بخش پھر غائب ہو گیا۔ واحد بھائی پھر پریشان ہو گئے۔ وہ یہ سمجھے کہ اس کا گدھا دوبارہ بیمار ہو گیا ہے۔ تیسرے روز دھڑیں بخش چنگ چی لے کر آ گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو واحد بھائی نے دروازہ کھولا۔ سامنے دھڑیں بخش کھڑا تھا۔
''اب کدھر چلے گئے تھے احمق انسان؟'' واحد بھائی اس کی شکل دیکھتے ہی بولے۔ ''وہی گدھے کا معاملہ تھا کیا؟''
''نہیں سائیں! گدھے کا نہیں، اس بار میرے دادا کا معاملہ تھا۔''
''اب وہ بیمار ہو گئے تھے؟''
''بیمار نہیں ہوئے تھے، ان کی سال گرہ تھی۔'' دھڑیں بخش نے بتایا۔
''چنگ چی کہاں ہے؟'' واحد بھائی نے پوچھا۔
''گلی میں ہے سائیں! یہ لو چابی۔'' دھڑیں بخش نے چنگ چی کی چابی واحد بھائی کے حوالے کر دی۔
واحد بھائی نے باہر آ کر چنگ چی رکشا دیکھا تو چونک گئے۔ اس کے موٹر سائیکل والے حصے پر بڑی سی پرانی چادر اس طرح ڈالی تھی کہ اگلا حصہ چھپ گیا تھا۔
''یہ اس پر چادر کیوں ڈالی ہوئی ہے تم نے؟'' واحد بھائی نے حیرت سے پوچھا۔
''سائیں! مٹی دھول کی وجہ سے ڈالی ہوئی ہے۔'' دھڑیں بخش گھبراتے ہوئے بولا: ''اچھا سائیں! مجھے اب اجازت دو، میں صبح آؤں گا۔''
''ارے...... ارے یہ...... یہ گاڑی کیوں ہل رہی ہے خود بخود؟'' واحد بھائی اُچھلے: ''چنگ چی پر جن تو نہیں چڑھ گیا کہیں؟''

''جب آپ کی بیگم اس پر چڑھ سکتی ہیں تو بھلا جن کیوں نہیں چڑھ سکتا۔'' دھڑیں
بڑی عجلت میں بولا: ''اچھا سائیں! اب میں جا رہا ہوں۔''

''ایک منٹ رک جاؤ۔'' واحد بھائی نے آگے بڑھ کر چادر ہٹانی چاہی تو ایک زور
''ڈھینچوں'' کی آواز بلند ہوئی۔

''یہ کیا...... کم بخت!'' واحد بھائی، دھڑیں بخش کی طرف گھومے۔

وہ ڈرتے ڈرتے بولا: ''سائیں! میں نے گاڑی میں گدھے کی آواز والا ہارن لگایا۔
اگر تم بھی گاڑی چلاتے ہوئے اسے بجاؤ گے تو لوگ سمجھیں گے، گدھا آ رہا ہے۔''

واحد بھائی نے چادر ہٹائی اور ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ چنگ چی کے آگے
سائیکل کے انجن کے بجائے ایک سچ مچ کا گدھا بندھا تھا۔ گدھے نے گردن گھما کر واحد بھائی
برادرانہ نظروں سے دیکھا اور شکریہ ادا کرنے کے لیے دانت دکھائے۔ واحد بھائی تو صدمے
غصے سے پاگل ہو گئے۔ انھوں نے مڑ کر دھڑیں بخش کو دیکھا۔ وہ دور بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اب
اسے بھاگ کر پکڑ نہیں سکتے تھے، لہٰذا اور کچھ نہ سوجھا تو اپنے چنگ چی رکشا پر بیٹھ گئے۔ جو ا
''گدھا چی'' بن چکا تھا۔ چنگ چی چلانے کے لیے اگلے حصے پر بیٹھنا ہوتا ہے۔ واحد بھا
گدھے پہ بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ گدھا اسٹارٹ کرتے، ان کی بیگم صاحبہ درواز
آئیں اور انھیں گدھے پر بیٹھا دیکھ کر منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ارے کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ گدھا خرید لیا۔''

بیگم صاحبہ کی آواز اتنی بلند تھی کہ بہت سے محلے والے باہر نکل آئے۔ انھوں نے
زبردست تماشا دیکھا تو وہاں قہقہے گونجنے لگے۔ واحد بھائی شرمندہ ہو کر گدھے سے اُتر آئے۔
سمجھ گئے تھے کہ دھڑیں بخش نے موٹر سائیکل والا حصہ کسی حادثے میں تباہ و برباد کر دیا تھا اور ا
کی جگہ اپنا بیمار گدھا لگا دیا تھا، تا کہ واحد بھائی کی گاڑی چلتی رہے۔

اس بار بھی واحد بھائی کا کاربار ناکام ثابت ہوا تھا۔

ایک بچہ کم ہے

جدون ادیب

میری کوئی طے شدہ فیس نہیں ہے۔ میں حالات کو دیکھ کر فیس لینے کا فیصلہ کرتا ہوں۔
ی کبھار اتنی فیس مل جاتی ہے جتنی توقع ہوتی ہے، مگر اکثر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یعنی
بہت زیادہ مل جاتی ہے یا بالکل نہیں ملتی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کوئی پرائیویٹ جاسوس ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ
نے بہت عرصہ بے روزگار رہنے کے بعد ایک دوست کے مشورے پر ایک دفتر کھول لیا
۔ دفتر کے باہر لگے بورڈ پر ان خدمات کی تفصیل درج تھی کہ اپنا قیمتی وقت بچانے کے
لیے معمولی فیس کے عوض اپنے کام مثلاً کاغذی کارروائی، قانونی کارروائی، خرید و فروخت
ور دیگر مسئلے مسائل حل کرائیں۔

محنت اور لگن کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ تھوڑے دنوں بعد ہی مجھے مختلف نوعیت کے کام
ملنے لگے۔ مثلاً بلوں کی ادائی، گھریلو سامان کی خرید و فروخت، سودا سلف لانا، گھریلو
تقریبات کا انتظام، مستری، پلمبر وغیرہ اور الیکٹریکل کام کے لیے کاریگر فراہم کرنا، حتیٰ کہ
مجھے بعض گھروں میں نکاسی آب کے کام بھی دیکھنا پڑے، مگر میں نے ہر کام کے کرنے کی
کوشش کی اور پھر اچھی آمدن بھی ہونے لگی۔ میں نے اپنے ساتھ ایک مستقل لڑکا رکھ لیا اور
کچھ لڑکوں کو ضرورت پڑنے پر بلوا لیتا تھا، یوں کام بہت اچھا چل رہا تھا کہ ایک دن میرے
مطلب کا کام آ گیا۔

وہ ایک روشن اور چمک دار دن تھا۔ اس دن کا آغاز بھی قابلِ دید تھا۔ علاقے کے سماجی
کارکن مسکین چچا نے میری درخواستوں اور فائل ورک کی مدد سے علاقے میں ایک پرائمری
اسکول منظور کروا لیا تھا اور اسی خوشی میں وہ مجھے پانچ ہزار روپے انعام دے گئے تھے۔

دن کا آغاز بہت اچھے طریقے سے ہوا تھا۔ صبح سویرے پانچ ہزار کا انعام مل گیا۔ دو تین چھوٹے موٹے کاموں سے بھی آج تھوڑی بہت رقم ملنے کی اُمید تھی۔ سارا دن پڑا اور جس رفتار سے کام چل رہا تھا، اسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ یہ دن بھی بہت مصروف گزرے گا۔ میں نے ایک دکان میں دفتر بنایا تھا۔ چار پیسے ہاتھ آ رہے تھے تو کچھ دفتری ما حول بھی بنا لیا تھا۔ ایک ناکارہ کمپیوٹر خرید کر اسے مرمت کرایا تھا، جو میز پر پڑا رہتا تھا اور میں دفتر میں آنے والوں کو دیکھ کر کمپیوٹر میں اس طرح مصروف ہو جاتا تھا کہ جیسے مجھ پر کام کا بہت دباؤ ہے۔

اس دن شکیل صاحب دفتر میں داخل ہوئے تو میں ایک درخواست ٹائپ کرنے اور پھر ہاتھ روک کر شکیل صاحب کے استقبال کے لیے اُٹھا اور گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ شکیل صاحب نے پہلے تو میری نیک نامی اور شہرت کی تعریف کی اور پھر کہا کہ وہ ایک کام میرے ذمے لگانا چاہتے ہیں۔

میری عادت ہے کہ کام کی ساری تفصیل سننے سے پہلے کام کرنے کی ہامی نہیں بھرتا اس سے ہر پہلو سامنے آ جاتا ہے اور بہتر فیصلہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

شکیل صاحب نے اپنی بات کہہ کر میری طرف دیکھا، جیسے توقع کر رہے ہوں کہ میں اس طرح کہوں گا کہ آپ حکم کریں یا آپ بولیں کیا کام ہے، میں کر دوں گا۔

میں نے چند لمحے سوچنے کی اداکاری کی پھر بھاری لہجے میں بولا: ''اوکے، آپ مجھے تفصیل سے بتائیں، کیا کام ہے؟''

شکیل صاحب ایک بڑے سرکاری افسر تھے اور اس محلے میں ان کا گھر کافی بڑا اور خوب صورت تھا۔ چھت پر انھوں نے کبوتر پال رکھے تھے۔

شکیل صاحب نے بتانا شروع کیا: ''میرے گھر کے پیچھے واقع خالی پلاٹ میں

ب کے وقت ایک بلی آ کر آہ وزاری کرتی ہے۔ میں تین دن سے دیکھ رہا ہوں، مجھے ہے کہ بلی کسی تکلیف میں ہے، مگر جب میں اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ بھاگ ہے۔ اس کی آواز میں اتنا درد ہوتا ہے کہ میں بہت بے چین رہنے لگا ہوں۔ میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ جمشید صاحب نے کہ آپ بہت اچھے طریقے سے محلے والوں کے کام آ رہے ہیں تو سوچا کہ یہ کام آپ کے حوالے کر دوں۔''

''اوکے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا: ''گویا آپ چاہتے ہیں کہ میں بلی کی تکلیف کا پتا لگاؤں اور اس کی تکلیف دور بھی کروں؟''

''جی ہاں۔'' شکیل صاحب خوش ہو کر بولے: ''اگر آپ یہ کر سکیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اس بلی کی وجہ سے کچھ ایسا ڈسٹرب رہنے لگا ہوں کہ ایک دو بار تو وہ بلی خواب میں بھی نظر آئی۔''

''اب آپ بے فکر ہو جائیں!'' میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''اب میں اس معاملے کو دیکھوں گا اور ایک دو دن میں آپ کو مکمل رپورٹ پیش کروں گا۔۔ آخر میں اسی کی فیس لیتا ہوں۔ دفتر کا کرایہ اور لڑکوں کو تنخواہیں وغیرہ دیتا ہوں۔''

شکیل صاحب میری دفتری زبان سے بہت متاثر ہوئے اور فوراً ہزار کا نوٹ نکال کر میرے سامنے رکھا اور بولے: ''سر دست یہ رکھ لیں۔ ویسے بھی نیکی کا کام ہے، مگر پھر بھی کچھ اور خدمت بھی کر دوں گا۔''

میں اس شام مغرب سے ذرا پہلے شکیل صاحب کے گھر کے عقب میں واقع خالی پلاٹ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بلی آئی اور اِدھر اُدھر سونگھ کر درد بھری آواز میں فریاد کرنے لگی۔ پھر مایوس ہو کر ایک طرف چل دی۔

میں نے دیکھا کہ شکیل صاحب کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ میں نے غیر محسوس طریقے سے بلی کا تعاقب شروع کر دیا۔ بلی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی خالد صاحب کے گھر کے سامنے پہنچی اور دروازے کے اوپر سے چھلانگ مار کر اندر گھس گئی۔

میں باہر کھڑا بلی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بلی باہر نکلی اور مسجد کی طرف چلی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسجد کی چھت پر چڑھ گئی اور وہاں سے تھوڑی دیر بعد نکلی اور ایک طرف چل دی۔ پھر وہ تیزی سے ایک گلی میں گھسی اور میرے پہنچتے پہنچتے غائب ہو گئی۔

میں حیران تھا کہ بلی مختلف جگہوں پر کیوں جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بلی پھر گلی میں نظر آئی۔ اب اندھیرا ہو چکا تھا اور بلی اب زیادہ محتاط تھی، وہ تیزی سے چلتی ہوئی ایک اور گلی میں غائب ہو گئی۔

میں واپس آ گیا۔ گھر میں الماری کھول کر معلوماتی کتابیں ڈھونڈتا رہا۔ ایک مضمون ملا، جس میں بلیوں کے متعلق بہت ساری معلومات تھیں۔ ان معلومات کی روشنی میں مجھے کچھ صورتِ حال واضح ہوتی نظر آئی۔ رات کو انٹرنیٹ کے ذریعے سے بلیوں کی مختلف کہانیاں پڑھیں اور پھر صبح تک کے لیے بے غم ہو کر سو گیا۔

اگلی صبح کا آغاز دل چسپ تھا۔ میں مطلوبہ معلومات کے لیے نکلا تو پتا چلا خالد صاحب کے گھر میں بلی کا ایک بچہ رہ رہا تھا جو بلی خود وہاں چھوڑ کر گئی تھی اور بچوں کے اصرار پر گھر والے اس بچے کا خیال رکھتے تھے۔ مسجد کی چھت پر بھی ایک بچہ موجود تھا، جسے موذن صاحب دودھ وغیرہ ڈالتے تھے، جو وہ کم ہی پیتا تھا، مگر وہاں بہت خوشی سے رہ رہا تھا اور خوب صحت مند ہوتا جا رہا تھا۔ بلی کا ایک اور بچہ سکینہ خالہ کے گھر ملا، جسے ان کی بیٹی نے بہت پیار سے رکھا ہوا تھا۔ چوتھا بچہ شریف کے ہوزری کارخانے میں تھا۔ کاریگر مزدور اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

بلی کا ایک پانچواں بچہ بھی تھا جسے اس نے اُس خالی پلاٹ میں رکھا تھا اور جہاں سے لاپتا ہو گیا تھا۔ بلی اپنے بچوں کو ان کے جسم کی مخصوص بُو کی مدد سے ان کو ڈھونڈ لیتی ہے، اسے اپنے بچے کی بُو نہیں مل رہی تھی۔ اس کی ممتا یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اس کے بچے کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، کیوں کہ اگر وہ کسی کتے کے ہتھے چڑھ بھی جاتا تو بلی کو اپنے بچے کی کسی نہ کسی نشانی کو دیکھ کر اس کا پتا ضرور چل جاتا۔

بلی کا گمان درست تھا۔

ہوا یوں کہ خالد صاحب اور سکینہ خالہ کے بچوں کے پاس بلی کے بچے دیکھ کر محلے کے سارے بچوں کے دل مچل گئے تھے کہ ان کے پاس بھی بلی کا بچہ ہو اور خود شکیل صاحب کے دونوں بچے ثمرین اور جمیل بھی بلی کا بچہ پالنا چاہتے تھے، مگر وہ جانتے تھے کہ ان کے ابو اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ ثمرین اور جمیل خالد صاحب کے گھر بلی کا بچہ دیکھ کر گھر آئے اس شام انھیں اپنے گھر کے پاس ایک بلی کا بچہ ملا، جو انھوں نے اُٹھا لیا اور امی کی نظروں سے چھپا کر چھت پر پہنچا دیا اور کبوتروں کے ڈربے کے پیچھے ایک خالی صندوق رکھ کر بچے کو اس میں رکھ دیا۔

ثمرین اور جمیل نے بلی کے بچے کے لیے فیڈر میں دودھ ڈال کر اسے پلایا اور جیسے ہی وہ دودھ پینے لگا۔ ثمرین نے بلی کے بچے کو مچھر مار لوشن لگا دیا اور جمیل نے بچے کو مچھروں سے بچاؤ کے لیے صندوق کے پاس ایک مچھر مار کوائل جلا دی۔

بلی واپس آئی اور بچے کو نہ پا کر ادھر اُدھر ڈھونڈتی رہی، مگر اسے اپنے بچے کی بُو نہیں ملی۔ ایک تو وہاں لوشن اور دھوئیں کی بُو تھی اور دوسرا یہ کہ چھت پر آنے کا واحد راستہ دروازے سے آتا تھا اور کافی الگ تھلگ اور اونچا ہونے کی وجہ سے بلی اسے ڈھونڈ نہیں سکی تھی۔ پانچواں بچہ میں نے ہی دریافت کیا تھا اور شکیل صاحب کو بلا کر بتایا کہ بلی کا

ایک بچہ کم ہے، جس کی وجہ سے وہ آہ وزاری کرتی ہے۔ میں نے ان کی حیرت سے مخ
ہوتے ہوئے انکشاف کیا کہ پانچواں بچہ ان کے گھر پر ہے تو وہ بُری طرح چونک گ
میں نے انھیں ساری کہانی سنائی تو وہ بہت متاثر نظر آنے لگے۔ پھر میں نے ان کو سمجھایا
بلی کئی گھروں میں ایک ایک کر کے اپنے بچے رکھ آتی ہے اور باری باری جا کر انھیں دو
پلاتی ہے۔ وہ چھپ کر یہ جائزہ بھی لیتی ہے کہ اس کا بچہ محفوظ تو ہے، ورنہ وہ بچے کو کہیں ا
منتقل کر دیتی ہے۔

میں نے شکیل صاحب کو بہت تفصیل سے بلیوں کے بارے میں بتایا۔ میں اپنی کوش
میں کام یاب رہا اور انھیں یہ احساس ہو گیا کہ میں نے بہت لگن اور محنت سے یہ کیس حل کیا ہے
انھوں نے میری توقع سے بڑھ کر مجھے انعام دیا اور ایک انعام میرے لیے اور تھا
اس شام کو جب بلی خالی پلاٹ میں پہنچی تو ہم نے اس کا بچہ پہلے ہی وہاں پہنچا دیا تھا۔
اور اس کے بچے کا جذباتی ملن دیکھ کر ہم سب لوگ جو یہ منظر دیکھ رہے تھے، بہت متا
ہوئے۔ پھر بلی نے مجھے غور سے دیکھا۔ شاید اس نے مجھے پہچان لیا تھا کہ کل میں اس کا پ
کرتا رہا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ یہ بھاگ دوڑ میں نے اسی کے لیے کی تھی۔

بلی کی آنکھوں میں تشکر آمیز آنسو دیکھ کر مجھے ایک اور قیمتی انعام ملنے کا احساس ہ
اور طمانیت کی ایک لہر میرے وجود میں اُتر گئی۔ ☆

گراہم بیل

گراہم بیل نے گونگے اور بہرے بچوں کی قوتِ سماعت بحال کرنے کے لیے بہت سے
تجربات کیے اور یہی چیز سب سے اہم ایجاد ''ٹیلے فون'' کی صورت میں سامنے آئی۔ اس نے
۱۸۷۶ء ٹیلے فون ایجاد کر لیا تو دوسرے کمرے میں موجود اپنے دوست تھامس واٹسن سے ٹیلے فون پر
سب سے پہلا جملہ کہا:
''مسٹر واٹسن! مہربانی فرما کر یہاں آیئے، میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

ادب وصحافت کی خدمت پر اعزاز

۱۶-اپریل ۲۰۱۲ء کو اسلام آباد میں صدرِ پاکستان جناب آصف علی زرداری نے مسعود احمد برکاتی
کو ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' کا طلائی تمغا پہنایا اور ان کی طویل ادبی، صحافتی
خدمات پر مبارک باد دی۔ ماہ نامہ ہمدرد نونہال، کراچی کی ساٹھ سالہ کام یاب، پُر اثر
اور بلا وقفہ اشاعت پر یہ اعلا اعزاز آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی (A.P.N.S) کی سالانہ
تقریب (منعقدہ ایوانِ صدر اسلام آباد) میں پاکستان کے سینئر ترین ایڈیٹر مسعود احمد برکاتی
کو دیا گیا۔

مسعود احمد برکاتی ہمدرد نونہال کے علاوہ طب وصحت کے ممتاز ماہ نامہ ہمدرد صحت کے
مدیرِ منتظم، ہمدرد لیبارٹریز (وقف) کے ٹرسٹی اور ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے سینئر ڈائرکٹر
پبلی کیشنز بھی ہیں۔ آپ کی اب تک تقریباً بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ☆

معصوم چور

ام عادل

گاؤں میں ہر طرف نہایت سکون تھا۔ لوگ آپس میں بہت محبت سے مل جل کر رہتے
ے۔ کسی ایک کا دکھ سارے گاؤں کا دکھ سمجھا جاتا تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کے نفع نقصان کا
یال رکھتے تھے۔ دنیا میں کسی بھی جگہ پر صرف اچھائی یا صرف بُرائی نہیں ہوتی، بلکہ اچھائی اور
رائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اچھائی کے ساتھ اگر بُرائی موجود نہ ہو تو اچھائی کی اہمیت سمجھنا
شکل ہو جاتا ہے۔ جہاں اچھائی زیادہ ہو اور بُرائی بہت کم تو ایسے ماحول کو عمومی طور پر اچھا ہی کہا
جاتا ہے۔

اس گاؤں کے زیادہ تر لوگ محنتی، جفاکش، امن پسند اور آپس میں ایک دوسرے کا خیال
رکھنے والے تھے۔ اسی گاؤں کا ایک لڑکا نذیر تھا، جو طبعاً سیدھا سادہ، مگر سست اور کام چور تھا۔
اُس کے گھر والے اُسے فارغ بیٹھنے کے بجائے محنت مزدوری کرنے کے لیے زور دیتے تھے۔ گھر
والوں کی باتوں سے بچنے کے لیے اب اس نے زیادہ وقت گھر سے باہر آوارہ گردی میں گزارنا
شروع کر دیا تھا۔ جب بھوک لگتی تو گھر کی راہ لیتا۔ ماں کھانا تو دے دیتی، مگر اس کے نکمے پن پر
طعنہ بھی دیتی، جسے وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتا۔ پڑھنے لکھنے سے بھی اُسے
کوئی دل چسپی نہ تھی۔ بچپن میں ماں نے کئی بار اُسے گاؤں کے اسکول میں داخل کرایا، مگر ہر بار
اس نے کھیل کود کے چکر میں کتابیں گم کر دیں۔ بڑی مشکلوں اور مولوی صاحب کی خصوصی توجہ
سے صرف قرآن پاک پڑھ پایا تھا۔

گھر سے باہر نکما گھومنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں کے لوگوں نے بھی آوارہ گردی کرنے پر
اُسے ٹوکنا اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اب گھر اور باہر اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ گھر میں ہوتا تو
ماں کچھ نہ کچھ کہتی رہتی، گھر سے باہر نکلتا تو قدم قدم پر گاؤں کے لوگ اُسے کچھ کام کرنے کی تلقین
کرتے۔ ان حالات سے تنگ آ کر اس نے کچھ کرنے کا سوچا، مگر وہ کرے گا کیا! پڑھا لکھا تو
ہے نہیں، ہنر اس نے کوئی سیکھا نہ تھا۔ ماں نے بہت کہا تھا کہ کچھ نہیں تو درزی کا ہنر ہی سیکھ لو
کہ کچھ کما سکو، مگر محنت سے تو اُس کی جان نکلتی تھی۔ اب کرے تو کیا کرے؟ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی
پڑے گا، کیوں کہ نکما پھرنے پر گھر والوں نے اور گاؤں والوں نے اُس کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ بہت
سوچنے پر اُسے دکان داری کا خیال آیا جو اُس کے خیال سے سب سے آسان کام تھا، مگر دکان داری
شروع کرنے کے لیے کچھ رقم کا ہونا ضروری تھا۔ وہ رقم کہاں سے آئے گی۔ ابا جو دن بھر محنت
مزدوری کر کے کچھ رقم لاتے، اُس سے تو گھر کا خرچ ہی بہت مشکل سے پورا ہوتا تھا، بچت تو
نہیں ہوتی۔

اس نے اُدھار کے بارے میں سوچا، مگر کس سے مانگے۔ گاؤں کے تقریباً سب ہی لوگ
غریب تھے۔ کچھ گھر جو خوش حال ہیں، وہ مجھ نکمے کو قرض ہرگز نہیں دیں گے۔ قرض بھی ہمیشہ
وہاں دیا جاتا ہے، جہاں سے جلد واپسی کی اُمید ہو۔ سوچ سوچ کر نذیر کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ اس
کی بھوک بھی اب زوروں پر تھی۔ وہ جیسے ہی اُٹھ کر گھر جانے لگا، چھپاک سے اس کے دماغ میں
رقم حاصل کرنے کے لیے ایک ترکیب آ گئی۔ چوری......! ہاں، چوری سے رقم حاصل کر کے وہ
اپنی دکان داری شروع کر سکتا ہے۔ وہ پھر اسی جگہ بیٹھ گیا اور چوری سے متعلق مزید سوچنے لگا۔
چوری؟ نہیں نہیں، اس سے قبل میں نے کبھی چوری نہیں کی اور پھر یہ بہت بُرا کام ہے۔ اگر پکڑا گیا
تو مار بھی بہت پڑے گی اور میرے ساتھ میرے گھر والوں کی بھی رسوائی ہوگی۔ دل نے اچھائی کی
راہ دکھائی، مگر دماغ اپنے چوری والے خیال کی حمایت میں دلیل لے کر کود پڑا کہ ہر کام کبھی نہ کبھی

پہلی مرتبہ ہی ہوتا ہے، پھر تمھاری یہ چوری اپنا کام شروع کرنے کے سلسلے کی پہلی اور آخری چوری ہوگی۔ دل نے پھر سیدھی راہ دکھائی کہ جب گھر والے تمھارے پاس چوری کی رقم دیکھیں گے اور اس سے متعلق سوال کریں گے تو تم کیا جواب دو گے۔ دماغ نے پھر زور دیا کہ کہہ دینا، دوستوں سے اُدھار لیا ہے۔ نکمی زندگی سے نکلنے کے لیے دماغ کی دلیل وزنی تھی، لہٰذا جیت دماغ کی ہوئی۔

اب جب چوری کرنا طے ہو گیا تو اگلا سوال یہ تھا کہ چوری کس کے گھر کی جائے۔ عابد کے گھر؟ نہیں، وہ اکیلا کماتا ہے اور چھے کھانے والے ہیں۔ اس کے گھر سے کیا ملے گا تو پھر مولوی صاحب کا گھر کیسا رہے گا؟ ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ گاؤں کے سبھی لوگ انھیں بہت نوازتے رہتے ہیں اور پھر ان کے دو بیٹے بھی شہر سے کما کر بھیجتے ہیں۔ دل نے کہا، شرم کرو، وہ تمھارے استاد بھی ہیں۔ انھوں نے بچپن میں بڑی محنت سے تمھیں قرآن پاک پڑھایا ہے۔ احسان فراموش نہ بنو، مگر دماغ پر شیطان سوار تھا، جو پوری طرح بُرائی کروانے پر آمادہ تھا۔ نذیر نے سوچا کہ یہ درست ہے، وہ نہ صرف شفیق استاد ہیں، بلکہ رحم دل انسان بھی ہیں۔ میں کون سا عادی چور ہوں۔ پکڑا بھی گیا تو گڑگڑا کر معافی مانگ لوں گا اور وہ یقیناً معاف بھی کر دیں گے۔ چلو یہ بھی طے ہوا کہ چوری مولوی صاحب کے گھر کرنی ہے، کیوں کہ میں ان کے گھر کے کونے کونے سے واقف ہوں۔ پڑھائی کے دوران اکثر مولوی صاحب گھر سے کھانا یا کوئی بھی چیز لانے کے لیے مجھے ہی بھیجا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے، شام تک سوچ بچار کے بعد آج رات ہی یہ کام کر لینا چاہیے۔ اب مجھے گھر چلنا چاہیے۔ بھوک بہت زور کی لگی ہے۔

نذیر اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ کھانا کھا کر وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا، تاکہ چوری کرنے کے بارے میں سکون سے پروگرام طے کیا جا سکے۔ ماں نے پوچھا، کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو وہ سر درد کا بہانا بنا کر سوتا بن گیا۔ یہ بھی چوری کے سلسلے کی کڑی تھی کہ چوری کے اگلے دن جب شور

ہوگا تو ماں گواہی دے گی کہ میرا بیٹا تو کل دوپہر سے طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی ہے۔ دن گزرا، رات کو ماں نے کھانے کا پوچھا تو نذیر تھوڑا سا کھا کر پھر لیٹ گیا اور اب سب گھر والوں کے سو جانے کا انتظار کرنے لگا۔ گاؤں کے اکثر لوگ سرِ شام ہی سو جاتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں اماں، ابا کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ نذیر چپکے سے اپنی چارپائی سے اُٹھا۔ چوں کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ چوری کرنے جا رہا تھا، اس لیے اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ پکڑے جانے، مار پڑنے اور بے عزتی کا سوچ کر بہت خوف زدہ ہو رہا تھا۔ وہ ہمت کر کے گھر سے نکلا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی آہستگی سے کھولی اور باہر سے آہستہ سے کنڈی بند کر کے وہ دبے پاؤں مولوی صاحب کے گھر کی جانب روانہ ہوا۔ اندھیری رات تھی اور ہُو کا عالم، نذیر اپنے ہی قدموں کی آہٹ سے ڈر رہا تھا۔ اب وہ مولوی صاحب کے گھر کی چھوٹی سی دیوار پر چڑھ کر اندر کا جائزہ لے رہا تھا۔

مولوی صاحب کے گھر میں کل پانچ افراد تھے، مولوی صاحب، اُن کی بیوی، دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ چوں کہ مولوی صاحب کے دونوں بیٹے روزگار کے سلسلے میں شہر میں رہتے تھے، لہٰذا اس وقت صحن میں تین چارپائیوں پر گھر کے بقیہ تین افراد سو رہے تھے، یعنی اندر کمروں میں کوئی نہ تھا اور میدان صاف تھا۔ نذیر صحن میں کود کر دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھی سی ٹارچ تھی، جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ کمرے میں موجود الماری کی چابی اس کے لاک میں ہی موجود تھی۔ نذیر نے پھرتی سے الماری کی تلاشی لی تو پانچ ہزار کی رقم ملی۔ زیورات وغیرہ کچھ نہ ملے۔ صرف پانچ ہزار سے کیا ہوگا؟ اُف میں بھی کتنا بڑا بے وقوف ہوں۔ مہینے کی آخری دن ہیں۔ اگر میں مہینے کے شروع میں چوری کرتا تو مولوی صاحب کے بیٹوں کی بھیجی ہوئی رقم بھی ہاتھ لگ سکتی تھی، مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب کچھ قیمتی اشیا بھی اُٹھانی پڑیں گی، تاکہ انھیں بیچ کر کچھ اور رقم حاصل ہو سکے۔ اس نے جلدی سے ایک چادر بچھائی۔ الماری سے ملنے والی قیمتی گھڑیاں،

ٹیپ رکارڈر، استری کچھ اور قیمتی سامان جو مولوی صاحب کی بیوی نے اپنی بیٹی کے جہیز کے لیے جمع کر رکھا تھا، سب جمع کر کے چادر کی گٹھڑی بنائی۔ گٹھڑی اُٹھا کر دیکھی تو کافی وزنی تھی۔ نذیر کے دل میں خوف کے ساتھ ساتھ لڈو بھی پھوٹ رہے تھے کہ اچھا خاصا سامان ہاتھ لگ گیا ہے۔ گٹھڑی سر پر رکھ کر وہ دبے پاؤں صحن سے گزر رہا تھا کہ مولوی صاحب نے کروٹ لی۔ نذیر کی تو جان ہی نکل گئی۔ وہ وہیں ساکت ہو گیا، مگر مولوی صاحب گہری نیند میں تھے۔ نذیر آگے بڑھا۔ وہ جلدی سے دیوار پھاند کر مولوی صاحب کے گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ جیسے ہی نذیر نے گٹھڑی دیوار پر رکھی اور خود دیوار پر چڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک مولوی صاحب کی بیٹی اپنی چارپائی پر اُٹھ بیٹھی۔ خوف سے نذیر کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ گھبراہٹ میں جلدی سے دیوار پر چڑھا۔ اسی افراتفری میں گٹھڑی دھب سے گھر کے اندر لڑھک گئی۔ نذیر نے جلدی سے باہر کی جانب چھلانگ لگائی۔ وہ اپنے گھر کی طرف تیزی سے بھاگا اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ گھڑے سے پانی نکال کر پیا۔ گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور وہ اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُسے بہت افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی ہمت اور محنت کر کے بھی وہ خالی ہاتھ ہی رہا۔ اُس نے اپنی بے وقوفی سے الماری سے ملنے والی رقم بھی گٹھڑیوں کے ساتھ ہی گٹھڑی میں ہی رکھ دی تھی۔ اب پتا چل جانے پر رسوائی مفت میں ہوگی۔ کیا معلوم، مولوی صاحب کی بیٹی نے مجھے پہچان لیا ہو۔

ادھر مولوی صاحب گٹھڑی اٹھا کر اندر لائے، لیمپ جلایا۔ دیکھا تو گٹھڑی میں اپنا ہی سامان تھا۔ مولوی صاحب سمجھ گئے کہ چوری کی واردات ہے، مگر اللہ نے انھیں نقصان سے بچا لیا اور چور کو خالی ہاتھ جانا پڑا، مگر سوال یہ ہے کہ چور کون ہو سکتا ہے؟ انھوں نے سوچا، اس سے قبل ہمارے گاؤں میں کبھی چوری کی واردات نہیں ہوئی۔ میں ہر جمعۃ المبارک میں تمام لوگوں کو اچھائی کی تلقین اور چوری اور بے ایمانی کے نقصانات سے آگاہ کرتا ہوں اور چور نے پہلی

واردات ہی میرے گھر میں کرنے کی کوشش کی۔ چوں کہ مولوی صاحب کا کچھ نقصان نہیں ہوا تھا لہٰذا انھوں نے رات کے وقت لوگوں کو مطلع کرنے کے بجائے یہ کام صبح پر چھوڑ دیا۔ ادھر نذیر کے کان باہر گلی کی طرف لگے تھے کہ اب گلی میں شور ہوا، انتظار کرتے کرتے نہ جانے کس وقت اُسے نیند آ گئی۔ صبح جب اُن کے دروازے پر دستک ہوئی۔ نذیر کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ حال آں کہ مولوی صاحب کا کوئی بھی سامان اس کے پاس نہیں تھا۔ کسی نے باہر سے اطلاع دی کہ رات مولوی صاحب کے گھر چور آیا تھا۔ چور کو پکڑنا ہے، لہٰذا گاؤں کے سب مرد جمع ہو جائیں۔ باپ اسے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کے باپ کے ساتھ ہو لیا۔ مولوی صاحب سے واردات کا احوال سن کر پہلے تو سب نے شکر کیا کہ مولوی صاحب کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ سب لوگ اپنے اپنے انداز سے واردات کی تفتیش خود کر رہے تھے، کیوں کہ مولوی صاحب نے یہ کہا تھا کہ یہ اپنے ہی گاؤں کا معاملہ ہے۔ ہم خود ہی چور کا پتا لگا لیں گے اور جس کسی سے نادانی ہوئی ہے، میں اُس کی رسوائی بھی نہیں چاہتا۔ ہمیں پولیس سے مدد نہیں لینی چاہیے، اس لیے انھوں نے پولیس بلوانے سے انکار کر دیا تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی سوجھ بوجھ سے چور کے طریقۂ واردات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ کسی نے نذیر پر شک تک نہیں کیا تھا۔ اس سے نذیر کو کچھ حوصلہ ہوا۔ اب وہ آگے بڑھا اور کہنے لگا: ”میرے خیال میں چور یہاں سے کود کر اندر داخل ہوا ہوگا۔ اندر داخل ہو کر اُس نے ٹارچ جلائی ہوگی۔“

”تمھیں کیسے پتا ٹارچ جلائی ہوگی؟“ عابد صاحب چونکے۔ نذیر اپنی بے وقوفی پر ڈگمگایا نہیں اور سادگی سے بولا: ”میرا مطلب ہے سامان ڈھونڈنے کے لیے اس نے کچھ تو روشنی کی ہوگی۔“

”ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہاں، ہاں نذیر بیٹے! آگے بولو۔“ مولوی صاحب نے شفقت سے اُسے آگے بولنے کو کہا۔ مولوی صاحب بڑی باریک بینی سے اس کے چہرے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ وہ اس کے استاد بھی تھے اور بچپن سے اسے جانتے تھے کہ نذیر کاہل اور کام چور ضرور ہے مگر فطرتاً بھولا اور معصوم ہے۔ مولوی صاحب کے پُرشفقت لہجے سے حوصلہ پا کر نذیر پھر اپنی ذہن میں واردات کا نقشہ کھینچنے لگا: ”پھر اس نے سامان اکٹھا کر کے گٹھڑی بنائی ہوگی، پھر اسے دیوار پر لا کر رکھا ہوگا اور جیسے ہی وہ خود کودنے لگا ہوگا، مولوی صاحب کی بیٹی اُٹھ بیٹھی ہوگی پھر چور نے گھبراہٹ میں گٹھڑی دیوار کے اندر کی جانب گرپڑی اور میں دوسری طرف......!“ نذیر کے منہ سے بے ساختہ اعتراف سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ نذیر بے اختیار رونے لگا۔ نذیر کا باپ کچھ فاصلے پر شرمندہ کھڑا تھا۔ مولوی صاحب نے اشارے سے سب کو وہاں سے روانہ کر دیا۔ نذیر روتے روتے مولوی صاحب کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ مولوی صاحب نے اُسے اپنے قدموں سے اُٹھایا اور چارپائی پر بٹھا کر اسے آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنے کا وعدہ لے کر معاف کر دیا اور اس کے باپ سے کہا کہ تم بھی اسے گھر جا کر کچھ نہیں کہو گے۔ یہ تمھاری، ہم سب کی غلطی ہے، جس کی وجہ سے نذیر سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔

اگلے روز مولوی صاحب نے گاؤں کے تمام لوگوں کو مسجد میں جمع کر کے ایک پُر اثر واعظ دیا کہ ہم سب معاشرے میں موجود اور جنم لینے والی برائیوں کے ذمے دار ہیں۔ نذیر کی مثال ہے۔ اس سے قبل ہر شخص نے نذیر کو اس کے فارغ پھرنے پر ہمیشہ ڈانٹا اور بُرا بھلا ہی کہا ہے۔ کسی نے اس کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ آخر نئی نسل کو راہ پر لگانا کس کی ذمے داری ہے؟ والدین کے ساتھ اس معاشرے کی بھی ذمے داری ہے۔ میں اپنی طرف سے نذیر کی دکان کے لیے دس ہزار روپے دیتا ہوں۔ آپ سب بھی حسبِ توفیق حصہ ڈالیں تو ہم سب نذیر کو بھٹکنے اور فارغ رہنے سے بچا سکتے ہیں، بلکہ اگر ہم پہلے خیال کر لیتے تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔

آج نذیر گاؤں کا بڑا اور خوش حال دکان دار ہے، بلکہ ایک باعزت اور معزز شہری بھی ہے اور وہ چراغ سے چراغ جلائے رکھنے کے لیے مستحق نوجوانوں کی مدد بھی کرتا رہتا ہے۔☆

پانی پت کا میدان

غلام حسین میمن

آپ نے کسی تکرار یا جھگڑے کے موقع پر کبھی سنا ہوگا کہ لو، اب پانی پت کی لڑائی شروع ہوگئی یا یہ کہ یہاں تو ہر وقت پانی پت کی لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ یہ سن کر یقیناً کبھی سوال بھی ذہن میں آیا ہوگا کہ یہ پانی پت ہے کیا؟

پانی پت بھارت کے صوبے ہریانہ کا ایک شہر ہے۔ اس کے میدان میں ہندستان کی تاریخ میں تین فیصلہ کن جنگیں لڑی گئی تھیں۔ پانی پت کا یہ نام کیسے پڑا؟ اس کی وجہ سر احمد خاں بتاتے ہیں کہ پانی پت دہلی کے راجا ڈنڈ پانی نے بسایا اور اس نے یہاں ۷۰ قبلِ مسیح سے ۶۹۱ قبلِ مسیح تک راج کیا۔ (قبلِ مسیح کی یہ تاریخیں آپ کو اُلٹی محسوس ہوں گی۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کے دور کا تعین کیا جاتا ہے)

پانی پت کی شہرت کا زمانہ وہ تھا، جب شاہ شرف بوعلی قلندر یہاں روحانیت کا در دے رہے تھے۔ اُس وقت پانی پت، ہندستان کے عظیم بزرگوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور سا سو کے قریب علما وہاں موجود تھے۔

پانی پت میں پہلی لڑائی ۱۵۲۶ء میں مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر اور سلطان ابرا لودھی کے درمیان ہوئی۔

ظہیر الدین بابر نہایت کم عمری میں والد کی وفات کے بعد فرغانہ کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اسے شروع ہی سے فتوحات کا شوق تھا۔ ۱۵۰۴ء میں اس نے کابل سے غزنی تک علاقہ فتح کرلیا۔ اس دوران ۱۵۲۲ء میں قندھار بھی بابر کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ پنجاب کے باغی گورنر دولت خان لودھی نے بابر کو برصغیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اب اُس نے ہندستان کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور ۱۵۲۶ء میں لاہور اور انبالہ فتح کرنے کے بعد وہ دہلی

کی جانب بڑھا۔ ۲۱-اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ ابراہیم لودھی کے فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ تھی، جب کہ ظہیر الدین بابر کے ساتھ صرف بارہ ہزار کا لشکر تھا، مگر وہ خود ایک تجربے کار سپہ سالار اور جنگی ماہر تھا۔ اس تجربے کے آگے ابراہیم لودھی کی بڑی فوج نہ ٹھیر سکی اور میدان ظہیر الدین بابر کے ہاتھ رہا۔ ابراہیم لودھی شکست کے بعد قتل ہوا۔ اس فیصلہ کن جنگ کے بعد دہلی اور آگرہ پر بابر کا قبضہ ہوگیا اور ہندستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑی اور ظہیر الدین بابر اس کا پہلا حکمراں بنا۔

پانی پت کی دوسری جنگ ۱۵۵۶ء میں مغل حکمراں جلال الدین محمد اکبر اور بہار کے حکمران عادل شاہ کے وزیر ہیمو بقال کے درمیان ہوئی۔ جلال الدین اکبر کی تخت نشینی کے وقت برصغیر شدید اقتصادی اور سیاسی بحران سے گزر رہا تھا۔ اس موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے عادل شاہ کے وزیر اور جرنیل ہیمو بقال نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرنا چاہا۔ اُس نے دہلی کے مغل گورنر تردی بیگ کو شکست دی۔ اُن دنوں جلال الدین اکبر، سکندر سوری کے خلاف جنگ میں مصروف تھا، جو تختِ دہلی کا طلب گار تھا۔ اکبر جنگ کو فوراً روک کر دہلی پہنچا۔ اکبر کو تخت چھوڑنے کا مشورہ دیا گیا، مگر بیرم خان نے آہنی عزم کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے پر اصرار کیا۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد ہیمو بقال، مغل بادشاہ کے مقابلے پر آیا۔ ۵-نومبر ۱۵۵۶ء کو پانی پت کے میدان میں فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ ہیمو بقال کے سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مغل فوج میں ابتری پھیلنے لگی۔ جنگ کے دوران ایک تیر ہیمو بقال کی آنکھ میں لگا، جس سے وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ اُس کا نظروں سے اوجھل ہونا تھا کہ اس کی فوج تتر بتر ہونے لگی اور میدان مغل فوج کے ہاتھ رہا۔ ہیمو بقال کو گرفتار کرکے کھلے دربار میں قتل کردیا گیا۔ اس جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی دہلی اور آگرہ پر جلال الدین محمد اکبر کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔

پانی پت کی تیسری جنگ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کے برصغیر پر مسلسل حملوں کی وجہ سے مرہٹوں کا اقتدار پر قبضہ ابھی تک خواب ہی تھا، اس لیے مرہٹوں کے پیشوا بالاجی باجی راؤ (نانا صاحب) تین لاکھ فوج لے کر دہلی میں داخل ہوا اور لوٹ مار مچادی۔ احمد شاہ ابدالی اُن دنوں انوپ شہر میں تھے۔ جنوری ۱۷۶۱ء کو دونوں فوجیں پانی پت میں جمع ہوئیں اور پانی پت کی تیسری مشہور جنگ ہوئی۔ شام تک مرہٹوں کے قدم اُکھڑنے لگے اور آخر مسلمان فاتح رہے۔ اس شکست کے بعد مرہٹے ایک عرصے تک سنبھل نہ سکے۔ احمد شاہ ابدالی نے واپسی سے قبل عالمگیر ثانی کے لڑکے گوہر کو شاہ عالم ثانی کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔

۱۱۔ ستمبر ۱۸۰۳ء کو پانی پت انگریزوں کے قبضے میں آیا۔ ۱۸۲۴ء میں پانی پت کو ضلع کا درجہ دیا گیا۔ کرنال اور سونی پت اس کی تحصیلیں قرار پائیں۔ بعد میں حکومت نے کرنال کو ضلع بنا کر پانی پت کو اس کی تحصیل بنا دیا۔ پانی پت میں مولانا الطاف حسین حالی پیدا ہوئے اور کرنال میں وزیرِ اعظم پاکستان لیاقت علی خاں نے آنکھ کھولی تھی۔ ☆

بلاعنوان انعامی کہانی

ثمینہ پروین

ملک سے جرائم کا خاتمہ کرنے کے لیے حکومت نے ایک خصوصی ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کی طرف سے ''ضرورت ہے'' کا اشتہار شائع ہوا۔ حسام نے بھی درخواست جمع کرائی تھی۔ پہلے زبانی انٹرویو ہوا، جس میں کئی سو امیدوار پہنچے تھے۔ دوسرے انٹرویو کے لیے ان میں سے صرف اٹھارہ امیدواروں کو بلایا گیا تھا۔ ان میں سے بھی صرف چار امیدواروں کا انتخاب کیا گیا تھا، جن میں ایک حسام بھی تھا۔ کچھ دن بعد اسے ادارے کی طرف سے ایک خط ملا، جس میں بتایا گیا تھا کہ مقررہ تاریخ پر شام پانچ بجے ادارے کی گاڑی اسے لینے آئے گی، جو اسے شہر سے باہر لے جائے گی، جہاں اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیت کی جانچ کی جائے گی۔

مقررہ تاریخ پر ایک کار اسے لینے پہنچی، جس میں صرف ڈرائیور ہی تھا۔ کار اسے لے کر نیشنل ہائی وے پر تیزی سے جا رہی تھی۔ آبادی ختم ہونے کے بعد اونچے نیچے پہاڑ اور دور دور تک میدان نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں چند جھونپڑیوں پر مشتمل گاؤں تھے، جہاں چرواہے اپنے ریوڑوں کے ساتھ جا رہے تھے۔ اس کے بعد گھنے جنگلات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جگہ پہنچ کر ڈرائیور نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہاں سے ایک کچا راستہ جاتا ہے۔ اس راستے سے ہم جلدی پہنچ سکتے ہیں۔''

ڈرائیور نے ایک ویران کچی سڑک پر گاڑی موڑ دی۔ کافی دور جانے کے بعد اچانک کار جھٹکے لینے لگی۔ ڈرائیور کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کار میں پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔ کار ایک جگہ جا کر رک گئی، اب آگے نہیں جا سکتی تھی۔ ڈرائیور پریشان بھی تھا اور شرمندہ بھی لگ رہا تھا۔ وہ بولا: ''معاف کیجیے، میری غلطی کی وجہ سے آپ کو زحمت ہو رہی ہے۔''

حسام نرم لہجے میں بولا: ''کوئی بات نہیں، لیکن اب کرنا کیا چاہیے۔ سورج غروب ہونے والا ہے۔''

ڈرائیور نے کہا: ''اس سڑک سے کبھی کبھار ہی کوئی گاڑی گزرتی ہے اور یہاں پر موبائل فون کے سگنل بھی نہیں آتے۔''

حسام نے کہا: ''اگر ہم مدد کے لیے بڑی سڑک تک پیدل جائیں تو وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو جائے گا۔ سردی بھی بڑھتی جا رہی ہے، کیا کیا جائے؟''

کچھ دیر سوچنے کے بعد ڈرائیور کو اچانک کچھ یاد آگیا۔ اس نے کہا: ''یہاں سے کچھ دور محکمۂ جنگلات کے ایک افسر میرے صاحب کے جاننے والے ہیں، مجھے بھی جانتے ہیں۔ ان سے کچھ مدد مل سکتی ہے۔''

کچھ دور پیدل چلنے کے بعد جنگل کے بیچ میں اونچے اونچے درختوں کے درمیان لکڑی کا بنا ہوا ایک کیبن نما مکان نظر آیا۔ قریب ہی ایک جیپ کھڑی تھی۔ دستک دینے پر ایک بھدی شکل وصورت والا کالے رنگ کا آدمی باہر آیا۔ اس کی مونچھوں کے سرے کان کی لو کو چھو رہے تھے۔ اس کا نام جبار خاں تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور نے اپنا تعارف کرانے کے بعد صورت حال سے آگاہ کیا۔ تفصیل سن کر وہ بولا: ''میرے پاس تھوڑا سا پیٹرول موجود ہے، اتنا نہیں ہے کہ جہاں تم جا رہے ہو، وہاں تک پہنچ سکو، البتہ شہر تک واپس جا کر پیٹرول بھروا سکتے ہو۔'' پھر اس نے حسام کی طرف اشارہ کیا: ''میرا خیال ہے، تم انھیں یہیں چھوڑ جاؤ، صبح یہیں سے ان کو لیتے ہوئے چلے جانا اور میرا پیٹرول کا ڈبا بھی بھرتے لانا۔''

ڈرائیور نے بے بسی سے حسام کی طرف دیکھا: ''مجبوری ہے جناب! آپ کو آج یہیں رکنا ہوگا۔ امید ہے یہاں کی صبح آپ کو بہت خوش گوار لگے گی، خدا حافظ۔''

جبار خاں، حسام کو لے کر اندر آ گیا۔ وہاں دو آدمی پہلے ہی موجود تھے۔ ان میں ایک کا نام جلال دین تھا جسے جبار نے خاص طور پر یہاں بلایا ہے۔ وہ اپنی جیپ میں آیا تھا، جو باہر کھڑی تھی۔ دوسرا آدمی مشیر احمد تھا جو یہاں جڑی بوٹیوں پر تحقیق کے لیے آیا تھا۔

میز کے قریب ایک اسٹول پر مٹی کے تیل کا ایک لیمپ جل رہا تھا۔ میز پر تاش کے پتے

بکھرے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کا تعارف کرانے کے بعد جبار نے حسام سے پوچھا: ''آپ کو تاش کھیلنے آتے ہیں؟''

''زیادہ مہارت تو نہیں ہے، بس کھیل لیتا ہوں۔'' حسام نے کہا۔

''ہم بھی وقت گزاری کے لیے کھیل رہے ہیں۔'' مشیر احمد نے کہا۔

چاروں تاش کھیلنے لگے۔ اگرچہ جبار خاں مسلسل جیت رہا تھا پھر بھی اس نے کھیل ختم کرنے کا اعلان کر دیا: ''بس اب کھیل ختم۔''

''کیوں؟'' جلال نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے ایک کہانی یاد آ گئی ہے۔'' جبار نے سب کی طرف باری باری دیکھا اور کہا: ''ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے۔ میں ایک ایسے شخص کی کہانی سناتا ہوں، جو اپنے دشمن سے انتقام لینا چاہتا تھا۔''

مشیر احمد نے پوچھا: ''کہانی کا مرکزی کردار کون ہے؟''

''شاید میں یا شاید وہ جسے اب تک مر جانا چاہیے تھا۔'' جبار نے کہا اور تاش کے پتے سمیٹ کر پیکٹ میں رکھے اور دیوار کے قریب رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی کے ساتھ ہی دیوار پر اس کی بندوق لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک سگرٹ نکال کر سلگائی اور پاؤں پھیلا کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی: ''یہ تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں کالج میں پڑھتا تھا۔ ایک دن گھر والے کسی شادی کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میرے امتحان ہو رہے تھے اور بڑے بھائی اپنے کاروبار کی وجہ سے گھر میں تھے۔''

''کہانی دل چسپ معلوم ہوتی ہے۔'' مشیر احمد نے کہا۔

''یہ بالکل سچی کہانی ہے۔'' جبار خاں بولا: ''اس دن میں امتحان دے کر گھر آ رہا تھا۔ جب میں گلی کے کونے پر پہنچا تو ایک شخص کو گھر سے نکلتے دیکھا۔ وہ بہت جلدی میں لگ رہا تھا۔ میں سمجھا شاید بھائی کا دوست ہوگا۔ گھر پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو میرے

پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میرے بھائی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ میں تیزی سے باہر نکلا، مگر وہ شخص فرار ہو چکا تھا، بہر حال اس کا چہرہ میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ یہ ڈکیتی کا واقعہ بھی نہیں تھا، کیوں کہ گھر کی کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ میں اس کی تلاش میں لگ گیا۔

آخر ایک دن میں نے اس کا ٹھکانا ڈھونڈ ہی لیا۔ میں تو اسے پہچانتا تھا، لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ میں کون ہوں۔ وہ اپنے علاقے کا منشیات فروش تھا۔ میں نے بڑی چالاکی سے اس سے دوستی کر لی۔ میں اپنے ہاتھ سے اسے مارنا چاہتا تھا، لیکن خود کو بھی بچانا تھا۔ میں موقعے کی تلاش میں تھا کہ ایک دن پولیس اسے کسی بڑے جرم میں پکڑ کر لے گئی۔ اسے چودہ سال کی قید ہو گئی، پھر مزید کئی سال تک وہ مجھے نظر نہیں آیا۔''

جلال نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ حسام نے کہانی میں دل چسپی نہیں لی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج میں برا پھنسا ہوں، وہ ہاتھ باندھے خاموش بیٹھا رہا۔ جبار نے غیر ارادی طور پر بندوق دیوار سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور اپنی بات جاری رکھی: ''اس دوران میں نے تعلیم مکمل کی اور سرکاری ملازم ہو گیا۔ ایک روز وہ مجھے نظر آ گیا۔ اسے شکار کا بھی شوق تھا۔ میں نے اسے شکار کی دعوت دے کر آج یہیں بلا لیا ہے۔''

''یہاں بلا لیا؟ ...... آج؟'' حسام چونکا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ہاں، اور اس وقت وہ اسی کمرے میں موجود ہے۔'' جبار نے بندوق سیدھی کر لی۔

اسی وقت جلال پھرتی سے کھڑا ہو گیا اور جیب سے پستول نکالنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک جبار نے اس پر ایک کے بعد ایک، تین فائر کر دیے۔ جلال اپنا سینہ پکڑے ایک طرف لڑھک گیا۔

جبار اس وقت بہت غصے میں تھا۔ اس بدلی ہوئی صورتِ حال کو دیکھ کر حسام چوکنا ہو گیا تھا۔ مشیر نے کہا: ''یہ کیا کیا آپ نے اسے جان سے مار دیا۔ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے نتیجے میں خود پھانسی پر لٹک جائیں گے۔''

''میں پچیس سال تک انتقام کی آگ میں جلتا رہا ہوں۔ قانون کے حوالے کرتا تو ثبوت

گواہ پیش کرنا پڑتا، میرے پاس نہ ثبوت تھا اور نہ کوئی گواہ۔ وہ صاف بچ نکلتا...... اور یہ جو تم نے پھانسی کا ذکر کیا ہے، اس کے لیے بھی گواہی کی ضرورت ہے۔ اس واردات کا کوئی عینی گواہ بھی زندہ نہیں رہے گا۔'' یہ کہہ کر جبار نے مشیر کو بھی گولی مار دی۔ وہ منھ کے بل فرش پر گر پڑا۔

اس سے پہلے کہ جبار، حسام کی طرف مڑتا، وہ دروازے کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کیا اور جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچ کر اسے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے مڑ کر کیبن کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور لیمپ کی زرد روشنی باہر آ رہی تھی۔ شاید جبار اس کے تعاقب میں نہیں آیا تھا۔ اس قدر سخت سردی میں بھی حسام کو پسینا آ گیا۔ خوف اور دہشت سے اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ حلق خشک ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ بھاگ کر اپنی جان نہ بچاتا تو وہ بھی مارا جاتا، کیوں کہ وہ دو آدمیوں کے قتل کا گواہ تھا۔ اس نے سوچا وہ ضرور مجھے مارنے کی کوشش کرے گا، اس کا آزاد رہنا جبار کے لیے خطرناک تھا، اس لیے اسے تعجب ہو رہا تھا کہ جبار اس کے پیچھے کیوں نہیں آیا۔

اچانک کیبن کے دروازے پر ایک انسانی سایہ نمودار ہوا۔ حسام کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ سایہ چند قدم آگے بڑھا۔ بندوق اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ چیخنے کے انداز میں بول رہا تھا: ''تم مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے، یہاں سے میلوں دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ اس یخ بستہ رات میں تم زیادہ دور تک نہیں جا سکو گے۔ مجھے یہاں کے سب راستے معلوم ہیں۔ میں تمھیں بڑی آسانی سے پکڑ لوں گا۔ اگر تم صبح ڈرائیور کے آنے کا سوچ رہے ہو تو یہ خیال دل سے نکال دو، اس کا علاج بھی میرے پاس ہے۔ اسے بھی تو کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔''

جبار کی یہ باتیں سن کر حسام کو خون رگوں میں جمتا محسوس ہوا۔ کوئی شخص اتنا سفاک ہو سکتا ہے! ڈرائیور کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ وہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

جبار اپنے کیبن کے اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ سردی سے حسام کے دانت بجنے لگے۔ ٹھنڈی ہوائیں جسم میں گھسی جا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جبار کا مقابلہ کرنا بہت مشکل

ہے۔ اس کے پاس بھری ہوئی بندوق ہے۔ ایک نہتا آدمی کچھ نہیں کرسکتا۔ اس نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر جائزہ لیا۔ رومال اور کچھ نوٹوں کے علاوہ کی چین جس میں پھل وغیرہ کاٹنے کے لیے ایک چھوٹا سا چاقو لگا ہوا تھا اور کچھ لوگوں کے تعارفی کارڈ تھے۔ ایک اور جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ مل گئی تھی جس کے ساتھ لائٹر بھی تھا۔

حسام نے سوچا کہ رات کیسے گزاری جائے۔ کچھ دور ایک ٹیلا سا نظر آرہا تھا۔ اس نے کچھ لکڑیاں اور خشک پتے جمع کیے اور انھیں جلا کر وہیں بیٹھ گیا۔ وہ جگہ کیبن سے زیادہ دور نہیں تھی، لیکن ٹیلے کی وجہ سے روشنی کیبن سے نظر نہیں آسکتی تھی۔ حسام کے بچاؤ کی ایک صورت یہ تھی کہ صبح جب ڈرائیور آئے تو وہ اسے خطرے سے آگاہ کردے۔ رات بھر عجیب وغریب خیالات اس کے ذہن میں آتے رہے۔ جبار کی جنونی کیفیت سے خوف آتا رہا۔ وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچتا رہا۔ کبھی خیال آتا کہ کسی طرح بندوق اس سے چھین لی جائے یا اسے زخمی کردیا جائے۔ دوسرا خیال اسے زیادہ پسند آیا۔

آخر مشرقی سمت سے صبح کے آثار نظر آنے لگے۔ رات بھر بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سستی دور کرنے کے لیے ہلکی سی ورزش کی۔

دن کی روشنی میں جبار سے کیسے بچا جائے، یہ سوچتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور اسے ایک گھاٹی نما جگہ نظر آئی۔ یہاں ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ کر وہ جبار کو آتے جاتے آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ اسے تلاش کرنے کے لیے کیبن سے نکلنے والا ہی ہوگا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ ادھر اُدھر دیکھ کر اس نے ایک موٹی سے لچک دار ٹہنی ڈھونڈی اور کی چین سے چاقو نکال کر اسے صاف کیا۔ پھر اپنے جوتے کے تسمے نکال کر ٹہنی کو ایک کمان کی شکل دے دی۔ لکڑی کا ایک مناسب سائز کا تیر بنا کر اس کے سرے پر وہی چھوٹا سا چاقو کی چین سے نکال کر لگا دیا اور دوسرے سرے پر لوگوں کے تعارفی کارڈ باندھ دیے تاکہ تیر کا توازن برقرار رہے۔ ایک عجیب قسم کا تیر کمان تیار ہوگیا تھا۔ حسام نے مشق کرنے کے لیے سامنے والے درخت کا انتخاب کیا۔ شروع میں کئی بار نشانہ خطا ہوا، پھر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگنے لگا۔ بندوق کے مقابلے میں

اسے اب بھی اس تیر کمان پر پورا بھروسا نہیں تھا۔

اب اسے جبار کا انتظار تھا، کیوں کہ اسے آنا ضرور تھا۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ دور سے کوئی اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ حسام نے جلدی سے تیر کمان اٹھائی اور گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ چوں کہ نیچے تھا، اس لیے پہلے اسے جبار کا سر نظر آیا، جو آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ حسام ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں بندوق کے آگے ہمت نہ ہار دے۔ جبار قریب آچکا تھا۔ اس نے کالی جیکٹ اور سر پر گرم ٹوپی پہن رکھی تھی۔ جبار چاروں طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ حسام نے اس کا نشانہ باندھ لیا۔ اسی وقت اسے ایک اور آدمی بھی نظر آیا۔ دوسرے آدمی کو دیکھ کر اس کا ہاتھ بہک گیا۔ تیر، کمان سے نکل چکا تھا، اس لیے تیر جبار کے بجائے اس آدمی کے شانے میں گڑ گیا۔ جبار حیرت سے آس پاس دیکھنے لگا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے شانے سے تیر نکالنے لگا۔ جب اس آدمی کا چہرہ واضح طور پر حسام کے سامنے آیا تو وہ سکتے میں آگیا۔ وہ آدمی جلال دین تھا، جسے جبار نے رات کو گولی مار کر ہلاک کردیا تھا۔

جبار نے زور سے کہا: ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ فوراً سامنے آؤ۔''

حسام اپنی جگہ چھپا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ کیا چکر ہے؟ یہ حقیقت ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جبار نے جلال کے شانے سے تیر نکال لیا تو جلال اپنے دوسرے ہاتھ سے زخم کو دبا کر بیٹھ گیا۔ جلال نے جبار سے آہستہ لہجے میں کچھ کہا۔ جبار نے بھی مدھم آواز میں جواب دیا جسے حسام نہیں سن سکا۔ اس کے بعد جبار بندوق اٹھائے انداز سے اس طرف آیا جہاں حسام چھپا ہوا تھا۔ جبار کے چہرے پر بالکل سنجیدگی تھی۔ حسام کے اوسان خطا ہوگئے۔ اسے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔

آخر جبار اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں سے وہ حسام کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ قریب آیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا: ''چلو جلدی اوپر آؤ، تمھیں جلد ہی پتا چل جائے گا کہ تم سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ جلدی آجاؤ، جلال کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ اسے سہارا دے کر کیبن تک لے چلو، تاکہ اس کی مرہم پٹی ہوسکے۔ تم نے میرے دوست کو زخمی کرکے بہت برا کیا۔''

جبار کی باتیں حسام کے لیے ایک معما ثابت ہو رہی تھیں۔ اسے باہر آنا ہی پڑا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا، کیوں کہ جبار کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ جبار نے ایک ہاتھ سے جلال کو دے کر اٹھانے کی کوشش کی، پھر اس نے حسام کی طرف دیکھا اور خشک لہجے میں بولا: ''تم کیا کھڑے رہو گے۔ دوسری طرف سے سہارا دو، خون زیادہ نکلنے کی وجہ سے کم زوری بڑھ گئی ہے۔''

حسام کو اس نئی صورتِ حال پر غور کیے بغیر وہی کچھ کرنا پڑا، جو جبار چاہتا تھا۔ وہ دونوں جلال کو سہارا دے کر کیبن کی طرف لے جا رہے تھے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ ایک اور شخص دکھائی دیا۔ جب وہ قریب آیا تو حسام ایک بار پھر چکرا کر رہ گیا۔ وہ مشیر احمد تھا۔ یہ بھی مر چکا تھا۔

وہ ان کی طرف دیکھ کر دور ہی سے چیخا: ''جلال کو کیا ہوا؟''

جبار نے منھ بنا کر حسام کی طرف اشارہ کیا: ''یہ ان ہی سے پوچھو۔''

حسام کی الجھن آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ وہ بے وقوفوں کی طرح ان سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ سب کیبن کے اندر پہنچ گئے۔ جبار نے فرسٹ ایڈ بکس نکالا اور جلال کا زخم صاف کر کے پٹی باندھ دی۔

ان سب کاموں سے فارغ ہو کر جبار نے حسام کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''یہ سب ایک ڈراما تھا۔'' پہلی مرتبہ جبار کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی: ''اور اس ڈرامے میں تمھارے علاوہ سب نے بہت اچھی اداکاری کی ہے۔ تم حیران ہو رہے ہو گے کہ جب تم بھاگے تو میں تمھارے پیچھے کیوں نہیں گیا تھا۔ دراصل اس وقت ہم تینوں قہقہے لگا رہے تھے۔''

جلال نے لیٹے لیٹے کہا: ''جسے تم خون سمجھے تھے، وہ سرخ رنگ کا محلول تھا، جو میں نے کپڑوں کے نیچے پلاسٹک کی تھیلی میں باندھ رکھا تھا۔''

مشیر احمد نے مزید وضاحت کی: ''جبار صاحب کے ہاتھ میں معمولی چھروں والی نقلی بندوق تھی، جیسی فلموں وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے۔ ڈرائیور بھی اسی ڈرامے کا ایک کردار تھا۔ اس کا آنا ہی ہو گا۔''

''ڈراما؟ لیکن کیوں؟'' حسام کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔

جبار صاحب نے سنجیدگی سے کہا: ''تم نے ہمارے ادارے میں ملازمت کے لیے درخواست دی تھی، اسی سلسلے میں یہ دراصل تمھارا امتحان تھا۔ ہم تمھیں پرکھنا چاہتے تھے کہ تم کتنے بہادر ہو۔ تمھاری قوتِ فیصلہ، حاضر دماغی اور ہمت کو جانچنا چاہتے تھے۔''

مشیر احمد نے کہا: ''تم سے پہلے بھی کچھ لوگ یہاں آ چکے ہیں۔ وہ سب خوف زدہ ہو کر کانپنے لگے، التجائیں کرنے لگے، ایک آدمی تو زور زور سے رونے بھی لگا تھا۔''

جبار صاحب نے گویا فیصلہ سنا دیا: ''تمھاری ہمت اور مقابلے کی صلاحیت سے ہم سب اور ان بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ہم محکمے کو رپورٹ بھیج دیں گے۔ امید ہے تمھارا انتخاب ہو جائے گا۔''

جلال صاحب بولے: ''اور سب سے زیادہ نمبر تو میری طرف سے ہوں گے۔ ہمارے ادارے کو تم جیسے ہی نڈر لوگوں کی ضرورت ہے۔''

اسی وقت ڈرائیور بھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ بات اس نے بھی سن لی تھی۔ یہاں کا خوش گوار ماحول دیکھ کر وہ بھی سب سمجھ گیا اور حسام کی طرف دیکھ کر بولا: ''کام یابی مبارک ہو سر!''

☆ ☆ ☆

اس بلا عنوان انعامی کہانی کا اچھا سا عنوان سوچیے اور صفحہ ۱۲۳ پر دیے ہوئے کوپن پر کہانی کا عنوان، اپنا نام اور پتا صاف صاف لکھ کر ہمیں ۱۸- جون ۲۰۱۱ء تک بھیج دیجیے۔ کوپن کو ایک کاپی سائز کاغذ پر چپکا دیں۔ اس کاغذ پر کچھ اور نہ لکھیں۔ اچھے عنوانات لکھنے والے تین نونہالوں کو انعام کے طور پر کتابیں دی جائیں گی۔ نونہال اپنا نام پتا کوپن کے علاوہ بھی علاحدہ کاغذ پر صاف صاف لکھ کر بھیجیں تا کہ ان کو انعامی کتابیں جلد روانہ کی جا سکیں۔

نوٹ: ادارۂ ہمدرد کے ملازمین اور کارکنان انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔

مسکراتی لکیریں

"تمھاری بلی مجھے دیکھ کر کیوں بے چین ہو رہی ہے؟"

"اوہ! غلطی ہوگئی، بلی کی پلیٹ میں تمھیں کھانا دے دیا۔ یہ بلی اپنی پلیٹ پہچانتی ہے۔" ☆

گلہری شہزادی

ادیب سمیع چمن
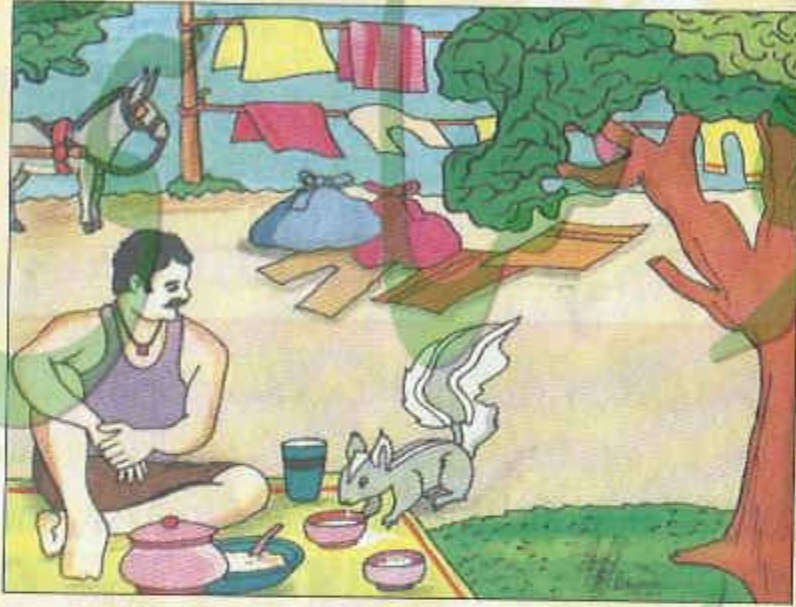
کسی گاؤں میں ایک نہایت شریف اور غریب دھوبی رہتا تھا، مگر بدقسمتی سے دھوبی کی بیوی بہت بد مزاج اور لڑاکا عورت تھی۔ وہ کسی نہ کسی بات پر ہر ایک سے لڑتی رہتی۔ اس کی اس خراب عادت کی وجہ سے سارے گاؤں میں کوئی بھی اس کو اچھا نہیں کہتا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اس سے ملنا اور بات کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ دھوبی کی اولاد نہیں تھی۔ بے چارہ صبح سویرے گھر سے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر نکل جاتا اور رات گئے گھر واپس آتا تھا، تاکہ دھوبن کو اس سے لڑنے کا موقع ہی نہ ملے۔

ایک دن دوپہر کے وقت حسبِ معمول وہ کھانا کھاتے وقت اپنی قسمت پر افسوس کر رہا تھا کہ اچانک ایک خوب صورت سی گلہری اس کی گود میں آ کر بیٹھ گئی۔ دھوبی نے

حیرانی سے گلہری کو دیکھا۔ دھوبی نے ایک روٹی کا ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا تو گلہری انسانوں کی طرح بولتے ہوئے کہنے لگی: "بھائی دھوبی! میں ایسی باسی روکھی روٹی نہیں کھاتی۔ میں تو دودھ ملیدہ کھاتی ہوں اور پان سپاری چباتی ہوں۔"

دھوبی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے گلہری کا یوں انسانوں کی طرح باتیں کرنے پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا کہ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ دھوبی کو یوں گہری سوچ میں گم دیکھ کر بی گلہری نے اداس لہجے میں کہا: "دراصل میں ایک شہزادی ہوں۔ جنوں کے بادشاہ نے میرے والد سے دشمنی کی وجہ سے مجھے گلہری بنا دیا ہے۔"

"اچھا تو تمھارے والدین نے تمھیں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی؟" دھوبی نے ہمدردی سے پوچھا۔

"بابا تو خود اس آدم خور جن کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اب پتا نہیں میں اپنی اصلی حالت میں آؤں گی۔ خیر تم چھوڑو اس بات کو، دراصل میں اکثر پیپل کے درخت پر بیٹھی تمھاری باتیں سنتی تھی، جو تم خود اپنے آپ سے کرتے ہو۔ تمھاری بیوی دھوبن نے تمھارا سکون ختم کر رکھا ہے نا؟ آج سے میں تمھاری اچھی دوست ہوں۔ اب میں تمھارے پاس روز آیا کروں گی۔ تم سے اچھی اچھی، میٹھی میٹھی باتیں کیا کروں گی۔ اس طرح تمھارا غم بھی دور ہوتا رہے گا۔ بس تم میرے لیے دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ کسی طرح دوبارہ مجھے شہزادی بنا دے۔"

دھوبی بڑا خوش ہوا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے دودھ ملیدہ اور پان سپاری روز لایا کرے گا۔ وہ واقعی گلہری کو پا کر اپنی تنہائی اور اپنا غم بھول گیا تھا۔ گلہری کچھ دیر دھوبی کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی اور پھر کل آنے کا وعدہ کر کے درخت پر چڑھ گئی۔

دوسرے روز دھوبی نے روٹی میں دودھ ڈال کر اسے اچھی طرح تیار کیا اور کپڑوں کی گٹھری اٹھا کر خوشی خوشی چل دیا۔ راستے میں اُس نے پان سپاری خریدی۔ ندی پر آ کر کپڑے دھونے لگا۔ دوپہر کو اس نے زمین پر ایک چادر بچھائی، اپنے کھانے کے ساتھ دودھ ملیدہ بھی چادر پر رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ اب وہ گلہری کو کس طرح بلائے۔ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ تھالی بجاتے ہوئے گانا گانے لگا۔

"آؤ، بی گلہری! تم بیٹھو گود ہماری
تم کھاؤ دودھ ملیدہ اور چباؤ پان سپاری
آ جاؤ پیاری، پیاری"

گانا سن کر گلہری درخت کی شاخ سے چھلانگ مار کر فوراً نیچے اُتری اور دھوبی کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ دھوبی نے اس کے آگے دودھ ملیدہ رکھا۔ گلہری خوش خوش کھانے لگی۔ کھانے کے بعد پان سپاری چباتے ہوئے دھوبی سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ دھوبی

بڑا خوش ہو رہا تھا۔ گلہری سے باتیں کرتے وقت وہ فکر مند بھی تھا کہ کہیں کوئی اسے گلہری سے باتیں کرتے ہوئے نہ دیکھ لے اور گلہری کو نہ پکڑ لے۔ کافی دیر گزر گئی تو گلہری نے دھوبی سے جانے کی اجازت چاہی اور کل آنے کا وعدہ کر کے درخت پر چڑھ گئی۔

اب دھوبی کا یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ وہ روزانہ ملیدہ اور پان سپاری لے جاتا تھا اور گلہری مقررہ وقت پر دھوبی کے پاس آتی، دودھ ملیدہ کھاتی، پان سپاری چباتی اور خوش ہو کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتی اور معمول کے مطابق کل آنے کا وعدہ کر کے واپس چلی جاتی۔ اب دھوبی کا وقت بڑا اچھا گزرنے لگا۔

ادھر بی دھوبن کو فکر ہوئی کہ آخر کیا معاملہ ہے کہ پہلے تو میاں رات کی باسی روٹی بھی خوشی خوشی لے کر چلا جاتا تھا اور اب یہ دودھ ملیدہ اصلی گھی ڈال کر بلا ناغہ لے کر جاتا ہے۔ نہ خود کھاتا ہے، نہ مجھے کھانے دیتا ہے۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ مجھے ضرور معلوم کرنا چاہیے۔ دوسرے دن وہ اپنے پروگرام کے مطابق دھوبی کے پیچھے پیچھے چھپ کر چلتی رہی۔ بازار سے دھوبی کو پان سپاری خریدتے ہوئے دیکھ کر بی دھوبن کا شک اور زیادہ پختہ ہو گیا تھا۔ وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپی بیٹھی تھی کہ دیکھیں دھوبی یہ دودھ ملیدہ خود کھاتا ہے یا کسی اور کو دیتا ہے۔ جیسے ہی کھانے کا وقت ہوا، دھوبی نے حسبِ عادت چادر بچھائی۔ کھانا اور دودھ ملیدہ نکال کر رکھا۔ تھالی اُٹھائی، چادر پر بیٹھ کر میٹھی آواز میں گانا شروع کر دیا:

''آؤ، بی گلہری! تم بیٹھو گود ہماری
تم کھاؤ دودھ ملیدہ اور چابو پان سپاری
آ جاؤ پیاری، پیاری''

دھوبن حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ فوراً ہی گلہری درخت سے اُتری اور دھوبی کے پاس بیٹھ گئی۔ دھوبی نے اُسے دودھ ملیدہ کھلانا شروع کر دیا۔ دھوبی

خوش خوش دھوبن سے بے خبر گلہری سے گفتگو کر رہا تھا۔ دھوبن غصے سے جل بھن رہی تھی اور سر ہلاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اچھا تو یہ معاملہ ہے۔ وہ وہاں سے اُلٹے پاؤں لوٹ آئی۔ شام ہوئی تو دھوبی گھر میں داخل ہوا تو گھر میں اندھیرا پا کر پریشان ہو گیا۔ اُس نے دھوبن سے پوچھنا گوارا نہیں کیا اور خود ہی چراغ جلا لیا۔ روشنی ہوئی تو بی دھوبن کو چارپائی پر پڑے پایا، جو سر پر پٹی باندھے بیمار بن کر لیٹی ہوئی تھی۔ دھوبی نے پوچھا: ''کیوں خیر تو ہے؟ کیا طبیعت خراب ہے؟''

دھوبن کہنے لگی: ''میری طبیعت کو چھوڑو، تمھارا بھائی گاؤں سے آیا تھا۔ تمھاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ تمھیں بلانے آیا تھا۔''

دھوبی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بے چارہ اسی وقت گھر سے نکل پڑا اور رات کی گاڑی سے روانہ ہوا۔ دوسرے روز دھوبن نے ایک لوہے کی تھالی میں گرم گرم چولھے کی راکھ بھری اور کھانے کے وقت دھوبی کے کپڑے دھونے کی جگہ پہنچ گئی چادر بچھائی اور گانا گانے لگی:

''آؤ، بی گلہری! تم بیٹھو گود ہماری
تم کھاؤ دودھ ملیدہ اور چابو پان سپاری
آ جاؤ پیاری، پیاری''

گلہری بے خبری میں درخت سے چھلانگ لگا کر اُتری اور گرم گرم راکھ میں جا کر گری۔ گلہری جھلس گئی، مگر پھر اسی حالت میں وہاں سے بھاگ نکلی۔ دھوبن سکون سے گھر پہنچ گئی۔

شام کو دھوبی گھر آیا تو اُس نے دھوبن کو ڈانٹا کہ تو نے کیوں جھوٹ بولا؟ مجھے خواہ مخواہ پریشان کیا۔ وہ حسبِ عادت دھوبی سے لڑنے لگی۔ دوسرے دن دھوبی دودھ ملیدہ

ن سپاری لے کر گھاٹ پر چلا گیا۔ کھانے کا وقت ہوا۔ دھوبی نے چادر بچھائی، دودھ
اور اپنا کھانا چادر پر رکھا۔ تھالی اُٹھائی اور گانا شروع کیا:

"آؤ، بی گلہری! تم بیٹھو گود ہماری
تم کھاؤ دودھ ملیدہ اور چابو پان سپاری
آ جاؤ پیاری، پیاری"

مگر گلہری نہ آئی۔ دھوبی کو بڑی حیرت ہوئی۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اچانک
ری کی درد بھری آواز سنائی دی۔ وہ بے چینی کے ساتھ اُٹھا اور آواز کی طرف لپکا۔ ایک
ت کے تنے سے درد بھری آواز آ رہی تھی۔ دھوبی نے کان لگا کر سنا۔ یہ آواز گلہری
ھی، جو کہہ رہی تھی:

اب نہ آؤں گی میں گود تمھاری
جلا گئیں، مار گئیں بی دھوبن تمھاری
جل گئی تمھاری پیاری......

دھوبی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بی دھوبن نے ایک معصوم جانور کو بھی
اشت نہیں کیا تھا۔ اُس کا غم کے مارے بُرا حال تھا۔ دھوبی نے گلہری کو بہت تلاش کیا،
ر وہ کہیں نہ ملی۔ اُس نے جنگل سے ایک سخت موٹا لکڑی کا ڈنڈا ساتھ لیا اور تیزی سے گھر
ی طرف روانہ ہو گیا۔ دھوبن بڑے مزے سے چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ دھوبی نے
و دیکھا نہ تاؤ، دھوبن پر ڈنڈے برسانا شروع کر دیے۔ دھوبن بُری طرح چیخنے چلّانے
ی۔ دھوبی نے مار مار کر اس کی کھال اُدھیڑ دی۔

اب دھوبن کی عقل ٹھکانے آ چکی تھی۔ دھوبن نے اسی وقت اپنی بُری عادتوں سے
ہری اور محلے والوں سے اپنے بُرے سلوک کی معافی مانگی۔ اس کے بعد وہ سب کے

ساتھ گھل مل کر رہنے لگی۔ دھوبی حیران تھا کہ بیوی کی کایا ہی پلٹ گئی۔ یہ علاج اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔

ایک دن دھوبی دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ ایک پیاری سی لڑکی اس کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ پیروں پر جلنے کے نشان تھے۔ دھوبی نے پوچھا: ''کیا بھوک لگی ہے؟''

لڑکی بولی: ''ہاں لگی تو ہے، مگر میں تو دودھ ملیدہ کھاتی ہوں اور پان سپاری چباتی ہوں۔''

دھوبی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

لڑکی پھر بولی: ''تمھاری بیوی مجھے جلا کر مارنا چاہ رہی تھی۔ میری دم بُری طرح جل گئی تھی۔ کچھ دن بعد جیسے ہی دم ٹوٹی، میں دوبارہ انسانی شکل میں آ گئی۔''

دھوبی بہت خوش ہوا اور اسے اپنی بیٹی بنا کر گاؤں میں آ گیا۔ چند روز بعد دھوبی نے گاؤں کے ایک نیک لڑکے سے اس کی شادی کر دی۔

☆

ہمدرد نونہال کی قیمت

آج کل منہگائی نے ہر ایک کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے اور روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہیے کہ منہگائی ختم اور عوام کی پریشانی دور ہو۔ ہمدرد نونہال کی موجودہ قیمت ۳۰ روپے ہے۔ ہر چیز کی قیمت میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔ کاغذ تو بہت ہی منہگا ہو گیا ہے، اس لیے ہم بھی مجبور ہو رہے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جولائی ۲۰۱۲ء سے ہمدرد نونہال عام شمارے کی قیمت

۳۵ روپے

ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمدرد نونہال پڑھنے والے سب دوست اس اضافے کو خوشی سے قبول کریں گے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن، پاکستان

نونہال ادیب

لکھنے والے نونہال

طلیبہ عابد، کراچی
عاقب اسماعیل، میر پور خاص
عمران خان کنبار، ڈیرہ اللہ یار
صدف خالد، کراچی
سبرینہ رضوان احمد، حیدر آباد
محمد عزیر چشتی، ڈیرہ غازی خان
محمد حمزہ اشرفی، گلبہار، کراچی
شارو دل، وہاڑی
زہیرہ عبداللہ صدیقی، کراچی

حمدِ باری تعالیٰ

مرسلہ: طلیبہ عابد، کراچی

طاقت والا یارب! تُو ہے
عظمت والا یارب! تُو ہے
سب کا والی ، سب کا مولا
ہر ایک نعمت دینے والا
سیدھی راہ دکھائی تُو نے
بگڑی بات بنائی تُو نے
ہم ہیں پاکستانی بچے
بات کے پکے ، قول کے سچے
اتنی ہمت دے دے ہم کو
اتنی جرأت دے دے ہم کو
دنیا میں وہ کام کریں ہم
قوم کا روشن نام کریں ہم

آموں کا شہر میر پور خاص

عاقب اسماعیل، میر پور خاص

میر پور خاص صوبۂ سندھ کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ یہ شہر آموں کا شہر کہلاتا ہے۔ میر پور خاص آموں کی جس قسم کی وجہ سے مشہور ہے، وہ سندھڑی آم ہے۔ میر پور خاص چاروں طرف سے آموں اور دوسرے پھلوں اور پھولوں کے خوب صورت باغات سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں کی راتیں خاص طور پر بہت مشہور ہیں۔

گرمیوں میں دن بھر چاہے کتنی ہی گرمی پڑے، مگر اللہ تعالیٰ نے میر پور خاص کی راتیں نہایت ٹھنڈی اور پُر سکون بنائی ہیں۔ شام ہوتے ہی یہاں ٹھنڈی ہوائیں

چلنے لگتی ہیں۔

میر پور خاص میں ہر سال نہایت شان دار طریقے سے آموں کی نمایش ہوتی ہے، جس میں چھوٹے بڑے سب ہی زمین دار اپنی اپنی فصلوں کی نمایش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے میر پور میں بہت رونق ہوتی ہے۔ شام ہوتے ہی مرد، خواتین، بچے، بزرگ اور دوسرے شہروں سے بھی آنے والے یہاں آموں کی نمایش بڑے شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ آموں کی نمایش پہلے یہاں کے کرکٹ گراؤنڈ گاما اسٹیڈیم میں ہوا کرتی تھی، لیکن جب سے یہاں فروٹ فارم کے لیے ایک بہت بڑا ائر کنڈیشنڈ ہال تعمیر ہوا ہے، تب سے اسی ہال میں آموں کی نمایش نہایت اہتمام سے کی جاتی ہے۔

اس سال ۴۷ واں مینگو فیسٹیول بھی اسی ہال میں منعقد کیا جائے گا۔ آم کی پیداوار کی وجہ سے میر پور خاص پاکستان کا سب سے بڑا مرکز مانا جاتا ہے۔ یہاں پھلوں کی منڈی کافی وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ آموں کے موسم میں جہاں تک نگاہ جاتی ہے، کچے پکے ہر قسم کے آموں سے بھری ہوئی پیٹیاں ہی پیٹیاں نظر آتی ہیں اور میر پور خاص سے آموں سے بھرے ہوئے ٹرک روزانہ پورے پاکستان میں بھیجے جاتے ہیں۔

چاند ستارے

عمران خان کلبار، ڈیرہ اللہ یار

چاند کی کشتی پیاری پیاری
تارے اس میں کریں سواری
نیلے امبر کے ساگر پر
دیکھو چلی لہرا لہرا کر
بادل میں چھپ جاتی ہے
لوٹ کے پھر آجاتی ہے
کون ہے اس کو چلانے والا
کون ہے پار لگانے والا
اللہ ہی اللہ ، اللہ ہی اللہ

ایک نیا عزم

صدف خالد، کراچی

کام یابی کا پہلا اصول وقت کی پابندی ہے۔ اگر ہم اپنے روز مرّہ کے کاموں میں وقت کی پابندی کو اہمیت دیں تو ضرور کام یاب ہو سکتے ہیں۔ تاریخ میں جتنے بھی بڑے لوگ گزرے ہیں، وہ وقت کے پابند تھے۔ قائداعظم بھی وقت کی قدر کرتے تھے۔ دوستو! ذرا سوچیے، ہم اپنا قیمتی وقت کس طرح گنوا رہے ہیں۔ جن بچوں کے ہاتھوں میں کتابیں ہونی چاہییں، وہ سارا سارا دن ٹی وی کے آگے بیٹھ کر وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ ہمارے رہنما رسالے ماہ نامہ ہمدرد نونہال کے بانی شہید حکیم محمد سعید کہتے تھے: ''میں چاہتا ہوں کہ میری شیروانی کے بٹن کم ہوں، تاکہ اسے کھولنے اور لگانے میں وقت کم لگے۔''

وہ اگر جہاز میں بھی سفر کر رہے ہوتے تو بچوں کے لیے کچھ لکھ رہے ہوتے تھے۔ آج کل کے نوجوان دن بھر ٹی وی کے آگے بیٹھے رہتے ہیں اور لائٹ چلی جائے، تب بھی انھیں سکون نہیں ملتا۔ جھٹ جیب سے موبائل نکالا اور گانے سننے لگے یا پھر ایس ایم ایس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

دوستو! ہمارے ہاں اچھی کتابوں کی کمی نہیں۔ اگر ہم یہی وقت کتابیں پڑھنے میں صرف کریں تو کتابیں ہمیں کام یاب انسان بنا سکتی ہیں۔ کتابیں ہی ہمارے اندر کچھ کرنے کا حوصلہ اور جوش و جذبہ پیدا کر سکتی ہیں۔ کتابیں ہماری استاد ہیں، دوست ہیں، رہنما ہیں۔ کتابیں تنہائی کی ساتھی ہیں۔ دوستو! آج ہمارا وطن جن مشکل حالات سے گزر رہا ہے، اس میں ہم سے ہی اچھی اُمید رکھی جا سکتی ہے کہ ہم بڑے ہو کر اپنے وطن کو سنواریں گے۔ آئیے، ہم عہد کریں کہ ہمیشہ وقت کی پابندی کریں گے، دل لگا کر علم حاصل کریں گے۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ کریں گے اور بڑے ہو کر اپنے پیارے وطن پاکستان کی خدمت کریں گے۔ یا اللہ! ہم

سب کو اس قابل بنا کہ ہم اپنے ملک کو سنوار سکیں اور اپنے بزرگوں کی اُمیدوں پر پورا اُتر کر دکھائیں۔ آمین۔

بہترین ادیب

سبرینہ رضوان احمد، حیدر آباد

فائزہ کو کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک بڑی ادیبہ بننے کے خواب دیکھتی رہتی تھی، مگر اس کے والدین اس کی لکھنے والی عادت سے نالاں تھے۔ وہ فائزہ کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور اسی لیے وہ آج کل بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ اب اس کا دل پڑھنے میں نہیں لگتا تھا۔ اس کی سہیلی ماہرہ نے اس کو مشورہ دیا کہ تم اپنا دل پڑھنے میں لگاؤ اور فارغ وقت میں کہانیاں بھی لکھا کرو۔ اپنا تھوڑا سا وقت بھی ضائع نہ کرو۔ فائزہ نے ہامی بھر لی اور اب وہ پڑھنے میں بھی خوب دل لگانے لگی۔ اس نے میٹرک میں بھی خوب محنت کی اور اچھی پوزیشن حاصل کر کے اپنی امی، ابو کو خوش کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی دل چسپی سے کہانیاں بھی لکھتی رہی۔ اب جو بھی کہانی لکھتی، ماہرہ کو دے دیتی اور ماہرہ وہ کہانی بچوں کے بہت ہی اچھے اور مقبول رسالوں میں بھیج دیتی۔ بہت دنوں تک یوں ہی چلتا رہا۔ فائزہ کی کئی کہانیاں شائع ہوئیں اور پسند بھی کی گئیں۔

ایک دن وہ داخلے کے لیے کالج کا فارم بھر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ڈاکیا تھا۔ اس نے فائزہ کو ایک لفافہ دیا۔ جب اس نے لفافہ کھولا تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک رسالے کی طرف سے اس کو انعام ملا تھا اور اسے رسالے کی طرف سے ایوارڈ تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ فائزہ کو متواتر کئی اچھی کہانیاں لکھنے پر ''بہترین ادیب'' کا اعزاز ملا تھا۔

فائزہ کے امی، ابو کو اپنی غلطی پر بہت ندامت ہوئی، کیوں کہ انھیں پتا چل گیا تھا کہ کام یابی صرف ڈاکٹر یا انجینئر بننے میں ہی نہیں، بلکہ ہر اس کام میں ہے، جس میں آپ کو دل چسپی ہو اور آپ اسے عمدہ طریقے سے کریں۔ جس شعبے کو آپ پسند کرتے ہیں، اس کام میں آپ محنت کرتے ہیں اور دل لگاتے ہیں، اس لیے آپ کام یاب بھی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے فائزہ کے ابو نے اسے کہانیاں لکھنے کی اجازت دے دی اور ہر ماہ باقاعدگی سے اسے رسالے اور کتابیں بھی لا کر دینے لگے۔

اندازِ تحریر

محمد عزیر چشتی، ڈیرہ غازی خان

لکھنا ایک فن ہے۔ تحریر پڑھ کر لکھنے والے کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھنے کے لیے شوق اور محنت کے ساتھ ساتھ صبر بھی درکار ہوتا ہے۔ لکھتے وقت یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ لوگ اس تحریر کو پڑھنے پر مجبور ہو جائیں اور اس کا اثر قبول کریں۔ ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے، جس کے بارے میں وسیع معلومات ہوں۔ اندازِ بیان سادہ اور بامقصد ہو۔ مناسب الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے لکھیں۔ نظرِ ثانی کریں اور اضافی جملے کاٹ دیں۔ آخر میں اپنی تحریر کو ایسے پڑھیں جیسے کسی دوسرے کی تحریر کا مطالعہ بطور مدیر کر رہے ہوں۔ اگر اس دوران کوئی خامی نظر آئے تو اس کو دور کریں۔ تحریر کو کئی بار بھی لکھنا پڑے تو کوئی حرج نہیں۔

لیجیے! آپ نے ایک اچھا مضمون لکھ لیا۔ لکھنے میں جتنا مزہ آتا ہے، اتنا ہی لطف اسے پڑھنے میں آتا ہے۔ اگر آپ کو لکھنے اور پھر پڑھنے میں مزہ نہیں آتا تو تحریر کو شائع ہونے سے روک دیں۔ اپنی تحریر میں ممکنہ حد تک بہتری لائیں اور خوب سے خوب کا سفر جاری رکھیں۔

موبائل فون

محمد حمزہ اشرفی، گلبہار، کراچی

''خرم کی ضد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔'' خرم کی امی نے خرم کے والد سے کہا۔

''کچھ بھی ہو جائے، میں خرم کی یہ ضد پوری نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی کھلونا وغیرہ

مانگ رہا ہوتا تو میں دلا دیتا، لیکن وہ موبائل فون کی ضد کر رہا ہے اور وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ میں کل خود اسے سمجھاؤں گا۔''

خرم ساتویں جماعت کا ایک ذہین طالب علم تھا۔ وہ ہمیشہ جماعت میں اول آتا۔ اکلوتا کی وجہ سے ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ وہ اس کی ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ اس کی کلاس کے ایک لڑکے ندیم کے لیے اس کے ابو نے ایک موبائل فون خریدا تھا۔ خرم نے جب دیکھا تو گھر آ کر اس نے اپنے امی ابو سے موبائل فون کا تقاضا کیا اور پھر باقاعدہ ضد کرنا شروع کر دی۔

خرم کے والد صاحب ایک اعلا سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ ان کے لیے خرم کو موبائل دلانا ذرا بھی مشکل نہ تھا، لیکن وہ جانتے تھے، ابھی موبائل کے لیے اس کی عمر کم ہے۔ اگر انھوں نے اسے موبائل دلا دیا تو وہ پڑھائی پر دھیان نہیں دے گا، جو سب سے ضروری ہے۔ انھوں نے خرم کو سمجھایا کہ وہ اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کرے گا تو وہ اسے اچھا سا موبائل فون خرید کر دے دیں گے، لیکن خرم نے ایک ہی ضد پکڑی ہوئی تھی کہ اسے ابھی موبائل چاہیے۔

''خرم بیٹا! کھانا کھالو۔ کھانے سے کیسی دشمنی؟'' خرم کی والدہ نے کہا۔

''جب تک مجھے موبائل نہیں دلائیں گی، میں نہیں کھاؤں گا۔''

''بیٹا! ابھی تم صرف پڑھو۔ موبائل کے لیے ابھی تم چھوٹے ہو۔ تم کم از کم اچھے نمبروں سے میٹرک کرو گے، تبھی تمھیں موبائل دلاؤں گی۔''

''لیکن میرے کلاس فیلو ندیم کے ابو نے تو اسے موبائل فون دلا دیا۔ وہ بتا رہا تھا کہ صرف پانچ ہزار روپے کا ہے۔ اب وہ اتنے مزے سے دوستوں کو میسج کرتا ہے۔ کبھی غیر حاضر ہوتا ہے تو فون کر کے دوستوں سے ہوم ورک بھی پوچھ لیتا ہے۔''

''بیٹا! وہ تم سے کافی بڑا ہے اور تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا وہ اب بھی پڑھائی میں اتنا ہی اچھا ہے، جیسے پہلے تھا؟''

خرم کچھ سوچتے ہوئے بولا: ''ہاں، وہ روزانہ اسکول آتا تھا اور پڑھائی میں بھی بہت اچھا تھا، لیکن اب وہ پڑھائی میں اچھا نہیں رہا اور اسکول سے چھٹیاں بھی زیادہ کرتا ہے اور پوچھنے پر کہتا ہے کہ پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔''

''دیکھا! اگر ہم بھی ندیم کے والدین کی طرح تمھیں ابھی سے موبائل فون دلا دیں تو تم بھی پڑھائی سے غافل ہو جاؤ گے اور اسکول میں غیر حاضر رہنے لگو گے، جب کہ ابھی تک تمھارا تعلیمی ریکارڈ اور حاضری ریکارڈ شان دار رہا ہے۔ کیا تمھیں اب بھی موبائل کی خواہش ہے؟''

خرم ایک دم بولا: ''نہیں امی! اب میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ ابھی مجھے موبائل کی ضرورت نہیں۔ میں دل لگا کر پہلے اپنی پڑھائی مکمل کروں گا۔ میں نے ضد کر کے آپ کو کتنا تنگ کیا ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔'' خرم کی والدہ نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا: ''نہیں میرے لعل! مجھے خوشی ہے کہ تمھاری سمجھ میں بات آ گئی۔''

''اب خرم نے ضد کرنا چھوڑ دی ہے۔'' خرم کی امی نے خوشی سے خرم کے والد کو بتایا۔ وہ بھی یہ سن کر خوش ہوئے۔

نیکی کا صلہ

شارو دل، وہاڑی

روشن نگر میں احمد نامی ایک شخص رہتا تھا۔ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر نزدیکی شہر میں بیچتا اور اس سے اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتا تھا۔

ایک دن اس نے حسب معمول لکڑیاں اپنے ریڑھے پر ڈالیں اور شہر کی طرف چل پڑا۔ ابھی اس نے تھوڑا سا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک اس کی نظر ایک بریف کیس پر پڑی۔ اس نے جلدی سے بریف کیس اُٹھایا اور کپڑے میں لپیٹ کر لکڑیوں کے نیچے چھپا دیا۔ گھر پہنچ کر بریف کیس صندوقچوں کے پیچھے چھپا دیا۔ اتنے میں اس کی بیوی آئی تو اس نے پوچھنے پر سارا واقعہ سنایا۔

اگلے روز ناشتا کرنے کے بعد اس کپڑے میں لپٹا ہوا بریف کیس اُٹھایا اور چلتے وقت بیوی سے کہا: ''دعا کرنا، میں کام یاب لوٹوں۔ امانت مالک تک پہنچ جائے۔''

''آپ کو اللہ تعالیٰ کام یاب کرے۔'' بیوی نے کہا۔

احمد جا کر اسی جگہ پر کھڑا ہو گیا، جہاں سے اسے یہ بریف کیس ملا تھا۔ کافی دیر ہو گئی۔ اسے اُمید تھی کہ کوئی نہ کوئی بریف کیس کو ضرور ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اتنے میں اسے ایک آدمی تیز تیز چلتا ہوا دکھائی دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ احمد نے لپک کر اس آدمی کو سلام کیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کیا ڈھونڈ رہا ہے؟

اس نے بتایا: ''کل ایک تانگے میں یہاں سے گزرتے ہوئے میرا بریف کیس گر گیا تھا۔ رات میں جاتے ہی سو گیا تھا۔ مجھے صبح ہی پتا چلا ہے اور میں راستے بھر ڈھونڈتا ہوا یہاں آ گیا ہوں۔''

احمد نے جلدی سے کپڑے سے بریف کیس نکال کر اس آدمی کی طرف بڑھایا اور کہا: ''یہ مجھے کل یہاں سے ملا تھا۔''

اس آدمی نے جلدی سے بریف کیس کھولا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ بولا: ''میں دیکھ کر حیران ہوں کہ اس میں سے ذرا بھی پیسے نکالے نہیں گئے، ویسے کے ویسے ہی ہیں۔''

''نہیں صاحب! ہم نے تو اسے کھولا بھی نہیں۔ یہ آپ کی امانت ہے۔''

اس آدمی نے کہا: ''شکر ہے کہ یہ تمھیں مل گیا۔ اگر اور کسی کو ملتا تو پتا نہیں مجھ تک پہنچتا بھی یا نہیں۔ یہ لو، تمھاری ایمان داری کا انعام۔'' اس نے بریف کیس سے چند نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

احمد نے انکار کرتے ہوئے کہا: ''نیکی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی صاحب! آپ کا بہت شکریہ۔''

''کیا کام کرتے ہو تم؟'' اس آدمی نے پوچھا۔

''صاحب! میں لکڑیوں کو جنگل سے کاٹ کر روزی کماتا ہوں۔'' احمد نے جواب دیا۔

''یہ میرا کارڈ ہے۔ کل اس پتے پر آ جانا، تمھیں نوکری مل جائے گی۔ مجھے تمھارے جیسے ایمان دار کی ضرورت ہے۔'' آدمی نے کہا۔

''لیکن صاحب! میں تو پڑھا لکھا بھی......''

اس آدمی نے بات کاٹتے ہوئے کہا: ''مجھے صرف تمھاری ایمان داری سے غرض ہے، تم اس پتے پر آ جانا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے احمد کا کندھا تھپکا اور چل دیا۔

احمد نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا، جس نے اسے ایمان داری کا اتنا اچھا صلہ دیا تھا، پھر خوشی خوشی گھر کی طرف چل دیا۔

نیلی چڑیا

زہیرہ عبداللہ صدیقی، کراچی

کسی ملک میں ایک نہایت سُست اور چڑچڑا شہزادہ رہتا تھا۔ وہ کبھی خوش نہیں رہتا تھا۔ ہر بات میں نکتہ چینی کرنا اور ہر کام میں ناک بھوں چڑھانا اس کی عادت تھی۔ محل میں کام کرنے والے ملازم اسے پیٹھ پیچھے چڑچڑا شہزادہ کہتے تھے۔ شہزادہ، بادشاہ اور ملکہ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس لیے وہ اسے دل و جان سے چاہتے تھے اور اس کی ہر خواہش پوری کرتے، مگر پھر بھی وہ خوش نہیں رہتا تھا۔

''ہم شہزادے کو خوش کرنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟'' بادشاہ اور ملکہ نے ایک دن اپنے وزیر سے پوچھا۔

''وہ جو مانگتا ہے، اسے دے دیجیے۔'' وزیر نے تجویز پیش کی۔ بادشاہ نے اس پر بھی عمل کیا، مگر اس کے باوجود شہزادہ خوش ہونے کے بجائے اُداس ہی رہتا۔ شہزادہ اُداس ہوتا تو اُداسی مٹانے کے لیے خوب کھاتا پیتا۔ بے تحاشا کھانے اور ہر وقت بستر پر پڑے رہنے کی وجہ سے وہ سُست ہو گیا۔ وہ چھوٹا موٹا کام بھی خود سے نہ کرتا۔ اس کے ہاتھ منھ بھی خادم

دھلاتے۔ جب شہزادے کی اُداسی حد سے بڑھ گئی تو بادشاہ نے ملک بھر میں اعلان کرادیا کہ جو شہزادے کو خوش کرے گا، اسے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔ چناں چہ دور دور سے لوگ شہزادے کو خوش کرنے کے لیے آئے۔ کچھ نے اُسے ہنسانے کے لیے لطیفے سنائے، کچھ نے بہت انوکھے تحفے دیے تو کچھ نے اُسے مزاحیہ باتوں سے بہلانے کی کوشش کی، مگر وہ پھر بھی خوش نہ ہوا۔ جو لوگ شہزادے کو ہنسانے کے لیے آئے تھے، وہ سب ہار مان کر واپس چلے گئے۔

ایک دن ایک بوڑھی عورت محل میں آئی۔ اس نے نہ تو شہزادے کو ہنسانے کے لیے لطیفے سنائے اور نہ اسے بہلانے کی کوشش کی، بلکہ اس نے شہزادے کو نظر انداز کر دیا اور صرف بادشاہ اور ملکہ سے باتیں کیں۔ ''شہزادے کو خوش رکھنے کے لیے سب سے پہلے تو نیلی چڑیا کو تلاش کرنا ہے۔'' بوڑھی عورت نے بادشاہ اور ملکہ سے کہا۔

''ایسی چڑیا کہاں مل سکتی ہے؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

ملکہ نے کہا: ''ہم نیلی چڑیا بازار سے خرید کر لے آئیں گے۔''

''نہیں!'' بوڑھی عورت نے کہا: ''اس نیلی چڑیا کو شہزادہ خود ہی تلاش کرے گا۔ اگر اسے یہ چڑیا کسی اور ذریعے سے ملی تو یہ خوش نہیں ہوگا۔''

''تمھارے خیال میں یہ چڑیا آسانی سے مل جائے گی؟'' ملکہ نے اشتیاق سے پوچھا پھر کہا: ''میرا بیٹا کبھی محل سے باہر نہیں گیا۔ یہ تو صرف اپنے بستر پر سونا پسند کرتا ہے اور کھاتا پیتا رہتا ہے۔ یہ تو کبھی ہل کر پانی بھی نہیں پیتا۔ بھلا چڑیا کی تلاش میں باہر کیسے جائے گا؟''

''نیلی چڑیا بہت نایاب ہے۔'' بوڑھی عورت نے کہا: ''شہزادے کو پوری دنیا میں اسے تلاش کرنا ہوگا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُسے پیدل سفر کرنا ہوگا۔''

جب ملکہ نے یہ بات سنی تو ہکا بکا ...ی اور بادشاہ بہت پریشان ہوا۔ پریشانی ... عالم میں اس نے پوچھا: ''کیا تمھیں ...ن ہے کہ یہی ایک طریقہ ہے، جس سے ...ادہ خوش رہے گا؟''

''مجھے سو فی صد یقین ہے۔'' بوڑھی ...رت نے اطمینان سے کہا۔

...ست شہزادہ یہ جان کر بالکل خوش ...ہوا کہ وہ ایک چھوٹی سی چڑیا کو تلاش ...رنے باہر جائے، مگر وہ جانتا تھا کہ بادشاہ ...ر ملکہ اس کی وجہ سے پریشان ہیں اور وہ ...و بھی بہت بور ہو چکا تھا، لہٰذا اس نے ...و چڑیا کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ صبح سویرے محل سے نکلا اور ایک ...ہاڑی راستے پر چلنے لگا۔ وہ چلتے ہوئے ...رختوں کی شاخوں کی طرف بھی دیکھتا جا رہا ...تا کہ شاید چڑیا نظر آ جائے، لیکن نیلی چڑیا ...ور دور تک پتا نہ تھا۔ شہزادہ میلوں دور ...ل گیا۔ چلتے چلتے اس کے پیروں میں ...الے پڑ گئے اور حلق میں پیاس سے کانٹے چبھنے لگے۔ جب وہ ایک شاہراہ تک پہنچا تو تھک چکا تھا۔

''میں اب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔'' شہزادے نے تھکن سے چور ہو کر کہا: ''یہ تو ایک انتہائی احمقانہ بات ہے کہ اگر میں نیلی چڑیا کو حاصل نہ کر سکا تو کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ مجھے محل کی طرف واپس چلنا چاہیے، لیکن اس سے پہلے مجھے آرام کی ضرورت ہے، تا کہ میں باقی سفر آسانی سے طے کر سکوں۔'' پھر وہ زمین پر لیٹ کر سو گیا۔ وہ کافی دیر سوتا رہا، جب وہ اُٹھا تو تھکن اُتر چکی تھی۔ چناں چہ اس نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو پہلے کے مقابلے میں ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ راستے میں بے شمار چیزوں کا تجربہ ہوا۔ جب اسے بھوک لگتی تو وہ درختوں پر پھل توڑ کر کھا لیتا، پیاس لگتی تو چشمے کا پانی پی لیتا۔ راستے میں ایسے ایسے مناظر دیکھنے میں آئے، جنھیں دیکھ کر اُسے احساس ہوا کہ زندگی صرف کھانے پینے کا نام نہیں ہے۔

پہلی بار باہر نکل کر اسے بہت سارے دل فریب منظر اور نئی نئی جگہیں دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ آخر شہزادہ چلتے چلتے شام کے وقت محل پہنچ گیا۔ جب وہ محل پہنچا تو ہر کسی نے شہزادے میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ اس کے ماتھے پر کوئی بل نہیں تھا، بلکہ وہ مسکرا رہا تھا اور اس کی جلد پسینے سے چمک رہی تھی۔

''کیا تمھیں وہ نیلی چڑیا مل گئی؟'' بادشاہ نے بے صبری سے پوچھا۔

شہزادہ یہ سن کر ہنسا اور بولا: ''کوئی چڑیا نہیں ملی، بلکہ چلنے اور کھلی ہوا میں سانس لینے کی وجہ سے مجھ میں بہت سی تبدیلی آگئی ہے۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔''

اچانک اسے کسی پرندے کے چہچہانے کی آواز سنائی دی۔ شہزادے نے جلدی سے مڑ کر دیکھا تو اسے باغ میں ایک چڑیا نظر آئی، جس کے پر نیلے تھے اور وہ درختوں کے اوپر سے آسمان کی طرف اُڑ رہی تھی۔

شہزادے نے ہنستے ہوئے کہا: ''کیا یہ وہی چڑیا ہے؟ اب میں اسے پکڑنا نہیں چاہتا، اس لیے کہ میں نے یہ راز جان لیا ہے کہ زندگی صرف کھانے پینے اور سونے کا نام نہیں، بلکہ کچھ کر دکھانے کا نام ہے۔''

اس حقیقت کو جاننے کے بعد شہزادے کی سُستی، کاہلی اور اُداسی ہمیشہ کے لیے دور ہوگئی۔

☆☆☆

ہر مہینے ہزاروں تحریریں

ہمدرد نونہال میں شائع ہونے کے لیے ہر مہینے ہزاروں تحریریں (کہانیاں، لطیفے، نظمیں اور اشعار) ہمیں ملتی ہیں۔ ان میں سے جو تحریریں شائع ہونے کے قابل نہیں ہوتیں ان تحریریں کے نام ''اشاعت سے معذرت'' کے صفحے میں شائع کر دیے جاتے ہیں۔ لطیفوں، چھوٹی تحریروں اور اقتباسات (وغیرہ) کے نام اس صفحے میں نہیں دیے جاتے۔ نونہالوں سے درخواست ہے کہ وہ ہم سے خط لکھ کر سوال نہ کریں۔ ایسے خطوں کے جواب سے وقت بچا کر ہم اسے رسالے کو زیادہ بہتر بنانے میں خرچ کرتے نا چاہتے ہیں۔ ☆

مثالی نمونہ

فرزانہ روحی اسلم

پروفیسر صاحب اپنا فلیٹ کرائے پر دینا چاہ رہے تھے۔ جب انھیں کرائے دار [مل] گئے تو انھوں نے فوری طور پر اپنا فلیٹ خالی کیا اور اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اسی افراتفری میں کچھ چھوٹی چیزیں وہیں رہ گئیں۔ جب سب لوگ نئے گھر [منت]قل ہو گئے تو ضرورت پڑنے پر پرانے فلیٹ میں رہ جانے والی چیزیں ایک ایک کر [کے] یاد آنے لگیں۔

بیگم نے سوچا کہ رہ جانے والی چیزیں آہستہ آہستہ لے آئیں گی۔ وہ ہر شام ٹہلتی [ہوئ]ی اپنے کرائے دار نعمان صاحب کے ہاں چلی جاتیں اور اپنی کوئی نہ کوئی چیز اُٹھا کر لے [آت]یں۔ آخر میں ایک چپل رہ گئی تھی، جو پروفیسر صاحب کے ایک غیر ملکی دوست نے انھیں لا [کر] دی تھی۔ انھیں اُس چپل کو پہن کر چلتے وقت بہت سکون محسوس ہوتا تھا۔ جب پروفیسر [صا]حب کو اپنی چپل کی ضرورت ہوتی تو انھیں یاد آتا کہ چپل تو ان کے پرانے گھر میں ہی رہ [گئ]ی ہے۔

بیگم کہتیں: ''شام کو جا کر اپنی چپل لے آیئے گا۔ بھلا کوئی اپنی چیز یوں ہی چھوڑتا ہے۔''

پروفیسر صاحب کہتے: ''اب کیا ایک جوڑی چپل کی خاطر دوسروں کے دروازے پر [جا]نے جاؤں۔''

''دوسرے کا دروازہ؟'' ان کی بیگم نے حیرت سے کہا: ''دوسرے کا دروازہ کیسے [ہو]گیا؟ ارے وہ فلیٹ میرے نام پر ہے۔''

ابھی بیگم، پروفیسر صاحب سے چپل واپس لانے پر اصرار کر ہی رہی تھیں کہ موبائل [فو]ن کی گھنٹی بجنے لگی۔ پروفیسر صاحب نے فون کان سے لگایا۔ فون سن کر وہ بولے: ''نعمان

صاحب کرائے کی رقم دینے کے لیے بلا رہے ہیں۔"

"خود آ کر کیوں نہیں دے دیتے، بلا کیوں رہے ہیں؟"

پروفیسر بولے: "میں نے کہا تھا کہ خود آ کر وصول کر لوں گا اور ساتھ ہی بھا صاحب کی خیر خبر بھی لیتا آؤں گا۔ مزید کچھ منگوانا ہو تو ابھی بتا دو، مارکیٹ سے لیتا آ گا۔"

بیگم جھٹ بولیں: "اپنی چپل لیتے آیئے گا۔"

پروفیسر صاحب نے نعمان صاحب سے رقم وصول کی اور علیک سلیک کے رخصت ہو گئے۔ نعمان صاحب نے لاکھ چائے پینے پر اصرار کیا، مگر وہ نہ مانے۔

پروفیسر صاحب نے رقم بیگم کے ہاتھ میں تھمائی ہی تھی کہ انھوں نے چپل کا پوچھا "کیا پھر بھول گئے؟"

"نہیں بھولا تو نہیں۔ مجھے چپل یاد تھی، مگر......"

"مگر کیا؟ اب اپنی چیز کو مانگنا کون کہتا ہے!"

"وہ لوگ کیا سوچیں گے۔ پروفیسر صاحب ایک چپل مانگنے آ گئے، وہ بھی پرا سی۔" پروفیسر صاحب نے بیگم کو ٹالنا چاہا۔

"اچھا اگر آپ کو اپنی چیز مانگنے میں شرم محسوس ہوتی ہے تو میں لے آؤں گی۔ انھوں نے بھی کبھی نہیں کہا کہ اپنی چپل لے جائیں۔"

"ارے نہیں ...... تم وہاں نہ جانا۔ تم اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھ سکتیں، جانے کیا کچھ کہہ دو۔ میں خود دیکھ لوں گا۔"

دوسری شام پروفیسر صاحب عصر کی نماز پڑھنے گئے تو واپسی میں خیال آیا کہ بیگم کی بحث سے بچنے کے لیے بہتر ہے کہ نعمان صاحب کے گھر جا کر چپل مانگ ہی لاؤں۔ آخر

سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نعمان صاحب کے دروازے پر پہنچے۔ کال بیل پر انگلی رکھی تو دروازے کے سوراخ سے کسی آنکھ نے جھانکا اور اندر سے آواز آئی: "پروفیسر صاحب آئے ہیں۔"

چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور نعمان صاحب نے بڑے ادب اور تہذیب سے پروفیسر صاحب کو اندر آنے کے لیے کہا۔

"ارے بھئی سمعیہ! چائے ناشتے کا انتظام کرو، پروفیسر صاحب آئے ہیں۔" نعمان صاحب نے اپنی بیگم کو آواز دی۔

"ارے نہیں، اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔ دراصل ...... میں ...... وہ چپل ......" بڑی مشکل سے پروفیسر صاحب کے منھ سے نکلا۔

"جی، جی! آپ اندر تو تشریف لائیں۔ آپ کی امانت ہمارے پاس محفوظ ہے۔"

''منے! لانا ذرا پروفیسر صاحب کی چپل۔'' نعمان صاحب نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔

چند لمحے بعد ایک خوب صورت پیکنگ پروفیسر صاحب کے سامنے موجود تھی۔

پروفیسر صاحب حیران تھے۔

نعمان صاحب نے کہا: ''جناب! ہم لوگ آپ کی علمی قابلیت سے متاثر ہیں۔ آپ اہل علم ہیں۔ کئی نسلوں کو علم کے زیور سے آراستہ کر چکے ہیں۔ میرے بارہ سالہ بیٹے نے آپ کو یہ چپل اکثر پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح آپ کا مداح ہے، لہٰذا اس نے آپ کی چپل کو اچھی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ کبھی کبھار یہ چپل پہن کے گھر میں ٹہلتا رہتا ہے اور خود کو آپ کی جگہ سمجھتا ہے۔ میں نے جب اُسے آپ کی چپل کا اتنا احترام دیکھا تو سوچا کہ اس چپل کو بیٹے کے پاس ہی رہنے دوں۔ اگر وہ اس چپل کے مالک کو اپنے لیے

ایک مثالی نمونہ سمجھ کر معاشرے میں آپ جیسا مقام حاصل کرلے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ بس یہی وہ وجہ تھی کہ ہم نے اب تک آپ کی چپل واپس نہیں کی۔''

پروفیسر صاحب ہکا بکا رہ گئے۔

ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ لوگ اسی معاشرے کے رہنے والے ہیں، جہاں سے رشتوں کا احترام اُٹھ چکا ہے۔ پروفیسر صاحب خود سے لاتعداد سوال وجواب کرتے ہوئے گھر پہنچ چکے تھے۔

بیگم نے نگاہ اِدھر اُدھر ڈالتے ہوئے پوچھا: ''چپل لے آئے؟''

''اُس چپل سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ جس کے پاس ہے، اُسی کی ہے۔ اب دوبارہ چپل کا ذکر نہ کرنا۔'' پروفیسر صاحب نے دوٹوک انداز میں حکم صادر کیا۔

بیگم حیران وپریشان کھڑی رہ گئیں۔ ☆

تحریر چھپوانے والے نونہال یاد رکھیں کہ

◆ ہر تحریر کے پیچھے نام پتا صاف صاف لکھا ہو۔ ◆ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر ہرگز نہ لکھیے۔ ◆ تحریر بھیجنے سے پہلے یہ نہ پوچھیں کہ ''کیا یہ چھپ جائے گی؟'' ◆ مختصر صاف لکھی ہوئی تحریر کی باری جلد آتی ہے۔ ◆ قلم کی بجائے سے اصلاح کر کے بھیجیے۔ ◆ نونہال مصوروں کے لیے تصویر کم از کم اے فور سائز کے سفید موٹے کاغذ پر گہرے رنگوں میں بنی ہو۔ ◆ تصویر کے اوپر نام نہ لکھیے بلکہ تصویر کے پیچھے لکھیے۔ ◆ تصویر خانے کے لیے بھیجی گئی تصویریں جب ماہرین مسترد کر دیتے ہیں تو وہ ضائع ہو جاتی ہیں۔ واپس منگوانا چاہتے ہوں تو ٹکٹ لگا ہوا جوابی لفافہ ساتھ بھیجیے۔ ◆ تصویر کے پیچھے اپنے کلاس اور جگہ کا نام ضرور لکھیے۔ ◆ بیت بازی کا ہر شعر الگ کاغذ پر ٹھیک ٹھیک لکھ کر شاعر کا صحیح نام ضرور لکھیے۔ ◆ علمی تحریر کے لیے ہر لطیفہ الگ کاغذ پر لکھیے۔ ◆ لطیفے گھسے پٹے نہ ہوں۔ ◆ روشن خیالات کے لیے ہر قول الگ کاغذ پر لکھیے۔ ◆ قول بہت مشکل نہ ہو۔ ◆ علم دریچے کے لیے جہاں سے بھی کوئی ٹکڑا لیا ہو اس کا حوالہ اور مصنف کا نام ضرور لکھیے۔ ◆ تحریر کسی مخصوص فرقے، عقیدے یا ملکی قانون کے خلاف نہ ہو۔ ◆ طنزیہ اور مزاحیہ مضمون شائستہ ہو، کسی کا مذاق اڑانے یا دل دکھانے والا نہ ہو۔ ◆ نونہال بڑا مضمون کہانی نہ بھیجیں۔ ◆ تحریر کی نقل اپنے پاس رکھیے تا کہ چھپنے کے بعد ملا کر دیکھ سکیں کہ تحریر میں کیا کیا تبدیلی کی گئی ہے۔ ◆ اشاعت سے معذرت میں صرف کہانیوں اور مضامین کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ◆ باقی چھوٹی چھوٹی تحریریں ناقابل اشاعت ہونے پر ضائع کر دی جاتی ہیں۔ ◆ تحریر، تصویر وغیرہ ارسال کرنے کا طریقہ وہی ہے جو خط بھیجنے کا ہے۔ ◆ کوپن اور کسی بھی تحریر پر صرف ایک نام لکھیے۔ ◆ اچھی تحریر لکھنے کے لیے زیادہ مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔ (ادارہ)

خونی بڑھیا

سمیعہ غفار میمن
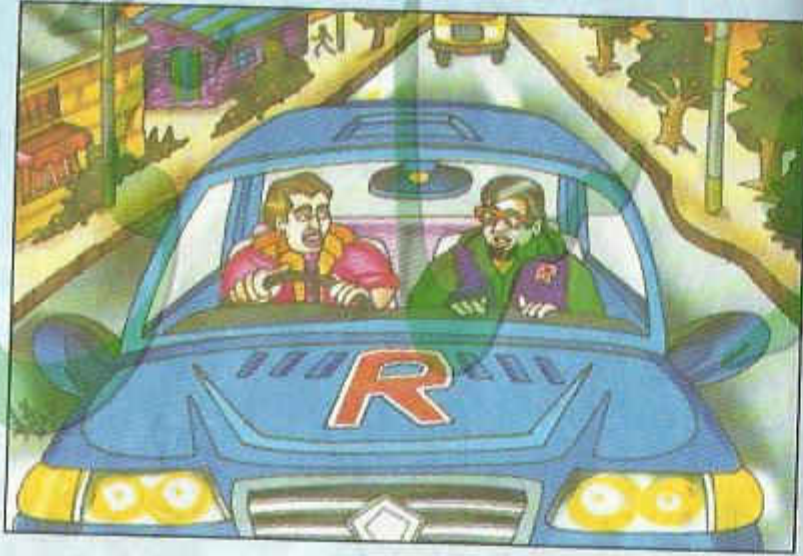
"طارق! ہم لوگ ٹھیک راستے پر تو جا رہے ہیں نا؟" رجب نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، مگر لگتا ہے، تم ڈر رہے ہو؟" طارق نے کہا۔

"واقعی مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے، یہیں سے گاڑی گھماؤ اور واپس چلو۔" رجب نے کانپتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو تمھیں پہلے ہی منع کیا تھا، میرے ساتھ مت چلو، لیکن تم نے میری ایک نہ مانی۔ اگر تم چاہو تو میں تمھیں یہیں اُتار دیتا ہوں، تم آرام سے گھر چلے جاؤ۔" طارق نے گاڑی روک کر کہا۔

"نہیں، نہیں میں تمھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تم میرے ایک ہی تو دوست ہو۔ ویسے تم نے ایک آدھ ہتھیار تو اپنے پاس رکھ لیا ہے نا؟" رجب نے کہتے کہتے چونک کر پوچھا۔

"ہتھیار؟ وہ کس لیے؟" طارق نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنی حفاظت کے لیے اور کس لیے۔ اگر خونی بڑھیا نے ہم پر حملہ کر دیا تو ہمیں بھی جوابی کارروائی کرنی پڑے گی نا۔" رجب نے مشورہ دیا۔

"ڈرو مت۔ کچھ نہیں ہوگا ہم دونوں کو۔"

دونوں دوست سنسان اور ویران راستوں سے گزرتے ہوئے آخر ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب آ پہنچے۔ طارق نے گاڑی روکتے ہوئے رجب کی طرف دیکھ کر کہا: "لو بھئی رجب! ہماری منزل آ گئی۔ خونی بڑھیا کا گاؤں یہی ہے۔"

طارق کی بات سن کر رجب اور بھی ڈر گیا۔ شام کافی ہو چکی تھی۔ دونوں گاڑی سے اُترے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، مگر انھیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ سردیوں کے دن تھے، اسی لیے گاؤں کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ اچانک انھیں ایک دیہاتی اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ قریب آ کر اُس نے پوچھا: "بابو! اجنبی لگتے ہو۔ کیا کسی سے ملنے آئے ہو؟"

"جی ہاں، ہمیں خونی بڑھیا سے ملنا ہے۔ کیا آپ ہمیں ان کے گھر کا پتا بتا سکتے ہیں؟" طارق نے کہا۔

"آؤ، میں آپ کو خونی بڑھیا کے گھر تک لے چلتا ہوں۔" دیہاتی نے کہا اور دونوں اس کے پیچھے چل پڑے۔

"کیا آپ یہیں رہتے ہیں؟" رجب نے دیہاتی سے پوچھا۔

"ہاں بابو!" دیہاتی نے جواب دیا۔

"تو کیا آپ کو خونی بڑھیا سے ڈر نہیں لگتا؟" رجب بولا۔

"کیوں؟ خونی بڑھیا تو بہت اچھی عورت ہے۔" دیہاتی نے کہا۔

"یہ لو شہری بابو! خونی بڑھیا کا گھر آ گیا۔" دیہاتی نے گھر کے پاس پہنچ کر کہا۔ طارق نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دیہاتی چلا گیا۔

طارق نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک بہت ہی بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی: "کون ہے؟ اندر آ جاؤ۔"

دروازہ کھلا ہوا تھا، دونوں گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ چھوٹا سا گھر تھا۔ معمولی سامان کے علاوہ کچھ چھوٹے بڑے ڈنڈے اور کچھ چھوٹے موٹے ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ ایک چارپائی پر ایک انتہائی بوڑھی عورت تسبیح ہاتھ میں لیے لیٹی تھی، ان کو دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی اور تسبیح ایک طرف رکھ کر پاس پڑا ہوا ڈنڈا اُٹھا لیا، پھر ان سے مخاطب ہو کر پوچھا: "کون ہو بیٹا! اور یہاں کس لیے آئے ہو؟"

رجب نے گھبرا کر ڈنڈے والے ہاتھ کو دیکھا۔ طارق جلدی سے بولا: "اماں جی! میرا نام طارق ہے اور یہ رجب ہے، میرا دوست۔ میں ایک رپورٹر ہوں، میرا مطلب ہے اخباری نمایندہ ہوں۔ ہم شہر سے آئے ہیں۔ ہم نے آپ کی بڑی شہرت سنی ہے، اسی لیے آپ کا انٹرویو

کرنے آئے ہیں، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟''

''اچھا اچھا بیٹا! بیٹھ جاؤ۔ یہ بتاؤ، چائے پیو گے؟'' خونی بڑھیا کے گھر میں بیٹھنے کی اور کوئی جگہ نہ تھی، اس لیے اس نے انھیں اسی چارپائی پر ہی بیٹھنے کو کہا۔

''نہیں، اماں جی! شکریہ۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی عمر کتنی ہے؟'' طارق نے پہلا سوال کیا۔

''عمر ٹھیک سے تو یاد نہیں ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ کم از کم اسّی سال تو ہو گی۔'' خونی بڑھیا نے سامنے ایک پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا نام خونی بڑھیا کیسے پڑا؟'' طارق نے پوچھا۔

''گاؤں والوں نے رکھا ہے۔ بڑے پیارے بچے ہیں۔ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔'' بڑھیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ یہ کام کب سے کر رہی ہیں؟'' طارق نے پوچھا۔

''بچپن سے۔''

''بچپن سے؟'' رجب حیرانی سے بولا۔

''کیا یہ آپ کا خاندانی پیشہ ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''نہیں اپنے خاندان میں، میں اکیلی یہ کام کرتی ہوں۔'' بڑھیا نے کہا۔

''کیا آپ کے بڑوں نے کبھی کو منع نہیں کیا؟'' رجب نے پوچھا۔

''کبھی نہیں، بلکہ وہ لوگ تو مجھ پر فخر کرتے تھے اور مجھے ہمیشہ ہمت دلاتے تھے۔ بات یہ ہے کہ میں بچپن ہی سے بہت بہادر تھی اور سب کی لاڈلی بھی، اسی لیے سب گھر والے میرا ساتھ دیتے تھے۔'' بڑھیا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ کو اپنے کیے پر کبھی افسوس یا پشیمانی نہیں ہوئی؟'' رجب نے پوچھا۔

''ارے وہ کیوں؟ میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا۔'' بڑھیا نے کہا۔

''کیا یہ قتل وغیرہ غلط نہیں؟'' رجب نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''اس میں غلط کیا ہے، بلکہ مجھے تو اپنے اس کام پر فخر ہے، کیوں کہ مجھ سے بہادر عورت تمھیں اس پورے گاؤں میں تو کیا پوری دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔'' بڑھیا نے اکڑ کر کہا۔

''اچھا اماں جی! آپ یہ بتائیں کہ آپ اب تک کل کتنے خون کر چکی ہیں؟'' طارق نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ خونی بڑھیا طارق کی بات کا جواب دیتی، اچانک ایک بچہ چلاتا ہوا بڑھیا کے گھر میں داخل ہوا اور ہانپتے ہوئے بولا: ''خونی بڑھیا، خونی بڑھیا! جلدی چلو، اماں نے تمھیں بلایا ہے۔''

''کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' بڑھیا نے پوچھا۔

''ہاں، بڑا خطرناک مسئلہ ہے۔'' بچہ بولا۔

''ڈنڈا لے کر چلنا ہے یا کوئی اور ہتھیار لینا پڑے گا؟'' بڑھیا نے پوچھا۔

''ڈنڈے سے بھی کام چل جائے گا، لیکن جلدی چلو۔'' بچے نے کہا۔

''تم دونوں یہیں رہنا، میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر بڑھیا نے ڈنڈا اُٹھایا اور بچے کے ساتھ چلی گئی۔

بڑھیا کے جانے کے بعد رجب نے طارق سے کہا: ''اس سے پہلے کہ خونی بڑھیا کسی معصوم کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے، ہم یہاں سے نکل چلتے ہیں۔ طارق! میری بات مانو اور چھوڑو اس انٹرویو کو۔ کہیں کوئی مصیبت نہ گلے پڑ جائے۔''

''نہیں، میں خونی بڑھیا کا انٹرویو لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ یہ انٹرویو میرے لیے بہت اہم ہے۔ آخر میری ترقی کا سوال ہے۔'' طارق نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد بڑھیا واپس آئی۔ اسے دیکھتے ہی رجب سہم گیا۔

بڑھیا بیٹھتے ہوئے بولی: ''ہاں تو بیٹا! تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''آپ اب تک کتنے خون کر چکی ہیں؟'' طارق نے اپنا سوال دہرایا۔

''سیکڑوں، ہزاروں۔'' بڑھیا نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کے گھر کبھی پولیس نہیں آئی؟'' رجب نے پوچھا۔

''آئی ہے، بالکل آئی ہے بلکہ اکثر آتی رہتی ہے۔'' بڑھیا بولی۔

''کیا انھوں نے کبھی آپ کو گرفتار کیا؟'' طارق نے پوچھا۔

''ان کی ایسی ہمت جو مجھے گرفتار کریں۔ آخر میرا جرم کیا ہے جو مجھے گرفتار کریں گے؟'' بڑھیا ایک دم غصے میں آ گئی۔

''تو پھر آپ کے پاس پولیس کیوں آتی ہے؟'' رجب نے پوچھا۔

''ارے بھئی، وہ میرے پاس خون کروانے آتی ہے اور کس لیے آئے گی۔'' بڑھیا نے کہا۔

''خ...... خو...... خون کروانے!'' رجب حیران ہوا۔

''ایک یہی کام تو مجھے آتا ہے، اسی لیے سب لوگ میرے پاس اسی کام کے لیے آتے ہیں۔'' بڑھیا نے کہا۔

''آپ کا گزارا کیسے ہوتا ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''خون کر کے۔'' بڑھیا نے کہا۔

''میرا مطلب ہے آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟'' طارق نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

''میرا ذریعہ معاش یہی تو ہے۔ لوگ مجھ سے خون کرواتے ہیں اور اس کام کے عوض مجھے کچھ پیسے دے دیتے ہیں، جس سے میرا گزارا ہو جاتا ہے۔'' بڑھیا نے بھی جواب کی وضاحت کی۔

''آپ نے کس کس طرح کے خون کیے ہیں؟'' طارق نے پوچھا۔

''الحمدللہ میں نے چھوٹے بڑے ہر طرح کے خون کیے ہیں۔'' بڑھیا بولی۔

''ابھی آپ تھوڑی دیر پہلے کس کا خون کرنے گئی تھیں؟'' رجب نے بھی ہمت کی۔

''وہ...... وہ تو چوہا تھا۔'' بڑھیا نے مسکرا کر کہا۔

''چوہا؟'' دونوں کے منھ سے بیک وقت نکلا۔

''ہاں چوہا۔ میں نے ابھی تو بتایا ہے کہ میں ماشاء اللہ چھوٹے بڑے ہر طرح کے موذی جانوروں کا خون کر لیتی ہوں جیسے لال بیگ، چوہا، بچھو، سانپ اور چھپکلی وغیرہ۔ ابھی پچھلے دنوں پولیس اسٹیشن میں سانپ آ گیا۔ انھوں نے مجھے فوراً بلا بھیجا۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کے بعد سانپ کو مار ڈالا۔ اس کارنامے پر مجھے گاؤں کے چودھری نے انعام سے بھی نوازا اور میرے اعزاز میں شان دار تقریب کا اہتمام بھی کیا گیا۔'' بڑھیا نے اپنا ایوارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔

''تو کیا آپ نے کبھی کسی انسان کا خون نہیں کیا؟'' رجب نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''انسانی خون! توبہ توبہ کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا کوئی عورت اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہے۔'' بڑھیا نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا اماں جی! آپ کا بہت شکریہ، اب ہم چلتے ہیں۔'' طارق نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا! تم لوگ ایسے نہیں جا سکتے۔'' بڑھیا نے کہا۔

''جی......!'' رجب ایک دم ڈر گیا۔

''کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تم لوگ کھانا کھا کر جانا۔ ویسے رات بھی ہو چکی ہے، اگر تم لوگ رکنا چاہو تو رک سکتے ہو۔'' بڑھیا نے پُر شفقت لہجے میں کہا۔

''نہیں اماں جی! مجھے کل دفتر جانا ہے، اس لیے ہم کھانا کھا کر نکل جائیں گے۔'' طارق نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

خونی بڑھیا بہت مہمان نواز عورت تھی۔ اس کے گھر میں کھانے کے لئے جو کچھ بھی تھا، اس نے مہمانوں کو پیش کر دیا۔ طارق اور رجب کے اصرار پر خونی بڑھیا بھی ان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر طارق اور رجب نے خونی بڑھیا کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کی راہ لی۔ ☆

ہنسی گھر

ایک صاحب چابی سے اپنا کان کھجا رہے تھے۔ کسی بچے نے دیکھا تو بولا: ''انکل! اگر آپ چابی سے اسٹارٹ نہیں ہو رہے ہوں تو دھکا لگا دوں؟''

مرسلہ: عائشہ منیر، حیدرآباد

ایک چیتے نے ایک بے وقوف کو چڑیا گھر میں مار ڈالا۔ دوسرے چیتے نے پوچھا: ''تم نے اسے کیوں مارا؟''

چیتا بولا: ''اس نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا کہ اتنی بڑی بلی!''

مرسلہ: محمد احتشام کاظم، شیخوپورہ

ایک کنجوس امیر آدمی مرنے لگا تو اس کے دوست نے کہا: ''سیٹھ جی! اب تو آپ مرنے والے ہیں۔ اللہ کی راہ میں کچھ دے دیں۔''

کنجوس آدمی نے آنکھیں کھولیں اور کہا: ''جان تو دے رہا ہوں اور کیا دوں؟''

مرسلہ: انعم شہزادی، رحیم یار خان

ایک امیر آدمی کی زندگی بچانے کے لیے خون کی ضرورت تھی۔ ایک کنجوس آدمی نے اسے خون دیا تو امیر آدمی نے اسے ایک گھڑی دی۔ دوسری بار خون کی ضرورت پڑی تو پھر کنجوس آدمی نے اسے خون دیا۔ اس دفعہ امیر آدمی نے صرف ایک ٹافی دی۔ کنجوس نے جب شکوہ کیا تو امیر آدمی نے کہا: ''اب میرے اندر کنجوس آدمی کا خون دوڑ رہا ہے۔''

مرسلہ: شہریار گوندل، بہاول نگر

ایک آدمی ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہا: ''ڈاکٹر صاحب! آپ کو یاد ہے، مجھے پچھلے سال نزلہ ہو گیا تھا، تب آپ نے مجھے نہانے کو منع کیا تھا۔''

ڈاکٹر: ''ہاں، مجھے یاد تو ہے۔''

''تو کیا میں اب نہا سکتا ہوں؟'' اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

مرسلہ: ایزان حبیب، سدیم حبیب، کراچی

استاد: ''تم کل اسکول کیوں نہیں آئے تھے؟''

شاگرد: ''جناب! آپ نے ہی تو کہا تھا کہ سبق یاد کیے بغیر اسکول نہ آنا۔''

مرسلہ: محمد حبیب عباسی، سکھر

ایک شخص ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔ ٹکٹ چیکر نے اس سے پوچھا تو اس شخص نے جواب دیا کہ ہمارا ملک آزاد ہے۔ اس کی ہر چیز ہماری ہے۔ اس طرح ٹرینیں بھی ہماری ہیں۔

ٹکٹ چیکر نے کہا: ''ذرا نیچے تشریف لائیے، جیلیں بھی آپ کی ہیں۔''

مرسلہ: کرن فدا حسین کیریو، کراچی

ہمسائے نے شکایت کی: ''دیکھیے جناب! کل آپ کے بچے نے مجھے پتھر کھینچ کر مارا تھا۔''

باپ نے پوچھا: ''وہ پتھر آپ کو لگا؟''

''نہیں، میں بال بال بچ گیا۔''

''پھر وہ میرا نہیں، کسی اور کا بیٹا ہوگا۔''

مرسلہ: محمد احمد، راولپنڈی

ساحل سمندر پر سیر کے دوران دو عورتیں آپس میں بحث کر رہی تھیں کہ گھوڑے پر پہلے میں بیٹھوں گی۔ گھوڑے والے نے تجویز پیش کی کہ وہ پہلے اس عورت کو اپنے گھوڑے پر بٹھائے گا، جس کی عمر کم ہوگی۔

ایک عورت بولی کہ میری عمر ۲۵ سال ہے۔ دوسری بولی کہ میری عمر ۲۰ سال ہے۔ قریب ہی ایک بڑی بی کھڑی تھیں، وہ بولیں: ''انکل! کیا آپ مجھے اس گھوڑے پر بیٹھنے دیں گے؟''

مرسلہ: مختار علی، لاڑکانہ

ایک اسکاؤٹ ماسٹر بڑے سخت مزاج کا مالک تھا، مگر اس بات پر بڑا زور دیتا تھا کہ کیمپ میں ہر اسکاؤٹ کو عمدہ غذا استعمال کرنی چاہیے۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ دو اسکاؤٹ سوپ کا ایک بڑا پیالہ لے کر جا رہے ہیں۔ اس نے حکم دیا: ''مجھے ایک چمچہ لا کر دو۔ میں اسے چکھنا چاہتا ہوں۔''

لڑکوں نے جواب میں کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ اس نے ڈپٹ کر کہا: ''میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔ جو کہا ہے، وہی کرو۔''

چناں چہ ایک چمچہ لایا گیا۔ اس نے ایک چمچہ بھر کر منھ میں رکھا تو اس کا منھ بن گیا۔ سوپ کا بیشتر حصہ منھ سے باہر نکل آیا۔ مارے غصے کے اس کی آنکھیں ابل پڑیں اور اس نے انتہائی غصے میں کہا: ''اسے سوپ ہرگز نہیں کہہ سکتے، تم اسے سوپ کہتے ہو؟''

ایک اسکاؤٹ نے کہا: ''نہیں جناب!

ہم یہی تو عرض کرنا چاہتے تھے کہ یہ تو برتن دھونے کا محلول ہے۔''

مرسلہ: شمائلہ خاور، دستگیر

😃 پہلی واردات ایک ہوٹل کے پاس ہوئی۔ فوراً ہی وہاں ایک سپاہی کا پہرہ لگا دیا گیا۔

دوسرے ہی روز ایک اور واردات شام کو اسٹور کے سامنے ہوئی۔ سپاہی کو پہلی جگہ سے ہٹا کر دوسری واردات کے مقام پر کھڑا کر دیا گیا۔ تیسری واردات رات کے بارہ بجے لانڈری کے پاس ہوئی۔ جب انسپکٹر نے سپاہی کو اس نئی جگہ پہرہ دینے کا حکم دیا تو اس نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا: ''میری ڈیوٹی وہاں لگائی جائے، جہاں واردات ہونے والی ہے۔''

مرسلہ: گلناز عارفین، لاہور

😃 لڑکے ریاضی کا سوال حل کر رہے تھے۔ سب لڑکوں کا جواب درست تھا، مگر ایک لڑکے کا جواب غلط نکلا۔ اتنی دیر میں تفریح کی گھنٹی بج گئی اور سب لڑکے کھیلنے کے لیے چلے گئے۔ اس لڑکے کو استاد نے یہ کہہ کر روک لیا کہ جب تک سوال ٹھیک حل نہیں کرو گے، تمھیں باہر نہیں جانے دیا جائے گا۔

لڑکا کچھ دیر مزید مغز ماری کرتا رہا، لیکن سوال حل نہ کر سکا۔ تنگ آ کر پوچھا: ''جناب! میرے سوال میں کتنی غلطی ہے؟''

''پچیس پیسے کی کمی ہے۔'' استاد نے جواب دیا۔

لڑکے نے جیب میں سے پچیس پیسے نکال کر میز پر رکھے اور بولا: ''یہ لیجیے، یہ پیسے حساب میں شامل کر لیجیے اور مجھے باہر جانے کی اجازت دیجیے۔''

مرسلہ: آسیہ تنویر، کورنگی

😃 ایک نوجوان نے فقیر کو پچاس پیسے کا سکہ دیا اور کہا: ''میں ایک کلرک ہوں، میری ترقی کے لیے دعا کیجیے۔''

یہ سن کر فقیر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کلرک نے پوچھا: ''کیا ہوا بابا! آپ کیوں رونے لگے؟''

فقیر نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا: ''تمھاری ترقی کے لیے کیا دعا کروں، میں خود ایک کلرک ہوں۔''

مرسلہ: تحریم خاں، بلال ٹاؤن

😃 نئی نسل کے موضوع پر ایک صاحب کی بور

تقریر سے لوگ اُکتا گئے تو انھوں نے کہا: ''مجھے معلوم ہے، آپ لوگ بور ہو رہے ہوں گے، لیکن یہ تقریر آنے والی نسل کے لیے مفید ہے۔''

مجمع سے آواز آئی: ''اگر تھوڑی دیر اور تقریر جاری رہی تو نئی نسل خود ہی آ کر سن لے گی۔''

مرسلہ: حبیب احمد، سیالکوٹ

😃 فلم ڈائرکٹر: ''دیکھو! تم اپنا ٹیلے فون نمبر مجھے نوٹ کرا دو۔ میں تمھیں ایک بوڑھے کا پارٹ ادا کرنے کے لیے بلاؤں گا۔''

نوجوان: ''میں جوان ہوں، یہ پارٹ کیسے ادا کروں گا؟''

فلم ڈائرکٹر: ''گھبراؤ نہیں، میں تمھیں جس وقت بلاؤں گا، اس وقت تک تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔''

مرسلہ: ممتاز کرم الٰہی، سرجانی ٹاؤن

😃 منے میاں اپنے چھے ماہ کے بھائی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے، جو حسبِ معمول گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔

اس نے امی سے پوچھا: ''امی! کیا ہمارا بھائی جنت سے آیا ہے؟''

امی نے کہا: ''ہاں بیٹے!''

منے میاں چند لمحوں تک سوچتے رہے، پھر بولے: ''اگر یہ بے وقوف رو رو کر فرشتوں کو تنگ نہ کرتا تو جنت سے کیوں نکالا جاتا۔''

مرسلہ: سلمان بٹ، ملتان

😃 ایک اسکول میں نرسری کی استانی بیسویں بچے کو جوتے پہنا رہی تھیں۔ جھکے جھکے اس کی کمر میں درد ہونے لگا۔ بیسواں بچہ شرمیلا اور خاموش طبع تھا۔ جب استانی نے اسے بہت کوشش کے بعد جوتے پہنا دیے تو بچہ بڑے سکون سے بولا: ''یہ جوتے میرے نہیں ہیں۔''

استانی کا جی چاہا کہ وہ رو دے، مگر پھر وہ خود پر قابو پا کر بچے کے جوتے اُتارنے لگی۔ جوتے اُتار کر کمر سیدھی کر رہی تھی کہ بچہ بولا: ''یہ جوتے میرے بھائی کے ہیں، مگر ممی نے کہا تھا کہ یہ آج تم پہن کر چلے جاؤ۔''

مرسلہ: مہک اکرم، لیاقت آباد

😃 ایک غائب دماغ پروفیسر اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر پہنچے اور بہت دیر تک اس کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے۔ کھانے کا وقت ہو گیا تو انھوں نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ پھر

شطرنج کی بساط بچھ گئی۔ کئی گھنٹے بعد جب پروفیسر صاحب رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر نے پوچھا: ”گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟“

پروفیسر صاحب نے چونک کر جواب دیا: ”خوب یاد دلایا آپ نے۔ دراصل میں آپ کے پاس اس لیے آیا تھا کہ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔“

مرسلہ: نیلوفر عابد، راولپنڈی

☺ ایک مقدمے میں جرح کے دوران وکیلِ صفائی نے گواہ سے پوچھا: ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم واردات کی جگہ سے کتنے فاصلے پر تھے؟“

گواہ نے جواب دیا: ”جی ہاں جناب! میں وہاں سے تین میٹر، پندرہ اعشاریہ سات سینٹی میٹر کے فاصلے پر تھا۔“

وکیل نے حیرت سے پوچھا: ”لیکن تم نے اس قدر صحیح اندازہ کیسے قائم کیا؟“

گواہ بولا: ”مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی بے وقوف مجھ سے یہ احمقانہ سوال ضرور کرے گا، اس لیے میں نے پہلے ہی فاصلہ ناپ لیا تھا۔“

مرسلہ: حامد علی، گل بہار

☺ ایک دوست: ”ہمیں اپنے گاؤں میں کھدائی کے دوران ٹیلے فون کے تار ملے ہیں، یعنی میرے گاؤں میں ٹیلے فون کا نظام ایک ہزار سال پہلے بھی تھا۔“

دوسرا دوست: ”تم صرف ٹیلے فون کی بات کرتے ہو، ہمارے گاؤں میں تو ایک ہزار سال پہلے وائرلیس سسٹم بھی تھا۔“

”وائرلیس سسٹم!“

”ہاں، اس لیے کہ ہمیں کھدائی میں کوئی تار نہیں ملا۔“

مرسلہ: دوست محمد، پرانا سکھر

☺ ایک خاتون نے مشہور فلم ڈائرکٹر الفریڈ ہچکاک کو خط لکھا: ”میرا بیٹا بہت خوب صورت ہے۔ عمر ستر سال ہے، قد پانچ فٹ، پانچ انچ اور وزن ایک سو بیس پاؤنڈ ہے۔ کیا آپ کی کسی فلم میں اسے کام مل سکتا ہے؟“

ہچکاک نے جواب لکھا: ”محترمہ! یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ آپ اپنے بیٹے کی چوڑائی لکھنا بھول گئیں۔“

مرسلہ: ماہ نور یاسر، لیاقت آباد

☆☆☆

بیت بازی

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایمان
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

شاعر: الطاف حسین حالی — پسند: الطاف اللہ لطف، کاگڑہ دھیلدر

یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی ہے عدیم
بھول جانے کے سوا اب کوئی بھی چارہ نہ تھا

شاعر: عدیم ہاشمی — پسند: بروینہ ناز، کراچی

اتنے سراب دیکھے ہیں آنکھوں نے عمر بھر
دریا بھی اب نگاہوں میں دریا نہیں رہا

شاعر: ظفر اقبال ظفر — پسند: اسامہ کامران، فیصل آباد

میں سوچتا ہوں رات کی تنہائی میں اکثر
مجھ سے کسی انساں کو شکایت تو نہیں ہے

شاعر: آصف رضا رضوی — پسند: کوثر ریحان، بلدیہ ٹاؤن

مہدی مری دعا ہے، وہ سورج طلوع ہو
امن و اماں کی روشنی پائیں جہاں سے ہم

شاعر: سید ظہور مہدی — پسند: سہیل احمد، خوشاب

اگر ہو کچے گھروندوں میں آدمی آباد
تو ایک ابر بھی سیلاب کے برابر ہے

شاعر: حمید اللہ علیم — پسند: میرا واثق، میر پور خاص

وہ کیا جانیں کھلے میدان کی نیندوں کا مزہ
جن کی شب کٹتی ہے شیشوں کے شبستانوں میں

شاعر: سخاوت علی جوہر — پسند: شائلہ خاور، کراچی

جہاں میں ایسے بھی ناداں کسی نے دیکھے ہیں
چراغ ہاتھ میں ہے، گفتگو ہوا سے ہے

شاعر: غلام غوث — پسند: اسلام الدین، راولپنڈی

غم ابھی کچھ کم ہیں، مجھ کو آزمانے کے لیے
مل ہی جاتے ہیں بہانے، مسکرانے کے لیے

شاعر: ضیا القدوس ہاشمی — پسند: زریاں طارق، نارتھ کراچی

میں ہی تنہا نہیں ضرورت مند
آپ کو بھی مری ضرورت ہے

شاعر: رشید اثر — پسند: عائشہ اقبال، کراچی

ایک چنگاری کا گھر میں تھا وجود
یہ خطا ساری ہواؤں کی نہیں

شاعر: سید آفاق جعفری — پسند: واجد امتیاز، لانڈھی

کچھ اہلِ گلستاں نے مجھے بخشے ہیں کانٹے
کچھ مجھ کو الجھ جانے کی عادت بھی بہت ہے

شاعر: عالم عظیم آبادی — پسند: سدرہ آصف، کراچی

مفلسی میں جس کے بھی گھر پر گیا
بند اس کے گھر کا دروازہ ملا

شاعر: دوست شاہجہاں پوری — پسند: کاشان عادل، کورنگی

گلیوں میں پتھر بھی ہیں اور اہلِ جنوں بھی
بچوں ہی کو فرصت نہ رہی سنگ زنی کی

شاعر: نظام اجمی — پسند: احمد یار خان، کوہاٹ

اِدھر اُدھر سے

ولی اور چودھری

مرسلہ : یسریٰ اسلم، شریف آباد

میاں شیر محمد شرقپوریؒ کی خانقاہ میں حاضری دینے ایک گاؤں کا چودھری اپنے نوکر کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں چودھری اپنے نوکر سے بولا: ''آج اگر میاں صاحب مجھے پلاؤ کھلائیں، تب میں ان کو ولی مانوں گا۔''

چودھری کا نوکر بولا: ''چودھری صاحب! اولیا کرام کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ وہ خود کچھ دکھادیں تو اور بات ہے۔''

جب دونوں حضرت صاحب کے پاس گئے تو میاں شیر محمد شرقپوری نے اپنے مرید سے کہا: ''بھائی چودھری صاحب کو پلاؤ کھلاؤ، ورنہ ہماری ولایت خطرے میں پڑ جائے گی۔''

پھر نوکر سے بولے: ''چوں کہ تم نے کوئی خواہش نہیں کی تھی، اس لیے تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ، کیوں کہ تم چودھری کے نوکر ہو، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نوکر ہوں۔'' یہ سن کر چودھری کی آنکھیں کھلیں اور آپ کا مرید ہوگیا۔

قل ھو اللہ

مرسلہ : عائشہ ناصر، کراچی

ایک مرتبہ مشہور شاعر اکبر الہ آبادی کے ایک دوست نے ایک ٹوپی دکھائی، جس پر ''قل ھو اللہ'' لکھا تھا۔ اکبر الہ آبادی نے دیکھتے ہوئے فرمایا: ''بہت عمدہ ہے۔ کسی دعوت میں کھانا ملنے میں دیر ہو جائے تو یہ ٹوپی پہن لیا کریں، سب سمجھیں گے کہ آپ کی انتڑیاں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔''

نام بدل یا کام بدل

مرسلہ : رخسار اکرم، لیاقت آباد

سکندر اعظم کے روبرو ایک ایسا سپاہی پیش ہوا، جس کا نام بھی سکندر تھا، لیکن بزدل بہت تھا۔ ہمیشہ میدانِ جنگ سے فرار ہو کر اپنے خیمے میں روپوش ہو جاتا۔ سکندر اعظم نے اس سے پوچھا: ''تمھارا نام؟''

سپاہی نے جواب دیا: ''سکندر۔''

سکندر اعظم نے افسوس سے اپنا فیصلہ سنا ''تب پھر تم میرا فیصلہ سن لو۔ تم ہماری سپاہ اسی وقت رہ سکتے ہو جب یا تو تم اپنا نام دو گے یا پھر اپنا کام۔''

دس من کا پتھر

مرسلہ : ثنا اکرم، ملتان

ایک پہلوان غصے میں بپھرا ہوا منہ سے اگ نکال رہا تھا۔ سامنے سے شیخ سعدیؒ رے، پوچھا: ''یہ شخص اتنا برہم کیوں ہے؟'' کسی نے جواب دیا: ''پہلوان کو ایک س کوئی تلخ بات کہہ کر چلا گیا ہے۔''

شیخ سعدیؒ نے افسوس سے کہا: ''پہلوان! پر افسوس کرنے کو جی چاہتا ہے کہ تو دس من پتھر تو آسانی سے اُٹھا لیتا ہے، لیکن ایک ت کا وزن اُٹھانے کی تاب نہیں رکھتا۔''

درباری چور

مرسلہ : عبدالرافع، کراچی

ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار حاضرین کی تواضع شربت سے کی جارہی تھی۔ پیالے سونے کے تھے۔ ایک درباری نے چپکے سے ایک پیالہ اپنی آستین میں چھپا لیا۔ خلیفہ نے اسے دیکھ لیا۔ جب محفل ختم ہونے لگی تو منتظم نے آواز دی کہ کوئی درباری باہر نہ جائے، کیوں کہ ایک پیالہ گم ہو گیا ہے۔

خلیفہ نے کہا: ''سب کو جانے دو، کیوں کہ جس نے چُرایا ہے، وہ مانے گا نہیں اور جس نے دیکھا ہے، وہ بتائے گا نہیں۔''

شاہ عباس کا سفیر

مرسلہ : قضا فاروق، غریب آباد

شاہ جہاں کے دربار میں جب ایرانی سفیر حاضر ہوتا تو اکثر آداب کا خیال نہ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ شاہ جہاں نے سفیر سے سختی سے کہا: ''اے بدبخت! شاہ عباس کے دربار میں کوئی شریف آدمی نہ تھا جو تجھ جیسے خر دماغ کو میرے پاس بھیجا ہے؟''

اس نے فوراً جواب دیا: ''کیوں نہیں، شاہ عباس کے دربار میں بہت سے مہذب اور لائق لوگ موجود ہیں، لیکن وہ ہر ایک کے مزاج کے مطابق سفیر بھیجا کرتا ہے۔'' ☆

ٹماٹر کی حیدر آبادی چٹنی

مرسلہ: شمیم بانو، بلال ٹاؤن، نارتھ کراچی

تیل : آدھا پاؤ	ٹماٹر سرخ : ایک کلو
ادرک پسی ہوئی : ایک کھانے کا چمچہ	رائی پسی ہوئی : ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ : ایک چائے کا چمچہ	سرخ مرچ پسی ہوئی : ایک چائے کا چمچہ
کلونجی : ایک چائے کا چمچہ	ہلدی پسی ہوئی : آدھا چائے کا چمچہ
میتھی دانہ پسا ہوا : آدھا چائے کا چمچہ	لہسن چھلا ہوا : دس دانے
کری پتا : ۲۰ پتے	ہری مرچ چھوٹی : ۱۵ عدد
ہرا دھنیا : آدھی گڈی	ثابت سرخ مرچ : ۶ سے ۷ عدد

لہسن پسا ہوا : ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب: پہلے تیل گرم کریں۔ اس میں پسا ہوا لہسن، پسی ہوئی ادرک، پسی ہوئی سرخ مرچ، ہلدی، رائی، میتھی دانہ ڈال دیں، پھر آدھا کپ پانی ڈال کر بھون لیں۔ اب اس میں ٹماٹر باریک کاٹ کر شامل کر دیں۔ جب ٹماٹر کا پانی آدھا رہ جائے تو اس میں چھلا ہوا لہسن، زیرہ، کلونجی، کری پتا، ہری مرچ، ثابت سرخ مرچ ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ جب تیل اوپر آ جائے تو ہرا دھنیا کاٹ کر ڈال دیں۔ لیجیے مزے دار حیدر آبادی چٹنی تیار ہے۔

فروٹ کھیر

مرسلہ: کنزۃ الایمان، اورنگی ٹاؤن، کراچی

سیب : ایک پاؤ	کیلے : چھے عدد
دودھ : ایک لیٹر	چاول (پسے ہوئے) : ایک پیالی
چینی : ایک کپ یا حسبِ ضرورت	بادام (پسے ہوئے) : ایک چائے کا چمچہ
کھوپرا (پسا ہوا) : ایک چائے کا چمچہ	پستہ : چند دانے

ترکیب: اُبلتے ہوئے دودھ میں پسے ہوئے چاول ملا دیں۔ جب چاول اور دودھ اچھی طرح یکجا ہو جائیں تو چینی بھی ڈال دیں۔ جب اچھی طرح پک جائیں تو سیب اور کیلے باریک کاٹ کر ملا لیں۔ دو منٹ پکا کر چولھا بند کر دیں اور بادام، کھوپرا اور پستہ شامل کر دیں۔ آپ کی مزے دار فروٹ کھیر تیار ہے۔ ٹھنڈا کرنے کے بعد خود بھی کھائیں اور مہمانوں کو بھی پیش کریں۔

مل کر کھانا کھانا صحت کے لیے مفید ہے

غذائی ماہرین نے کہا ہے کہ جو بچے اپنے خاندان کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں، وہ سمارٹ اور صحت مند رہتے ہیں۔ امریکی ماہرین نے تحقیقات کا جائزہ لیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ جو بچے اور نوجوان اپنے والدین کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں، وہ موٹاپے کا شکار نہیں ہوتے اور تن درست و توانا رہتے ہیں۔ والدین کو بچوں پر دھیان دینا چاہیے۔ ان کے کھانے پینے اور دن بھر کی سرگرمیوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ تحقیق میں ایک لاکھ اسی ہزار بچوں اور نوجوانوں (جن کی عمر تین سال سے سترہ سال کے درمیان تھی) کے کھانے پینے کا جائزہ لیا۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جو بچے اور نوجوان گھر پر اپنے خاندان کے ساتھ مل کر متوازن کھاتے ہیں، وہ موٹاپے کا شکار نہیں ہوتے اور تن درست و توانا رہتے ہیں۔ تلی ہوئی چیزوں اور گوشت کے زائد استعمال سے مختلف بیماریاں جنم لے سکتی ہیں۔ ☆

فلپائن میں تیرتا ہوا کتب میلا

فلپائن میں پانی کے ایک جہاز پر کتابوں کا میلا سجایا گیا، جس میں مطالعے کے شوقین افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس کتب میلے میں ادب، سائنس، افسانوں اور دیگر موضوعات پر مختلف زبانوں کی ۵۰۰۰ سے زائد کتابیں رکھی گئیں، جو رعایتی قیمت پر فروخت کی گئیں۔ جہاز پر ہزاروں کی تعداد میں مطالعے کے شوقین افراد میلا دیکھنے آئے۔ میلے میں بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی دل چسپی کے لیے چہرے پر تصویریں بنانے اور مختلف رنگوں کے استعمال کی مہارت کے مقابلوں کا اہتمام بھی کیا گیا۔ ☆

بندر برتن بھی مانجھ سکتے ہیں

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ بندر شرارتیں کرنے میں سب سے آگے ہوتے ہیں اور انسانوں

کے بنے بنائے کام بگاڑ کر لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن بولیویا میں ایک ایسی سگھڑ بندریا بھی ہے، جس نے برتن مانجھنے شروع کر دیے ہیں۔ PETE نامی اس بندریا نے اس جنگل میں آدمی کو برتن دھوتے دیکھا اور پھر نقل میں ماہر اس بندریا نے اپنے درمیان موجود اس آدمی کا بتانے کے لیے اس کے برتن مانجھنے شروع کر دیے۔ یہ بندریا اپنے ننھے بچے کو اپنی کمر کے ساتھ کر برش کی مدد سے برتن رگڑ رگڑ کر دھوتی ہے۔

جسمانی طور پر چست بچے پڑھائی میں تیز

جسمانی طور پر چاق چوبند بچوں کی کارکردگی پڑھائی میں دیگر بچوں کے مقابلے میں اچھی ہوتی ہے۔ ہالینڈ میں کی جانے والی ایک تازہ تحقیق کے مطابق ماہرین کا کہنا اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ کھیل کود اور ورزش میں حصہ لینے والے بچے دوسرے بچوں نسبت زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ ورزش سے دماغ کو خون اور آکسیجن کی فراہمی ہوتی ہے اور خلیے بنانے میں بھی مدد ملتی ہے، جس کی وجہ سے دماغ بہتر طور پر کام کرتا اور فعال رہتا ہے۔

ویڈیو گیم کا زیادہ استعمال بچوں کے لیے نقصان دہ

ٹیکنالوجی کے اس دور میں ویڈیو گیم بچوں کا سب سے پسندیدہ مشغلہ ہے، لیکن نئی تحقیق مطابق زیادہ ویڈیو گیم کھیلنا بچوں کی ذہنی صحت کے لیے اچھا نہیں۔ پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں تقریباً ۳۰۰۰ بچوں پر ۲ سال تک تحقیق کی گئی۔ تحقیق کے بعد بین الاقوامی ماہرین نے یہ نتیجہ نکالا بچے ویڈیو گیمز کھیلنے میں زیادہ وقت گزارتے ہیں، ان میں ڈپریشن بڑھ جاتا ہے اور وہ دوسروں ملنے جلنے سے گھبراتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو دن میں ایک گھنٹے سے زیادہ ویڈیو گیمز کھیلنے، کمپیوٹر استعمال کرنے یا ٹی وی دیکھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ جدید ٹیکنالوجی نے جہاں کئی سہولتیں دی ہیں، وہاں اس نے کئی مسائل بھی پیدا کر دیے ہیں۔ والدین ٹیکنالوجی کی اس ترقی سے خوف زدہ آتے ہیں۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں پانچ سے پندرہ سال عمر کے ۸۰ فی صد باقاعدگی سے انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں، لیکن ۶۱ فی صد والدین اپنے بچوں کی مناسب نگرانی قاصر ہیں اور نہ انھوں نے اپنے بچوں کو نقصان دہ ویب سائٹس سے بچانے کی کوشش کی ہے۔

تجسس سے بھرپور سنسنی خیز مکمل ناول

موت کا گڑھا

اشتیاق احمد

دروازے کی گھنٹی نے بیگم حازم کو چونکا دیا۔ فوراً ان کے منھ سے نکلا: ''لو بیٹا! ہو گیا کھانے کا بندوبست، اللہ تعالیٰ نے بھیج دیا کسی سخی کو......''

ایاد نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا، پھر اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بولا: ''کیسی باتیں کرتی ہیں ماں جی! رات کے ساڑھے دس بجے کون سا پڑوسی کھانا لائے گا۔ یہ تو الٹا کوئی ضرورت مند ہوگا۔ اب اس بے چارے کو کیا معلوم کہ آج مہینے کی آخری تاریخ ہے اور اس گھر میں پنشن کے پیسے آخری دن سے بھی پہلے ختم ہو جاتے ہیں۔ خیر، میں دیکھتا ہوں۔''

یہ کہہ کر ایاد اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اس وقت ایک کمرے میں ہی موجود تھے۔

''بھائی جان! دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھ لینا، کہیں باہر کوئی چور ڈاکو نہ ہو۔'' اس کی چھوٹی بہن بول اٹھی۔

''کیسی بات کرتی ہو رابیہ! ہمارے گھر میں ہے ہی کیا کہ کوئی چور یا لٹیرا یہاں آئے گا۔ یہ لوگ پہلے معلومات حاصل کرتے ہیں، پھر کوئی واردات کرتے ہیں۔'' ایاد نے منھ بنایا۔

''لیکن پھر بھی بھائی جان! رات کا وقت ہے، احتیاط اچھی ہے۔'' رابیہ سے چھوٹا بھائی رفیق بول پڑا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' ایاد نے گردن کو جھٹکا دیا اور پھر دروازے پر پہنچ کر بولا: ''جی، کون صاحب ہیں؟''

''پولیس ۔ دروازہ فوراً کھولو، دیر نہ لگانا۔'' باہر سے بارعب آواز میں کہا گیا۔

''کیا کہا...... پولیس؟ یہاں پولیس کا کیا کام۔''

''دروازہ کھولو گے تو کام بتائیں گے۔''

اس نے پریشان ہو کر اپنی والدہ اور بہن بھائی کی طرف دیکھا، پھر بولا: ''امی! باہر پولیس ہے۔''

''تو کھول دو دروازہ۔ ہم کوئی چور ہیں جو پولیس سے ڈریں۔ کسی بھاگے ہوئے مجرم کی تلاش میں ہوں گے۔'' بیگم حازم بولیں۔

''جی اچھا۔'' ایاد نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر پانچ پولیس والے نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک گنجے سر والا شخص بھی تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک گول سا ٹیکا سرخ رنگ کا لگایا گیا تھا۔ وہ کُرتے اور شلوار میں ملبوس تھا۔ کُرتے پر واسکٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔

''جی فرمایئے۔''

''اندر آ کر بتاتے ہیں۔'' سب سے آگے کھڑے ہوئے سپاہی نے کہا اور ساتھ ہی وہ سب اندر آ گئے۔ انھوں نے ایک نظر بیگم حازم اور تینوں بچوں پر ڈالی، پھر ایک سپاہی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

''آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کو اس طرح اندر نہیں آنا چاہیے تھا۔'' بیگم حازم نے برا سا منہ بنایا۔

''ہم معافی چاہتے ہیں۔ آپ پہلے ہماری بات سن لیں۔'' سب سے آگے کھڑے ہوئے پولیس والے نے کہا۔ وہ باقی چار کا افسر لگ رہا تھا۔

''اچھی بات ہے، بتایئے، کیا بات ہے؟''

''کیا آپ ہمیں بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہیں گی؟ بات بتانے میں کچھ تو وقت لگے گا۔''

''ایاد! رفیق! اندر سے کرسیاں نکال لاؤ۔''

وہ دوڑ کر گئے اور کرسیاں نکال لائے۔ اب پولیس والے اور ان کا ساتھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ ایک چارپائی کی پٹی پر ٹک گئے۔ اس وقت پولیس آفیسر نے کہا: ''میرا نام انسپکٹر وریاب ہے۔ یہ چاروں میرے ماتحت ہیں اور یہ صاحب ہیں، نتھو رام۔''

''جی کیا کہا؟ نتھو رام!'' بیگم حازم چونک کر بولیں: ''آپ کا مطلب ہے، یہ ہندو ہیں۔''

''ہاں! یہ ہندو ہیں۔ بھارت سے آئے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے یہ اس گھر میں رہتے تھے۔ یہ گھر ان کا تھا۔ انھوں نے یہاں آ کر حکومت کو ایک درخواست دی ہے۔''

''درخواست؟'' ان کے منہ سے حیرت کے عالم میں نکلا۔

''جی ہاں! درخواست۔ ان کے والد اور گھر والے یہاں سے ہندستان گئے تھے۔ ان کے پاس بہت دولت تھی۔ انھوں نے وہ دولت اس گھر میں گڑھا کھود کر دبا دی تھی، اس خوف سے کہ کہیں ان کی دولت لوٹ نہ لی جائے۔ وہ ہنگاموں کے دن تھے۔ سب لوٹ مار ہو رہی تھی، اس لیے اس بات کا امکان تھا کہ کہیں راستے میں یہ اپنی دولت گنوا نہ بیٹھیں، سو یہ اپنی دولت یہاں دبا کر چلے گئے۔ اب یہ وہ دولت نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ قانون نے انھیں اس بات کی اجازت دی ہے۔ حکومت کی طرف سے اجازت ملنے کے بعد یہ اس علاقے کے تھانے میں آئے۔ کیوں کہ قانون کی مدد کے بغیر یہ اپنی دولت زبردستی نکال نہیں سکتے تھے، پھر انھیں ان کی دولت سمیت سرحد تک پہنچانا بھی ہماری ذمے داری ہے۔ کیا آپ لوگ ساری بات سمجھ گئے؟''

''جی ہاں! اگر اس مکان میں ان کی دولت دفن ہے اور حکومت نے انھیں وہ نکال کر لے جانے کی اجازت دی ہے تو یہ ان کا حق ہے، نکال لیں اپنی دولت۔'' بیگم

حازم نے فوراً کہا۔

''شکریہ بیگم صاحبہ! کیا یہ آپ کا ذاتی مکان ہے؟'' انسپکٹر وریاب نے پوچھا۔

''جی نہیں، ہم نے تو یہ مکان کرائے پر لیا ہے۔ اس مکان کا مالک یہاں سے ... فاصلے پر رہتا ہے۔''

''خیر، ان کی ضرورت نہیں۔ بعد میں کوئی ضرورت پیش آئی تو انھیں بھی بلا لے آئیں گے، تاکہ بعد میں وہ آپ کو پریشان نہ کر سکیں۔''

''جی، ٹھیک ہے۔'' بیگم حازم بولیں: ''لالہ جی! اب آپ بتائیں، آپ نے اپنی دولت کہاں دفن کی تھی؟''

''پچھلے کمرے کے صحن میں۔''

''ٹھیک ہے، اب یہاں کھدائی کرنے والوں کو بلانا ہو گا یا میں پولیس والوں کے ذریعے سے کھدائی کرالوں، آپ کو انھیں انعام دینا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے، میں انھیں انعام دوں گا۔''

بیگم حازم کچھ سوچ کر بولیں: ''ایک منٹ انسپکٹر صاحب! کیا یہ بہتر نہیں رہے گا کہ مالک مکان کو بلا لیا جائے۔ وہ بعد میں ہم پر اعتراض کریں گے۔ میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ غریب ہوں، کم زور ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہمیں اپنے مکان سے نکال باہر کریں۔ آج کل کرائے کے مکانات ملنا بھی اتنا آسان نہیں۔''

''میری بہن! ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ ان کی یہاں ضرورت نہیں، کیوں کہ اگر وہ بھی یہاں ہوں، تب بھی حکومت کا حکم تو ماننا ہی پڑے گا۔ یہ دیکھیے، میرے پاس حکومت کا حکم نامہ ہے۔'' اس نے جیب سے ایک سرکاری کاغذ نکال کر ان کے سامنے کر دیا۔ اس پر حکومت کی مہر لگی نظر آئی۔

''انسپکٹر صاحب! میں یہ نہیں کہہ رہی کہ آپ کھدائی نہ کرائیں۔ میں نے تو ایک بات کہی تھی۔ اگر آپ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے تو کوئی بات نہیں۔ ہمارا کام تو قانون کے محافظوں کی مدد کرنا ہے۔'' بیگم حازم نے پر سکون لہجے میں کہا۔

''شکریہ محترمہ! آپ بہت اچھی خاتون ہیں۔ ضرورت ہوئی تو ہم مالک مکان کو بھی بلا لیں گے۔'' انسپکٹر وریاب نے مسکرا کر کہا۔

''اچھی بات ہے۔'' بیگم حازم کے منھ سے نکلا۔

انسپکٹر نے کہا: ''نواز! دو پھاوڑوں اور دو کدالوں کی ضرورت پڑے گی۔''

نواز بولا: ''سر! آپ نواز کو کیا سمجھتے ہیں۔ میں نے یہ چیزیں پہلے ہی گاڑی میں رکھوا دی تھیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

نواز ایک دوسرے کانسٹیبل کے ساتھ باہر چلا گیا۔ جلد ہی وہ کدالیں اور پھاوڑے گاڑی میں سے نکال کر لے آئے تھے۔

''یہ معاملہ ہے لمبے چوڑے مال کا، سونے کے زیورات کا، اس لیے احتیاطاً ہمیں بیرونی دروازہ بند کر دینا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے سر!'' نواز نے کہا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

اب وہ پچھلے کمرے میں آئے۔ انسپکٹر وریاب نے نتھو رام سے پوچھا: ''یہی کمرا ہے؟''

''ہاں جناب! یہی کمرا ہے۔''

''کھدائی شروع کرو بھئی۔ نتھو رام! آپ فرش پر انگلی رکھ کر بتا دیں، تاکہ عین اسی جگہ کھدائی کرائی جائے۔''

''جی اچھا!'' یہ کہہ کر نتھو رام آگے بڑھا اور اس نے فرش پر انگلی رکھ دی۔

"بس ٹھیک ہے، اب آپ پیچھے آجائیں۔"

اس کے بعد کھدائی شروع ہوگئی۔ ایسے میں انیق کی آواز سنائی دی: "امی جان! مجھے بھوک لگی ہے۔ میں باورچی خانے میں جا کر کچھ لے آؤں۔"

"ہاں بیٹا! جاؤ۔" بیگم حازم بولیں۔

انیق جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ انسپکٹر وریاب بول پڑا: "نہیں بھئی، آپ سب لوگ یہیں رہیں۔ کچھ دیر صبر کریں، پھر ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔ نتھو رام جی ہماری شاندار دعوت کریں گے۔ کیوں نتھو رام صاحب؟"

"فکر نہ کریں، انسپکٹر صاحب! یہ کام ہو جائے تو میں آپ سب کو خوب کھلاؤں پلاؤں گا اور انعام بھی دوں گا۔"

"شکریہ جناب!" انسپکٹر وریاب نے خوش ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹے! کچھ دیر انتظار کرلیں، گڑھا کھدنے میں دیر ہی کتنی لگے گی۔"

"جی اچھا امی جان!"

کھدائی جاری رہی۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ ابھی تک دولت کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔

"امی! مجھے واش روم جانا ہے۔" ایاد نے پریشان آواز میں کہا۔

"تو جاؤ بیٹا! کس نے روکا ہے۔" بیگم حازم بولیں۔

ایاد اُٹھا اور کمرے سے نکلنے لگا۔

"نہیں بھئی، تم نہیں جاسکتے۔" انسپکٹر وریاب بول پڑا۔

"جی ...... کیا مطلب؟" ایاد چونکا۔

"ابھی اس کمرے سے کوئی باہر نہیں جاسکتا۔ یہ معاملہ بہت خفیہ رکھنے کی ضرورت

ہے۔ کسی کو بھنک پڑ گئی تو معاملہ گڑبڑ ہو سکتا ہے، اسی لیے تو ہم رات کو آئے ہیں۔"

"لیکن انسپکٹر انکل! معاملہ ضروری حاجت کا ہے۔ میں یہاں سے بیت الخلا تک ہی جاؤں گا، وہاں سے سیدھا یہاں آجاؤں گا۔ اگر آپ کے خیال میں اس طرح کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے تو آپ اپنے کسی ماتحت کو ساتھ کر دیں۔ وہ بیت الخلا کے باہر کھڑے ہو جائیں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، نواز! تم ان کے ساتھ جاؤ۔"

"شکریہ انکل!" ایاد نے فوراً کہا۔

انسپکٹر وریاب نے سر ہلایا اور ایاد، نواز کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ اندر کھدائی جاری رہی۔ گڑھا آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جارہا تھا۔

دو منٹ بعد، ایاد نواز کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔

"لیجیے انکل! میں آگیا۔" ایاد نے مسکرا کر کہا۔

"شکریہ! تم بہت اچھے بچے ہو۔ تم سب بہت اچھے ہو۔ ہمارے ساتھ خوب تعاون کر رہے ہو۔ میں نتھو رام جی سے درخواست کروں گا کہ جانے سے پہلے تم لوگوں کو کچھ انعام دے کر جائیں۔"

"ہاں ہاں! کیوں نہیں، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔"

ایاد نے دیکھا، گڑھا اب مزید گہرا ہو گیا تھا۔ کسی دفن شدہ مال کے آثار دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔ ایسے میں دروازے پر ہونے والی دستک نے ان سب کو بری طرح چونکا دیا۔ نتھو رام اور انسپکٹر وریاب نے سوالیہ انداز میں ایاد وغیرہ کی طرف دیکھا۔ پھر انسپکٹر نے دبی آواز میں پوچھا: "یہ اس وقت کون آگیا؟" یہ کہتے ہوئے اس کے دانت بج اُٹھے۔ سردی بہت شدید تھی۔

"پتا نہیں انکل! یہ تو معلوم کرنا پڑے گا۔"

''اچھا تم دروازے پر جاؤ اور پوچھو، کون ہے۔ دروازہ نہ کھول دینا۔ کہنا رات کا وقت ہے اور ہم اکیلے ہیں، لہٰذا دروازہ نہیں کھولا جا سکتا۔ آپ جو کوئی بھی ہیں، صبح آجائیں۔ ٹھیک ہے، سمجھ گئے۔''

''جی انکل! بالکل سمجھ گیا۔''

''تم، تم واقعی بہت سمجھ دار ہو۔'' انسپکٹر وریاب نے خوش ہو کر کہا۔

''شکریہ انکل!''

عین اسی وقت دستک دوبارہ ہوئی اور ایاد فوراً دروازے کی طرف چل پڑا۔ اس وقت انسپکٹر وریاب خان نے کہا: ''نواز! تم اس کے ساتھ رہو۔''

''جی اچھا انسپکٹر صاحب!'' اس نے کہا اور ایاد کے پیچھے چلا گیا۔

کھدائی کرنے والے دستک کی آواز کے ساتھ ہی رک گئے تھے۔ گڑھے کے اندر ساکت کھڑے ہو گئے تھے۔ ان سب کے کان دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے۔

انھوں نے ایاد کی آواز سنی، وہ کہہ رہا تھا: ''کون صاحب؟''

''ایاد! یہ تم ہو، میں ہوں تمھارا پڑوسی امداد اللہ۔''

''انکل آپ؟ امداد انکل!''

''ہاں بیٹا! جلدی سے دروازہ کھولو، تمھاری چچی کی طبیعت سخت خراب ہو گئی ہے۔ تمھارے ہاں پیٹ درد کی بہت اچھی دوا ہوتی ہے نا، بس وہی چاہیے۔''

''آپ ٹھیریں انکل! میں دوا اُٹھا لاتا ہوں۔''

''ارے بھئی، دروازہ تو کھول دو نا۔''

''انکل! رات کا وقت ہے، ڈر لگتا ہے۔ آپ یہیں ٹھیریں، میں دوا لے آتا ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، جلدی کرو۔''

ایاد، انسپکٹر وریاب کے نزدیک آیا اور دھیمے لہجے میں پوچھا: ''اب میں کیا کروں؟''

انسپکٹر وریاب نے بھی اسے سرگوشی میں سمجھایا: ''تم دوا پکڑا دو۔ بس دروازہ ذرا سا کھولنا اور ہاتھ باہر نکال دینا۔ پھر فوراً ہی ہاتھ اندر کرتے ہوئے دروازہ بند کر دینا۔''

''میں سمجھ گیا۔'' ایاد نے کہا اور جلدی سے اندرونی کمرے میں آیا۔ اس نے جلدی سے الماری کھولی۔ ایک لمحے کے لیے دروازے کی طرف دیکھا۔ باقی لوگ ساتھ والے کمرے میں تھے۔ اس کمرے کے دروازے سے وہ اسے یا انھیں وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

چند لمحے بعد ہی وہ ایک پڑیا لیے ہوئے باہر آ گیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''ایک منٹ، دوا ایک نظر مجھے بھی دکھا دو۔'' انسپکٹر وریاب کی آواز سنائی دی۔

ایاد رک کر اس کی طرف مڑا اور پڑیا اس کی طرف بڑھا دی۔

انسپکٹر وریاب نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی، پھر مسکراتے ہوئے بولا: ''ٹھیک ہے، تم پڑیا دے دو۔''

ایاد دروازے پر آیا۔ چٹخنی گرائی اور ذرا سا دروازہ کھول کر ہاتھ باہر نکال دیا۔

جونہی دروازہ تھوڑا سا کھلا، باہر سے دباؤ ڈالا گیا اور فوراً ہی ایک پتلا دبلا سا لمبے قد کا آدمی اندر آ گیا۔ دیکھنے میں وہ کم زور سا تھا۔

''یہ...... یہ کیا...... یہ کون ہے؟'' اندر آنے والا نواز کو دیکھ کر چلا اُٹھا۔

''انکل! یہ ہیں ہمارے مہمان۔ رات کا وقت تھا نا اس لیے میں دروازے پر انھیں ساتھ لے آیا۔''

''لیکن، بھئی میں نے اندر سے کچھ آوازیں آتی سنی ہیں۔''

''خبردار! ہاتھ اوپر اُٹھاؤ، منھ سے آواز نکالی تو میں گولی چلا دوں گا۔ یہ بھی سن لو، یہ پستول بے آواز ہے۔ تمھاری لاش ضرور گرے گی، لیکن گولی چلنے کی آواز ذرا بھی سنائی

نہیں دے گی۔''

نواز کے الفاظ نے سنسنی کی لہر دوڑا دی۔

ایاد اور امداد اللہ سکتے میں آ گئے۔ ادھر اندر بھی آواز پہنچ چکی تھی، اس لیے بیگم حازم، رائبہ اور انیق کے بھی رنگ اُڑ گئے۔

''چپ چاپ اندر چلو۔''

''یہ، یہ سب کیا ہے ایاد؟''

''مجھے افسوس ہے انکل! مجھے نہیں معلوم تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی، ورنہ میں......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''ورنہ میں...... کیا؟'' نواز چونکا۔

''نواز! انھیں اندر لے آؤ۔ وہاں کھڑے رہ کر باتیں کرنا مناسب نہیں۔'' اندر سے انسپکٹر وریاب کی آواز سنائی دی۔

''بہت بہتر جناب! چلو اندر۔'' نواز نے پستول والا ہاتھ لہرایا۔ اس کے لہجے سے سفاکی جھلک رہی تھی۔

اب وہ اندر آ گئے۔ پستول دیکھ کر بیگم حازم، رائبہ اور انیق کانپنے لگے۔

''یہ...... یہ کیا انکل وریاب! آخر اس معاملے میں پستول نکالنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ پہلے بھی تو آپ اپنا کام اس کے بغیر کر رہے تھے۔''

''اب اس معاملے میں تمھارے پڑوسی جو شامل ہو گئے ہیں۔ کس نے کہا تھا، انھیں یہاں آنے کے لیے۔'' انسپکٹر وریاب نے جھلا کر کہا۔

''مجھے کسی نے نہیں کہا۔ میری بیوی کے پیٹ میں درد ہے۔ میں تو دوا لینے کے لیے آیا تھا۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں کوئی اور کام ہو رہا ہے۔''

''تمھاری قسمت! ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' انسپکٹر وریاب نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

ایاد نے کہا: ''کیا مطلب! یہ کیا کہا آپ نے؟''

''مطلب ابھی بتائیں گے، پہلے یہ بتاؤ، تم نے انھیں کس طرح اطلاع دی؟''

''جب آپ لوگوں نے دستک دی تھی تو ہم نے سوچا تھا، کہیں کوئی مشکل نہ پیش آ جائے، لہٰذا میری امی اپنا موبائل غسل خانے میں رکھ آئی تھیں، اسی لیے میں بہانے سے اندر گیا تھا اور دراصل اس وقت میں نے انھیں فون کیا تھا۔''

''لیکن تم نے خطرے کا اندازہ کس طرح لگا لیا؟''

''ہم اکیلے ہیں نا، ایسے اندازے لگانے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔'' ایاد اُداس انداز میں بولا۔

''تم نے یہاں آنے سے پہلے کیا کیا؟ کسی کو فون کیا؟'' انسپکٹر وریاب خان، امداد اللہ سے بولا۔

''نہیں! مجھے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ میں کوئی کم زور آدمی نہیں ہوں۔'' امداد اللہ نے منھ بنایا۔

امداد اللہ کی بات سن کر وہ سب کے سب ہنسنے لگے۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' امداد نے اور زیادہ منھ بنایا۔

''دبلے پتلے اور کم زور سے تو ہو، رنگ بھی زرد سا ہے تمھارا اور کہہ رہے ہو، میں کم زور نہیں، جب کہ ہم سب تمھارے مقابلے میں ہٹے کٹے ہیں۔'' انسپکٹر وریاب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس میں تو خیر شک نہیں کہ تم طاقت ور ہو، خیر اس بات کو چھوڑیں اور یہ بتائیں، یہ معاملہ کیا ہے۔''

"معاملہ اب گڑبڑ ہو گیا ہے۔ تم نہ آتے تو یہ بالکل سیدھا سادا اور آسان معاملہ تھا، لیکن اب ہمیں پروگرام بدلنا پڑ گیا ہے۔ پہلے تم ہمارے سوال کا جواب دو۔ اس لڑکے کا فون سننے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟ دیکھو، سو فیصد سچ بات بتانا، کیوں کہ غلط بیانی سے پورے دو گھروں کی زندگیاں خطرے میں پڑ سکتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اگر تم اپنے گھر کے کسی فرد کو کچھ بتا کر آئے ہو تو یہ بات بالکل سچ بتا دو اور یہ بھی کہ کیا بتا کر آئے ہو؟" انسپکٹر وریاب نے سرد آواز میں کہا۔

"اس لڑکے ایاد نے فون پر اتنا کہا تھا کہ انکل! ہمارے گھر میں کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔ آپ ذرا ادھر آجائیں۔ سارے گھر والے سوئے پڑے تھے۔ میں انھیں اسی حالت میں چھوڑ کر آ گیا۔"

"کیا یہ بات بالکل سچ ہے؟"

"ہاں! سو فیصد سچ ہے اور مجھے تو ابھی معلوم بھی نہیں کہ معاملہ کیا ہے اور یہ گڑھا کیوں کھودا جا رہا ہے؟" امداد نے پریشان آواز میں کہا۔

"تم کھدائی شروع کرو۔ ہاتھ نہ روکو، ہمیں جلد از جلد اپنا کام مکمل کر لینا چاہیے، کیوں کہ جو ہم نے سوچا تھا، عین اس طرح نہیں ہوا۔ یہ ہمدرد آدمی درمیان میں ٹپک پڑا۔ خیر، کوئی ایسی بات نہیں، یہ کون سا پہلوان ہے۔"

انھوں نے پھر کھدائی شروع کر دی۔ دوسری طرف ایاد، امداد اللہ کو تفصیل سنا رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر امداد اللہ نے کہا: "اس صورت میں تو یہ سارا کام قانونی بنتا ہے۔ اس کے لیے اسلحے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ ہمارا کام ہے، ہم جس طرح مناسب سمجھیں گے، کریں گے۔"

اس کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت ایک زوردار "ٹن" کی آواز ابھری تھی، جیسے کدال کسی سخت چیز سے ٹکرائی تھی۔

"یہ کیسی آواز تھی بھئی!" انسپکٹر گڑھے میں موجود ساتھیوں کی طرف مڑا۔

"لگتا ہے باس! ہم خزانے تک پہنچ گئے۔"

"عیش ہو گئے۔" نتھورام نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"وہ مارا۔" انسپکٹر وریاب نے مکا ہوا میں لہرایا۔

"ہاں باس! یہ خزانہ ہی ہے۔ پیتل کی ایک بڑی دیگ میں موجود ہے۔" گڑھے والے ایک ساتھی کی آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہے، دیگ نکال لو۔"

وہ دونوں دیگ کو اٹھا کر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد آخر ایک نے ہانپتے ہوئے کہا: "یہ، یہ نہیں نکل رہی۔ ابھی اس کے اردگرد سے مٹی ہٹانا پڑے گی، بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔"

"کیا ضرورت ہے، دیگ یونہی رہنے دو۔ اس میں سے مال نکال لو۔" نتھورام بولا۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" انسپکٹر وریاب نے فوراً کہا۔

"تب پھر ہم اسے خالی کر دیتے ہیں۔ آپ اوپر پکڑتے رہیں۔"

"اچھی بات ہے۔"

اب گڑھے میں موجود دونوں ساتھی دیگ کو خالی کرنے لگے۔ وہ ہاتھوں کی مدد سے اس میں سے زیورات اور جواہرات نکال نکال کر اوپر پکڑانے لگے۔ امداد اللہ، ایاد، اس کے بہن بھائی اور والدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ مارے

حیرت اور خوف کے رافیہ بول پڑی: ''امّی! اتنے بہت سے زیور!''

''ہاں بیٹی! لیکن یہ ہمارے نہیں، ان کے ہیں، لہٰذا ان کی طرف نہ دیکھو۔''

''جی اچھا امّی!'' رابعہ نے کہا اور آہستہ آہستہ اپنا سر گھمانے لگی۔ سر گھماتے ہوئے بھی اس کی نظریں زیورات پر سے ہٹ نہیں سکی تھیں۔

''لیکن امّی! انھیں دیکھنے میں کیا حرج ہے؟'' رفیق حسرت زدہ لہجے میں بولا۔

''نہیں بیٹا! دوسروں کے مال پر نظر نہیں ڈالنی چاہیے۔ یہ ان کا ہے، انھی کو مبارک ہو۔''

''اچھا امّی جان!'' انیق نے بھی اُدھر سے نظریں ہٹا لیں۔

اس وقت امداد اللہ کے چہرے پر شدید بے چینی تھی۔ پریشانی کے عالم میں وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ ان کی یہ بے چینی بیگم حازم سے چھپی نہ رہ سکی، انھوں نے پوچھ ہی لیا: ''بھائی امداد اللہ! آپ بہت بے چین نظر آ رہے ہیں؟''

وہ بولے: ''ہاں بہن! ان کے جملوں نے مجھے پریشان کر دیا، ان کے ارادے اچھے نہیں۔''

''کیا مطلب؟ یہ لوگ یہ ساری دولت لے کر چلے جائیں گے۔ ان کے ارادے اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتے ہیں اور ظاہر ہے، یہ حکومت کے ملازم ہیں، حکومتی حکم کے تحت آئے ہیں۔''

''اگر بات یہی ہوتی تو پھر کوئی پریشانی والی بات نہیں تھی، لیکن ......'' وہ کہتے کہتے رک گئے، کیوں کہ اسی وقت انسپکٹر وریاب اور نتھو رام نے ایک ساتھ ان کی طرف دیکھا تھا، جیسے سننا چاہتے ہوں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

''لیکن کیا؟'' بیگم حازم بولیں۔

''یہ پولیس والے نہیں ہیں۔ ان کے جسموں پر پولیس کی وردیاں ضرور ہیں، لیکن ان کا محکمۂ پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ چور، ڈاکو قسم کے لوگ ہیں۔''

''نن، نہیں ......!'' وہ چلا اُٹھے۔

انسپکٹر وریاب، نتھو رام اور ان کے باقی ساتھیوں کے چہروں پر مسکراہٹیں دوڑ گئیں۔

اُدھر امداد اللہ کہہ رہے تھے: ''اور ایاد کا فون سن کر میں نے خیال کیا تھا، کوئی معمولی بات ہو گی، لہٰذا میں بغیر کسی حفاظتی انتظام کے اِدھر چلا آیا اور میرے گھر والوں کو معلوم تک نہیں کہ اِدھر کیا ہو رہا ہے، کیوں کہ وہ سب گہری نیند سو رہے تھے۔''

''واہ! یہ ہوئی نا بات۔'' انسپکٹر وریاب نے چٹکی بجائی۔

''تب پھر انسپکٹر وریاب! یا جو بھی آپ کا نام ہے، یہ سب کیا چکر ہے؟''

''چکر؟ چلو خیر، تمھیں چکر بھی بتا دیتے ہیں۔ دراصل ہمارا تعلق ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے ہے۔ ہم جو بھی لوٹ مار کرتے تھے، اپنے اڈے پر اسے جمع کرتے رہتے تھے۔ ایک بار ہوا یہ کہ ایک ڈاکے کے دوران ہمارے کچھ ساتھی پکڑے گئے۔ اب ہمیں خوف محسوس ہوا کہ پکڑے جانے والوں سے پولیس ہر بات اُگلوا لے گی۔ ہم بھی پکڑے جائیں گے اور ساری دولت ہاتھ سے جائے گی۔ بس ہم نے راتوں رات ساری دولت اس گھر میں منتقل کر دی اور گڑھا کھود کر یہاں دفن کر دی۔ یہ گھر ایسے ہی کسی موقعے کے لیے ہم نے محفوظ رکھا تھا۔ اس گھر کا پتا گروہ کے سردار کے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔ اسی نے اسے کرایے پر لیا تھا۔ اس طرح پکڑے جانے والے ساتھیوں نے ہمارے اور ہمارے ٹھکانے کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا، پولیس اس سے کوئی مدد نہ لے سکی۔ نہ تو ہمیں گرفتار کر سکی، نہ لوٹا ہوا مال حاصل کر سکی۔ جب دو سال کی مدت گزر گئی اور پکڑے جانے والے ساتھیوں کو سزا ہو گئی اور وہ جیل جا چکے تھے تو ہم نے سوچا، اب اپنے مال کو نکال لینا چاہیے، لیکن یہاں

مشکل یہ پیش آئی کہ اس مکان میں اب ایک بیوہ اور اس کے تین بچے رہتے تھے، کیوں کہ
جب مالک مکان کو کرائے دار کی طرف سے کرایہ ملنے کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا تو اس نے
عدالت کے حکم کے ذریعے سے تالا توڑ دیا اور اور مکان کرائے پر دے دیا۔ اس طرح
لوگ اس مکان کے کرائے دار بن گئے۔ سوال یہ تھا کہ اب ہم اپنا مال کس طرح نکالیں؟
آخر یہ منصوبہ بنایا گیا۔ اپنے ایک ساتھی کو نتھو رام کا روپ دیا گیا۔ میں نے یعنی گروہ کے
سردار نے انسپکٹر وریاب کا روپ بھرا اور اپنے ساتھیوں کو بھی پولیس کی وردی پہنا دی۔
ہمارا خیال تھا، اس طرح ہم نہایت آسانی سے یہ سارا مال نکال لیں گے اور کسی کو کانوں
کان پتا بھی نہیں چلے گا، لیکن بس اس لڑکے کے ایک فون نے گڑ بڑ کر دی۔ ان کے پڑوسی
نے یہاں آکر رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ بہر حال، ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم
اب بھی تمام مال لے جا رہے ہیں۔ البتہ نقصان میں تم لوگ ہی رہے۔ ہم چاہتے تو نہیں
تھے، لیکن اب ہم بھی مجبور ہیں۔''

''جی، کیا مطلب؟'' وہ چونکے۔

''مطلب یہ کہ اب اگر ہم تم لوگوں کو زندہ چھوڑ کر جاتے ہیں تو تم لوگ پولیس کو
پوری کہانی سنا دو گے اور اگر ہم تمھیں اس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دیں اور
گڑھے کو پُر کر دیں تو تم کیا تمھارے فرشتے بھی پولیس کو کچھ نہیں بتا سکیں گے۔ وہ اگر
بعد میں تم لوگوں کی لاشیں اس گڑھے سے نکال بھی لیں، تب بھی انھیں کہانی کا پتا نہیں چلے
گا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ پولیس یہاں نہیں آئے گی۔ وہ تو آئے گی۔ ظاہر ہے، امداد اللہ کے
گھر والے انھیں ہر طرف تلاش کریں گے۔ نہ ملنے پر پولیس کو رپورٹ کی جائے گی۔ اس
گھر میں آس پاس والوں کو کوئی نظر نہیں آئے گا۔ نہ اندر جاتے ہوئے نہ باہر آتے ہوئے۔
تو پولیس تو یہاں آئے گی۔ گڑھا بھی کھود لیا جائے گا، لیکن تم پولیس کو کچھ بتانے کی پوزیشن

نہیں ہو گے اور یہی ہم چاہتے ہیں۔ نواز! اپنے ساتھیوں کی مدد سے انھیں اُٹھا کر گڑھے
میں ڈال دو۔''

''نن...... نہیں۔'' مارے خوف کے ان سب کے منھ سے نکلا۔ پھر امداد اللہ نے کہا:
آپ یہ ظلم نہ کریں۔ ہم پولیس کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ دیکھیے نا! یہ مال ہمارا نہیں ہے۔ یہ
ت لے جانے سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہو جائے گا۔ آپ ہم سے عہد لے لیں۔ ہم کسی
کچھ نہیں بتائیں گے۔ یہ راز راز ہی رہے گا۔''

''نہیں امداد صاحب! نہیں، یہ نہ ہوا ہے، نہ ہوگا۔ ایسی باتیں پیٹ میں دبی نہیں
سکتیں، باہر آکر رہیں گی۔ اس کا تو یہی طریقہ ہے، یہ کہ ہم تم لوگوں کو اس گڑھے
میں ڈال دیں اور بس۔''

''نن...... نہیں...... خدا کے لیے رحم کریں۔ ہم نے آپ لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔''
حازم گڑگڑائیں۔ ان کے رنگ اب بالکل زرد پڑ چکے تھے۔ آنکھوں میں خوف ہی
ف تھا۔ انھیں اپنے گلے خشک ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

''نواز! اپنا کام شروع کرو۔''

''باس! کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟'' نواز بول اُٹھا۔

''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' انسپکٹر وریاب خان نے منھ بنایا۔

''ہمیں کیا ضرورت ہے، ان کے خون سے ہاتھ رنگنے کی؟ کل دوپہر سے پہلے
یہاں پولیس نہیں آئے گی۔ اس وقت تک ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے ہوں گے۔ یہ لوگ
پولیس کو کچھ بھی بتا دیں، ہمارے خفیہ ٹھکانے تک بھلا پولیس کس طرح پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا
رے خیال میں ہم انھیں باندھ کر یہاں ڈال جاتے ہیں۔''

''نواز! اس طرح ہم خطرات کو دعوت دیں گے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ

آ بیل مجھے مار، والی بات ہو جائے گی۔ ہم اپنے لیے محفوظ راستہ کیوں نہ چنیں؟ خطرناک راستے کا انتخاب کیوں کریں۔''

''جو حکم باس! آپ بہتر جانتے ہیں۔'' نواز نے اپنے سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے بولا: ''چلو اُٹھاؤ انھیں۔''

''لیکن باس! اس طرح یہ کام مشکل ہوگا، آخر یہ زندہ انسان ہیں، آسانی سے گڑھے میں نہیں اُتریں گے۔'' نتھو رام نے انسپکٹر وریاب کی طرف دیکھا۔

''تب پھر؟'' انسپکٹر وریاب بولا۔

''پہلے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دینے چاہییں، پھر یہ آسانی سے گڑھے میں گر جائیں گے۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔ نواز! تم نے سنا؟ ہمارے دوست بادشاہ عرف نتھو رام نے کیا تجویز دی ہے، تم پہلے انھیں باندھ لو۔''

''جو حکم باس!'' نواز نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا۔

اب انھیں رسی کی تلاش ہوئی۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر ان میں سے ایک بولا: ''ان چارپائیوں کی رسی نکال لیتے ہیں۔''

''اوہ، ہاں! ٹھیک ہے۔''

اس نے جیب سے چاقو نکال لیا اور رسی کاٹنے لگا۔ پھر چارپائی سے اسے نکالنے لگا۔ ان سب کے دل بیٹھے جا رہے تھے۔ جسموں پر لرزہ طاری ہو چلا تھا۔ نواز کا دوسرا ساتھی اب دوسری چارپائی کی رسی نکال رہا تھا۔

''بس کافی رہیں گی، صرف ہاتھ اور پاؤں ہی باندھنے ہیں۔''

اب وہ رسیاں لیے ان کی طرف بڑھے۔

''سنو دوستو!'' ان حالات میں ایک آواز اُبھری۔ آواز امداد اللہ کی تھی۔ انھوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا: ''تمھارے حق میں بہتر یہی ہے کہ اس دولت کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم لوگ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ ہاں پولیس کو پتا چل گیا اور اس نے ہم پر دباؤ ڈالا تو بھی ہم انھیں ایسی کوئی بات نہیں بتائیں گے کہ وہ تمھارا سراغ لگالیں۔ انسانی خون سے ہولی نہ کھیلو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ ورنہ انجام بہت ہولناک ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب وہ تم پر برسے گی تو پھر تمھارا ٹھکانا کہیں نہیں ہوگا۔''

''بس دے چکے لیکچر! اب آرام سے خود کو بندھوا لو۔'' نتھو رام نے برا سا منھ بنایا۔

نواز کے دو ساتھی پہلے امداد اللہ کی طرف بڑھے۔ جونہی وہ نزدیک آئے، امداد اللہ بلا کی پھرتی سے جھکا، جیسے کوئی نماز میں رکوع کرتا ہے، دوسرے لمحے اس نے ان میں سے ایک کی کلائی پر ہاتھ ڈال کر زوردار انداز میں جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے کے ساتھ ہی نواز کا ساتھی اس کی کمر پر نظر آیا اور پھر اس نے اسے کمر پر سے اُچھال ڈالا۔ وہ دور جا گرا۔

یہ سب چشم زدن میں ہو گیا۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ دبلا پتلا امداد اللہ اس طرح ایک بھاری بھرکم غنڈے کو پھرتی سے کمر پر لاد کر اچھال بھی سکتا ہے۔ ان سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''یہ...... یہ...... یہ کیا؟'' نتھو رام کے منھ سے کھوئے کھوئے انداز میں نکلا۔

''شش...... شاید ہم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔'' انسپکٹر وریاب بڑبڑایا۔ اس کی نظریں امداد اللہ پر جم کر رہ گئیں۔

''یہ خواب نہیں! ہاں، یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم بغیر کسی نقصان کے اس مہم کو سر نہیں کر سکو گے۔ میں جوڈو کراٹے کا ماہر ہوں۔''

''کیا!!!'' ان سب کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔

''ہاں! اب بھی وقت ہے۔ یہ ساری دولت اُٹھاؤ اور چلے جاؤ۔ ورنہ ہمیں تو تم یوں بھی جان سے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ جب مرنا ٹھیرا تو تم میں سے ایک دو کو کیوں نہ لے کر مروں۔''

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ایسے میں نتھو رام کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا، پھر اس کے ہونٹ ہلے: ''اس پستول کے مقابلے میں تمھاری مہارت کیا کر لے گی، ہیں؟''

اس ''ہیں'' میں خوف ناک دھمکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی امداد اللہ تڑ سے گرا اور اس نے نواز کے ساتھی کو کمر کی طرف سے جکڑ لیا، گویا اس نے اپنے اور پستول کے درمیان میں خود ان کے ساتھی کو لے لیا تھا۔

''نتھو رام! چلاؤ گولی، تمھارا یہ ساتھی پہلے مرے گا۔ میں نے کہا تھا، تم بغیر نقصان کے یہ مہم سر نہیں کر سکو گے۔''

اب پھر ان کی آنکھوں میں اُلجھن نظر آئی۔ آخر نتھو رام نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا: ''بالو! شانی کو اس کے ہاتھوں سے چھڑاؤ۔''

بالو آگے بڑھا، لیکن اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ امداد اللہ نے جس طرح اس کے ساتھی کو اُچھالا تھا، اس سے اس کی مہارت ثابت ہو گئی تھی۔ وہ تیزی سے گھوم کر امداد اللہ کے پیچھے آیا اور دونوں ہاتھ ملا کر ایک دو تھپڑ اس کے سر پر دے مارے۔ دوسرے ہی لمحے بالو اور شانی دونوں کے منھ سے چیخ نکل گئی، کیوں کہ عین اسی وقت امداد اللہ گھوم گیا تھا اور بالو کے حملے کی زد میں خود اس کا ساتھی شانی آیا تھا۔ یہی نہیں شانی کے پیر بھی بالو کو زوردار انداز میں لگے تھے۔ دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔

''یہ کیا کیا؟'' شانی چلا اُٹھا۔

''م...... میں...... میں۔'' بالو ہکلایا۔

''کیا میں میں کر رہے ہو۔ اس کے سر پر کوئی چیز دے مارو۔'' شانی چیخا۔

ادھر انسپکٹر وریاب خان اور نتھو رام دم بخود انداز میں اس ہنگامہ آرائی کو دیکھ رہے تھے۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ ان پر فائر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ گولی خود ان کے ساتھی کو لگ سکتی تھی، جس طرح اس وقت چوٹ ان کے دونوں ساتھیوں کو آئی تھی۔ بیگم حازم اور تینوں بچے مٹھیاں بھینچے کھڑے تھے۔

بالو نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو امداد اللہ کے سر پر ماری جا سکتی۔ ایسے میں بالو کی نظر اس رسی پر پڑی، جو انھوں نے چارپائی سے اُتاری تھی۔

''بن گیا کام۔'' یہ کہتے ہی اس نے رسی اُٹھالی اور امداد اللہ کی طرف بڑھا۔

''کیا کرنے لگے ہو؟'' نتھو رام نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''رسی اس کے گلے میں ڈال کر گلا گھونٹ دیتا ہوں۔ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ اس طرح ہم اس کی طرف سے کسی چوٹ سے محفوظ رہیں گے۔''

''عقل مند ہو بالو! جلدی کرو۔''

بالو نے جونہی امداد اللہ کے گلے میں رسی ڈالنی چاہی، وہ یک دم پیچھے جھک گیا۔ بالو اس کے اوپر گرا اور دوسری طرف اُلٹ گیا۔

''لو جی! یہ اس نے رسی ڈالی ہے۔'' شانی غرایا۔

''گھبراؤ نہیں۔'' بالو اُٹھا اور پھر رسی لیے امداد اللہ کے قریب آیا۔ امداد اللہ نے شانی کو زمین سے اوپر اُٹھایا اور گھوم گیا۔ شانی کی دونوں ٹانگیں پوری زور سے بالو کو لگیں۔ وہ دھڑ سے گرا۔

''بس رہنے دو بالو! ہم دیکھتے ہیں اسے۔'' انسپکٹر وریاب خان نے جھلا کر کہا اور پستول کو نال کی طرف سے پکڑ کر آگے بڑھا۔ نتھو رام نے بھی یہی کیا۔ اب دو پستول

والے ہاتھ سروں سے اوپر رکھے ہوئے امداد اللہ کی طرف بڑھے۔ ساتھ ہی شانی کا رنگ اُڑ گیا۔ امداد اللہ نے اسے بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ اسے محسوس ہو رہا تھا، جو وار بھی امداد اللہ پر کیا جائے گا، وہ اس پر پڑے گا۔

''ذرا دیکھ بھال کر باس! کہیں میرا کچومر نہ نکل جائے۔''

''یار! چپ رہو، تمھیں اپنی پڑی ہے۔'' انسپکٹر وریاب خان نے بھناتے ہوئے انداز میں کہا۔

شانی اور سہم گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان دونوں کو اس کی ذات سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ وہ تو بس امداد اللہ پر قابو پانا چاہتے تھے۔ اب اس پر قابو پانے کے سلسلے میں چاہے وہ مارا جاتا، اس کی انھیں کوئی پروا نہیں تھی۔ یہ محسوس کرتے ہی شانی چلا اُٹھا: ''باس! سنبھل کے، ورنہ میں مارا جاؤں گا، جونہی آپ وار کریں گے، یہ جھکائی دے گا اور پستول میرے سر پر لگیں گے اور میں مارا جاؤں گا۔''

''تو مارے جاؤ۔'' نتھو رام نے غصے کے عالم میں کہا۔

''مم...... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں باس!''

''بھاڑ میں گئے تمھارے بچے۔'' نتھو رام غرایا۔

''کیا!!!'' شانی کے منھ سے مارے حیرت اور خوف کے نکلا۔

ایسے میں امداد اللہ نے سرگوشی کی: ''گھبراؤ نہیں شانی! پستول تمھیں نہیں لگیں گے۔ جونہی میں زمین پر گروں، تم بھی میرے ساتھ گر جانا۔''

شانی کا منھ مارے حیرت کے کھل گیا۔ جس شخص کو وہ سب مل کر جان سے مار ڈالنا چاہتے تھے، وہ اس کی مدد کرنے کی بات کر رہا تھا۔ اسی وقت دو پستولوں کے دستے اسے اپنی طرف آتے محسوس ہوئے۔ نشانہ اگرچہ امداد اللہ تھا، لیکن وہ یہی محسوس کر رہا تھا کہ

پستول اس کے سر پر لگیں گے، پھر جونہی پستول والے ہاتھ حرکت میں آئے، امداد اللہ دھڑ سے نیچے گر گیا اور اس کے ساتھ ہی شانی اس کے نیچے دب گیا۔ دونوں پستول امداد اللہ کی کمر پر لگے۔ گویا اس کا سر بھی بچ گیا تھا اور شانی کا بھی۔

''یہ...... یہ کیا؟'' مارے حیرت کے انسپکٹر وریاب اور نتھو رام کے منھ سے نکلا۔

''میں نے بتایا تو ہے دوستو! میں جوڈو کراٹے کا ماہر ہوں۔''

''ابھی تمھاری مہارت ہوا ہو جائے گی، فکر نہ کرو۔'' وریاب غرایا۔

''دیکھو! میں پھر کہتا ہوں، اپنا مال اُٹھا کر لے جاؤ۔ ہماری تمھاری کیا لڑائی ہے! تم یہاں سے اپنا لوٹ کا مال نکالنے آئے تھے، اسے نکال لیا۔ اب ہم لوگوں کو مار کر تمھیں کیا ملے گا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تم لوگوں کے جانے کے بعد پولیس کو نہیں بلائیں گے۔ محلے میں بھی اس واقعے کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔''

''یہی تو مشکل ہے۔'' نتھو رام مسکرایا۔

''کیا مشکل ہے؟''

''ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں۔ ہمارے جاتے ہی تم لوگوں کے منھ کھل جائیں گے۔ ہر ایک کے سامنے یہ تمام تفصیل سناتے پھرو گے اور اس طرح پولیس ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گی۔ ظاہر ہے، وہ ہمارا سراغ لگا ہی لے گی، لیکن جو کام ہم کرنے جا رہے ہیں، اس کی وجہ سے ہم صاف بچ جائیں گے، کیوں کہ یہاں ہونے والی واردات کی کہانی سنانے کے لیے کوئی نہیں ہوگا۔ پولیس اس گھر کی تلاشی لے گی اور گڑھا بھی کھودے گی...... تو کیا ہوگا! گڑھے سے مردہ لوگ ملیں گے، وہ انھیں کچھ نہیں بتا سکیں گے۔ یہ ہے فائدہ ہمیں، ورنہ ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے، بلکہ ہم تو تمھارے شکر گزار ہیں کہ گڑھا کھودے جانے تک تم نے ہم سے پوری طرح تعاون کیا۔''

''یہ شکریہ ادا کرنے کا اچھا طریقہ ہے، موت کے گھاٹ بھی اُتار رہے ہیں اور شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں۔'' بیگم حازم نے جل بھن کر کہا۔

''نواز! ہم اس کھیل کو اور لمبا نہیں کر سکتے۔ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ان لوگوں کا خون کمرے میں اِدھر اُدھر گرے! اس لیے کرنا تو یہی پڑے گا کہ ان لوگوں کو گڑھے میں گرا کر اوپر سے گولیاں ماردی جائیں۔'' نتھورام کے لہجے میں دور دور تک رحم نہیں تھا۔

وہ کانپ کر رہ گئے۔

''ٹھیک ہے باس! میں امداد اللہ کو باندھ دیتا ہوں۔''

''لگتا ہے، تم بہرے ہو۔ تم نے سنا نہیں، میں جوڈو......'' امداد اللہ کہہ رہا تھا کہ نواز نے اس کی بات کاٹ دی:

''میں سن چکا ہوں، دیکھ چکا ہوں، لیکن تم ایک بات نہیں جانتے!''

''اور وہ کیا؟''

''میں اپنے گروہ میں لڑائی بھڑائی کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا ہوں۔ تم تو صرف جوڈو کراٹے کی بات کر رہے ہو، میں تو مارشل آرٹ بھی جانتا ہوں۔ دیسی کشتی کا بھی ماہر ہوں، لہٰذا میرے مقابلے میں تمھاری دال نہیں گلے گی۔ پانی بھرتے نظر آؤ گے اور پھر یہ تمھارا روز کا کام نہیں۔ تمھیں اس وقت مجبوراً لڑنا پڑ گیا ہے، لہٰذا آجاؤ، کرلو مجھ سے دو دو ہاتھ۔ تمھیں اور ان بچوں کو اور اس خاتون کو کوئی حسرت نہ رہ جائے۔''

''نن...... نہیں۔'' مارے حیرت کے بیگم حازم کے منھ سے نکلا۔

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے۔'' امداد اللہ بولا۔

اس وقت نواز بلا کی تیزی سے جھکا، وہ اپنے دونوں ہاتھوں پر اوپر اُٹھا تھا۔ اس طرح اس کی دونوں ٹانگیں اوپر آگئیں اور وہ تیر کی طرح امداد اللہ کے منھ کی طرف گئیں۔

امداد اللہ اس حملے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس نے بروقت بچنے کی کوشش کی اور اس طرح نواز کے دونوں پیر اس کے بائیں کندھے پر لگے۔ وہ بری طرح اُچھلا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ ساتھ ہی نواز نے اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ اِدھر امداد اللہ اُٹھنے کی کوشش کر چکا تھا۔ نواز کا بائیں ہاتھ کا مکا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ امداد اللہ کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی۔ یہ وار بہت کاری تھا۔ انھوں نے امداد اللہ کے دانتوں سے خون نکل کر باہر آتے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں خوف پھیل گیا...... سب کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔

''نن...... نہیں!''

''جلدی کرو، باندھ لو اسے۔'' نتھورام کی سفاک آواز سنائی دی۔

نواز کے ساتھی اسے باندھنے لگے۔ ایسے میں وریاب کی آواز اُبھری: ''تم بہت اچھے رہے نواز! تمھیں باقی ساتھیوں سے زیادہ حصہ دیا جائے گا۔''

''شکریہ باس!'' خادم نواز نے عجیب سے انداز میں کہا۔

اب وہ لوگ بیگم حازم اور ان کے بچوں کو باندھنے لگے۔ خوف اور دہشت نے ان کی آنکھوں میں ڈیرے جما لیے تھے۔ ان کے بدن تھر تھر کانپ رہے تھے۔ موت اب ان کے بالکل سامنے تھی اور اس سے بچنے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ امداد اللہ کی شکست نے ان کی ساری اُمید ختم کر دی تھی، ورنہ جب تک وہ کھڑا تھا، وہ بہت حوصلہ محسوس کرتے رہے تھے۔

''انکل!'' درد بھرے انداز میں انیق کے منھ سے نکلا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو تھے۔

''ہاں بچو! مجھے افسوس ہے، میں تم لوگوں کو نہ بچا سکا۔'' امداد اللہ بھی رنجیدہ ہو گیا۔

"للل...... لیکن انکل! آپ بھی تو ہمارے ساتھ......" ایاد کے منھ سے جملہ پورا نہ نکل سکا۔ اس کی سسکیاں گونج اٹھیں۔

"تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اس میں تم لوگوں کا کوئی قصور نہیں، بس اللہ کو یاد کرو۔" امداداللہ کی آواز بھرا گئی۔

ایک ایک کر کے ان سب کو باندھ دیا گیا۔

"چلو، اب انھیں اس گڑھے میں گرا دو۔" نتھو رام نے سرد آواز میں کہا۔

"لیکن......" نواز بولا۔

"لیکن کیا؟"

"میرا مطلب ہے، اس طرح تو انھیں بہت چوٹ لگے گی۔"

"تو کیا ہوا، ویسے بھی تو اب یہ اس دنیا سے جا رہے ہیں۔"

"ہاں، وہ تو جا رہے ہیں، لیکن اس سے پہلے ہمیں ان کے ساتھ نرم سلوک کرنا چاہیے، جیسا کہیں میں نے سنا ہے۔" نواز کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا سنا ہے تم نے؟" دریاب کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جب قربانی کے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے تو پہلے اسے پانی پلایا جاتا ہے، اسے نرمی سے زمین پر لٹایا جاتا ہے۔"

"نواز! پھر ہم کیا کریں؟"

"شانی گڑھے میں اُتر جاتا ہے، ہم انھیں ایک ایک کر کے شانی کو پکڑاتے رہیں گے، اس طرح یہ آرام سے گڑھے کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔"

"چلو، جو کرنا ہے کرو، ہمارا مقصد تو بس یہ ہے کہ یہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہ رہیں۔"

"ایسا ہی ہوگا باس!" نواز نے فوراً کہا، پھر شانی سے بولا: "شانی! تم گڑھے

میں اتر جاؤ۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیچے چلا گیا۔ اب وہ پورا چھپ گیا تھا، گویا گڑھا انسانی قد سے بھی گہرا تھا۔

"بالو! تم پہلے امداداللہ کو اُٹھاؤ اور نیچے لٹکا دو۔ شانی نیچے سے پکڑ لے گا۔"

"اچھا استاد!"

اب دونوں امداداللہ کی طرف بڑھے۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اس نے بیگم حازم، ایاد، رائبہ اور انیق کی طرف دیکھا، پھر اس کے ہونٹ حرکت میں آئے: "خدا حافظ دوستو! اب اگلے جہاں میں ملاقات ہوگی۔"

"انکل!" وہ بلک پڑے۔

"بھائی!" بیگم حازم پکاریں۔

دوسرے ہی لمحے نواز اور بالو نے امداداللہ کو اس کے گرد بندھی رسیوں سے پکڑ کر اُٹھا لیا اور اسی طرح لٹکائے ہوئے گڑھے کے کنارے تک لے آئے، پھر دونوں نے اپنے پیر باہر نکال کر ڈھیر کی گئی مٹی میں جمائے اور امداداللہ کو نیچے لٹکا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے امداداللہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس لمحے انھوں نے اپنے دل ڈوبتے محسوس کیے۔

اب شانی اور بالو نے ایاد کو پکڑا۔ اسے تو انھوں نے اور بھی آسانی اُٹھا لیا۔ ایاد نے دکھ بھری نظروں سے اپنی والدہ بھائی اور بہن کی طرف دیکھا۔ پھر اسے بھی نیچے لٹکا دیا گیا۔

"تت...... تم لوگ رحم کرو۔ یہ ٹھیک ہے، ہم تمھیں کچھ نہیں دے سکتے، کچھ بھی نہیں۔ ہم تو خود غریب ہیں، تمھیں کیا دیں گے۔ ہمارے گھر میں آج کھانے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ خدا کے لیے رحم کرو، رحم کرو۔" بیگم حازم بول اُٹھیں۔

"تم پر رحم کریں تو خود مارے جاتے ہیں۔ ساری زندگی جیل میں کٹے گی اور تم

لوگوں کو مار کر ہم آزاد گھومتے پھریں گے۔ کھائیں گے، پییں گے۔ چلو، اپنا کام کرو، ان
کی باتیں سننے میں وقت نہ ضائع کرو۔''

اب انھوں نے انیق کو اُٹھالیا۔ وہ بُری طرح رونے لگا۔ روتے روتے گڑھے
میں اُتر گیا۔ انیق کے بعد رابعہ کی باری آئی اور آخر میں بیگم حازم کی۔ بیگم حازم کے گڑھے
میں اُترنے کے بعد شانی اوپر آ گیا۔ وہ پانچوں اوپر تلے ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔

''نواز! آخری کام تم انجام دوگے۔''

''جی، کیا مطلب؟ آخری کام۔'' نواز خادم چونکا۔

''ان پر گولیاں برسادو۔''

''گگ...... گولیاں، یہ کام ان سے کرالو باس! یہاں کون سا نشانہ لینے کی
ضرورت ہے۔ نہ نشانہ خطا ہونے کا مسئلہ ہے۔''

''نہیں نواز! یہ کام تم کروگے۔''

''اچھا باس!'' اس نے کہا اور جیب سے پستول نکال لیا۔ وہ عین گڑھے کے
کنارے پر آ گیا۔ اس کا منھ اپنے ساتھیوں کی طرف تھا اور ساتھیوں کی نظریں گڑھے پر
موجود پانچ انسانوں پر تھیں، جو خوف سے بے حال ہو رہے تھے۔ ان کے جسموں پر اگرچہ
لرزہ طاری تھا، لیکن بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ لرزتے ہوئے محسوس نہیں ہو رہے
تھے۔ یوں بھی وہ ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ اس لحاظ سے امداد اللہ کا حال تو بہت
ہی پتلا تھا۔ اس پر ان سب کا وزن تھا۔ ایاد بھی کم مشکل میں نہیں تھا۔ پھر انیق اور رابعہ بھی
مشکل میں تھے۔ بیگم حازم اگرچہ اوپر تھیں، لیکن جس صدمے سے اس وقت دوچار تھیں،
اس نے کسی بھی آسانی اور مشکل کا احساس مٹا ڈالا تھا۔

''نواز! کیا سوچ رہے ہو؟ گولیوں کی آواز نہیں آئی؟''

''ہاں باس! کیوں نہیں۔''

نواز نے گڑھے میں دیکھا۔ سب سے اوپر بیگم حازم تھیں۔ ان کا چہرہ بھی اوپر کی
طرف تھا۔ وہ بُری طرح رو رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں دنیا جہان کا دکھ سمٹ آیا تھا۔
آنسوؤں سے لبریز ان کی آنکھیں نواز کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔

اور پھر نواز کا پستول والا ہاتھ اوپر اُٹھا۔ پانچ فائر ایک ساتھ ہوئے۔

فائروں کی گونج کے بعد کمرے میں موت کا سناٹا چھا گیا۔ فائروں کے فوراً بعد
چیخیں ضرور بلند ہوئی تھیں اور اس کے بعد کچھ سسکیاں اور خرخراہٹیں بھی آتی رہی تھیں، لیکن
اس کے بعد اب موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔

یہ دن شدید سردی کے دن تھے، لوگ اپنے اپنے گھروں میں لحافوں میں دبکے
ہوئے تھے، اس لیے فائروں کی آوازوں سے باہر کوئی ہل چل نہ ہو سکی۔ آخر کافی دیر بعد
بیگم حازم کی حیرت بھری آواز سنائی دی: ''یہ...... یہ کیا؟ فائروں کی آوازیں گونجیں، چیخیں
اُبھریں، مگر ہمیں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''ہاں! اللہ کو یہی منظور تھا۔'' گڑھے کے اوپر سے نواز کی آواز سنائی دی۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ گڑھے میں بہت احتیاط سے اُتر آیا، اس طرح کہ اس
کے پیر کسی کے جسم پر نہیں رکھے گئے تھے۔ اس کے دانتوں میں چاقو دبا ہوا تھا۔ گڑھے میں
اُترنے کے بعد اس نے بیگم حازم کی رسیاں کاٹ ڈالیں اور ان سے بولا: ''آپ گڑھے
سے باہر نکل جائیں، میں آپ کو سہارا دیتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے انھیں گڑھے سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ ساتھ ہی بولا: ''آپ
گڑھے کے کنارے پر ہی رہیں، تاکہ انھیں آسانی سے نکالا جا سکے۔''

بیگم حازم نے ہاں میں سر ہلا دیا، ساتھ ہی انھوں نے ڈرے ڈرے انداز میں

کمرے کے دوسری طرف دیکھا اور پھر ان کے منھ سے ایک خوف ناک چیخ نکل گئی۔ ان کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔ ادھر نواز رائبہ کی رسیاں کاٹ رہا تھا۔ رسیاں کٹنے کے بعد نواز نے اسے باہر نکلنے میں مدد دی۔ اوپر سے بیگم حازم نے رائبہ کو بازو سے پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ رائبہ کے منھ سے بھی چیخ نکل گئی۔ رائبہ کے بعد انیق، پھر ایاد اور آخر میں امداد اللہ باہر نکلے۔ ان سب کے منہ سے باری باری چیخ نکلتی رہی۔

کمرے میں پانچ لاشیں پڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اب تک حیرت تھی۔ یہ حیرت انھیں اس وقت ہوئی تھی جب نواز نے گڑھے میں موجود لوگوں کو نشانہ بنانے کے بجائے، کمرے میں کھڑے وریاب خان اور اس کے ساتھیوں کو نشانہ بنایا تھا۔

اور یہ سب اس قدر آناً فاناً ہوا تھا کہ کوئی اس سے ایک لمحے پہلے سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ نواز کو بھی ایک لمحے پہلے یہ معلوم نہیں تھا کہ آیندہ لمحے وہ کیا کرنے والا ہے۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے؟ ہماری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو مار ڈالا! آپ تو ہمیں مارنے چلے تھے؟'' امداد اللہ کی آواز سنائی دی۔

''ہاں! یہی بات ہے۔ میں نے خود اپنے ساتھیوں کو مار ڈالا۔ خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں یہ کر گزروں گا، بس یوں سمجھ لیں کہ جب میں آپ لوگوں کی طرف اپنے پستول کا رخ کر چکا تھا۔ میری انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈالنا شروع کر چکی تھی۔ بس عین اس لمحے میرے دماغ میں ایک بجلی سی کوندی۔ ایک لمحے کے بھی شاید سوویں حصے میں یہ خیال کوند گیا کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں کوئی نیک کام نہیں کیا۔ کیوں نہ ایک نیک کام کر گزرا جائے، اور سچ یہ ہے کہ اس خیال کے آنے سے پہلے ہی میں آپ لوگوں کے لیے دل میں ہمدردی محسوس کرتا رہا تھا۔ میں سوچتا رہا تھا کہ ہم تو یہاں سے صرف اپنی دولت نکالنے

آئے تھے، آخر آپ لوگوں کا کیا قصور! ہم آپ کو کیوں جان سے ماریں۔ بس اس وقت میرا پستول والا ہاتھ خود بخود اپنے ساتھیوں کی طرف گھوم گیا۔ یوں لگا جیسے کسی انجانی طاقت نے ہاتھ کا رخ بدل دیا ہو، پھر میں ٹریگر دباتا چلا گیا۔''

نواز خاموش ہو گیا۔ وہ سب سکتے کے عالم میں خاموش کھڑے کبھی نواز کو اور کبھی لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ کافی وقت اسی عالم میں گزر گیا۔ آخر امداد اللہ کی آواز ابھری:

''اب پولیس کو فون کرنا چاہیے۔''

نواز زور سے چونکا، پھر اس نے کہا: ''ہاں! آپ فون کر دیں۔''

''آپ کا اپنے بارے میں کیا فیصلہ ہے؟''

''میں...... میں خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا۔ قانون مجھے جو سزا دے، وہ منظور ہے۔''

''میرا خیال ہے، ایسا نہیں ہوگا۔ ان حالات میں جو آپ نے کیا، وہ تو بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آپ نے معاشرے کے بے گناہ اور اچھے انسانوں کو بچانے کے لیے پانچ بُرے انسانوں کو، بڑے مجرموں کو ختم کیا، اور یہ بے تحاشا لوٹی ہوئی دولت اب حکومت کے ہاتھ آئے گی۔ آپ کو تو حکومت کی طرف سے انعام ملنا چاہیے۔'' بیگم حازم کہتی چلی گئیں۔

''مجھے معلوم نہیں، قانون مجھ سے کیا سلوک کرتا ہے، لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ میرے دل دماغ ایک زبردست اطمینان محسوس کر رہے ہیں اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ خدانخواستہ میں نے آپ لوگوں کو نشانہ بنایا ہوتا تو اس وقت میری کیفیت بالکل مختلف ہوتی۔ میں تو بہت خوش ہوں، آپ پولیس کو فون کریں۔''

''میں فون تو کر دیتا ہوں، لیکن اس سے پہلے ہمیں غور کر لینا چاہیے۔'' امداد اللہ بولے۔

''کیسا غور بھائی صاحب!'' بیگم حازم بولیں۔

''بہت لمبی چوڑی دولت کا معاملہ ہے، کہیں کوئی ہیر پھیر نہ ہو جائے۔''

''اوہ ہاں! تب پھر کیا کیا جائے؟''

''ہم کسی اخباری نمایندے کو بلا لیتے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے، بہت بڑی خبر ہے۔ اخبار والے تو ایسی خبروں کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم پولیس کو فون کر دیں گے۔ اس طرح یہاں دو اداروں کے آدمی جمع ہو جائیں گے۔ سارا معاملہ کھل کر عوام کے سامنے آ جائے گا۔'' امداد اللہ بولے۔

''یہ بہت مناسب رہے گا۔''

اب پہلے امداد اللہ نے ایک اخبار کے دفتر کو فون کیا۔ انھیں صورتِ حال بتائی اور فوری طور پر پہنچنے کے لیے کہا۔ پتا بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔ پھر پولیس اسٹیشن کو فون کیا۔ ادھر سے کافی دیر بعد ریسیور اُٹھایا گیا اور نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی: ''ہاں، کیا بات ہے، کون ہیں آپ؟''

امداد اللہ نے اپنا نام پتا، گھر کا نام وغیرہ بتایا، پھر وہاں ہونے والی واردات کے بارے میں مختصر طور پر بتایا۔ پانچ لاشوں کی بات سنتے ہی تھانے دار چلا اُٹھا۔ اس نے کہا ''خبردار! ہم آ رہے ہیں۔ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایئے گا۔ کوئی چیز اِدھر سے اُدھر نہ کریں۔''

''جی اچھا!''

پولیس سے پہلے وہاں اخبار والے پہنچے۔ امداد اللہ نے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ دستک ہونے پر وہ دروازے پر آئے اور پوچھا: ''کون؟''

''ہم اخبار کے دفتر سے آئے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں، ہم نے پولیس کے کئی بڑے بڑے افسران کو بھی فون کر دیا ہے، وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔''

''ابھی آپ دروازہ نہ کھولیں، پہلے وہ آفیسر آ جائیں، اور علاقے کی پولیس بھی آ جائے، پھر کھولیے گا۔''

''جی بہتر!''

آخر باہر بہت سی گاڑیوں کے اور پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے، پھر اخباری نمایندے کی آواز سنائی دی: ''اب آپ دروازہ کھول دیں۔ سب لوگ آ چکے ہیں، کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔''

''جی اچھا!''

یہ کہہ کر انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ تین پولیس آفیسر اندر آ گئے۔ ساتھ میں انھوں نے اخباری نمایندے کو بھی بلا لیا۔ باقی لوگوں کو باہر ہی ٹھیرے رہنے کا حکم دیا۔ مکان کو اس وقت تک چاروں طرف سے گھیرا جا چکا تھا۔ ان چاروں حضرات نے لاشوں کو دیکھا، گڑھے کو دیکھا، اس ساری دولت کو دیکھا، نواز کو دیکھا اور اس سہمے ہوئے گھرانے کو دیکھا۔ پھر کرسیوں، چارپائیوں پر بیٹھ کر ساری تفصیل سنی۔ تفصیل سن کر ان کی نظریں امداد اللہ اور نواز پر جم گئیں۔ اس کے بعد علاقے کے تھانے دار کو اندر بلایا گیا۔ اسے حکم دیا گیا: ''تمام چیزوں کی تفصیل لکھ لیں۔''

انھوں نے اپنے ماتحتوں کو اندر بلا لیا۔ پہلے پوری تفصیل لکھی۔ دولت کی تفصیل درج کی۔ جائے واردات کی، بلکہ پورے کمرے کی تصاویر لی گئیں۔ لاشوں کی تصاویر لی گئیں۔ بیانات لکھے گئے۔ پولیس کے جوانوں نے کوشش کر کے دیگ بھی نکال لی۔ اس سارے کام میں کئی گھنٹے صرف ہو گئے۔ آخر میں تھانے دار نے آفیسرز کی طرف دیکھا: ''اس کا کیا کرنا ہے سر!'' اس کا اشارہ نواز کی طرف تھا۔

''اس کا نہیں، اِن کا۔'' انھوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ذرا سوچیں،

اگر یہ کارنامہ انجام نہ دیتے تو صورت حال کیا ہوتی۔ یہ پانچ معصوم انسان اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے ہوتے اور یہ ساری دولت بھی یہ لوگ لے گئے ہوتے۔ ہمیں یہاں کیا ملتا، ایک گڑھے میں دفن ان کی لاشیں...... اور بس۔ یہ ڈاکو اس وقت سے بہت پہلے نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے اور یہ دولت بھی پر لگا کر اُڑ چکی ہوتی۔ یہ تو سارا کارنامہ ان کا ہے اور ان کے ساتھ امداد اللہ صاحب نے بھی بہت کام دکھایا ہے۔ اس گھرانے نے حالات کا بہت اچھے انداز میں مقابلہ کیا ہے، بلکہ دیکھا جائے تو اس بچے ایاد کا کارنامہ سب سے پہلے تعریف کے قابل ہے۔ اگر یہ باتھ روم میں جا کر امداد اللہ صاحب کو پیغام نہ دیتے تو صورت حال مختلف ہوتی۔ بہر حال آئی جی صاحب کے سامنے سارا معاملہ رکھا جائے گا، پھر جو فیصلہ وہ کریں گے، اس پر عمل ہوگا۔ خادم نواز بطور مہمان ہمارے پاس رہیں گے۔ یہ خود کو زیر حراست ہرگز خیال نہ کریں۔''

''میں زیر حراست رہ کر بھی خوشی محسوس کروں گا سر!'' نواز مسکرایا۔

''نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔''

اور پھر لاشوں کو ایمبولینسوں میں رکھا گیا۔ ایک بند گاڑی میں ساری دولت رکھی گئی۔ اسے باہر سے تالا لگایا گیا اور پھر آئی جی صاحب کے دفتر کی طرف روانہ کیا گیا۔ نواز کو بہت احترام سے وہاں پہنچایا گیا۔ بیگم حازم اور امداد اللہ کے گھر کے اردگرد پولیس کا پہرہ مقرر کیا گیا، کیوں کہ دونوں گھرانے خوف کی لپیٹ میں تھے۔

صبح سویرے ان سب کو بھی آئی جی صاحب کے دفتر لے جایا گیا۔ وہاں ایک بڑے کمرے میں تمام آفیسرز موجود تھے۔ ایک بار پھر نئے سرے سے آئی جی صاحب کے سامنے ساری تفصیل سنائی گئی۔ آئی جی صاحب غور سے سنتے رہے۔ آخر میں انھوں نے کہا:

''اس میں شک نہیں، یہ ایک بڑا واقعہ ہے۔ اس میں ان حضرات نے اپنا اپنا فرض خوب

نبھایا۔ جہاں برخوردار ایاد، ان کی والدہ، ان کے بھائی بہن نے خوب کام دکھایا، وہاں محترم امداد اللہ صاحب نے بھی بہت اہم کارنامہ انجام دیا، اور ان سب سے بڑھ کر کام دکھایا ہے، نواز صاحب نے۔ ابھی یہ معاملہ عدالت کے سامنے لایا جائے گا۔ میں نواز صاحب کے لیے سفارش کر رہا ہوں کہ انھیں باعزت رہا کیا جائے اور محکمۂ پولیس میں انھیں ملازمت دی جائے، تاکہ یہ باقی ماندہ زندگی قانون کے محافظ بن کر بسر کریں اور معاشرے میں انھیں احترام کی نظر سے دیکھا جائے۔'' کمرا تالیوں سے گونج اُٹھا۔

☆☆☆

پولیس کی گاڑی انھیں ان کے گھر پہنچا گئی تھی۔ اس وقت امداد اللہ نے کہا: ''ابھی ہمیں اس گڑھے کو پُر بھی کرنا ہے۔ آیئے، میں آپ لوگوں کے سامنے یہ کام بھی کرا دوں۔''

''انکل! ہم کرلیں گے۔ ایسا کرنے کی کون سی جلدی ہے۔''

''نہیں! میں یہ کام کراؤں گا، لیکن اس سے پہلے ہمیں کچھ کھا پی لینا چاہیے۔''

یہ جملہ سنتے ہی اچانک ان کی بھوک چمک اُٹھی۔ انھیں یاد آیا کہ وہ تو رات سے بھوکے تھے۔ امداد اللہ اپنے گھر سے کھانے کی بہت سی چیزیں لے آئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس گڑھے کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے تھالیوں وغیرہ میں مٹی بھر بھر کر گڑھے میں ڈالنا شروع کی۔ اچانک انیق کے منھ سے نکلا: ''ارے! یہ کیا!''

سب اس کی طرف مڑے۔ انھوں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک ہار تھا، جس میں موتی پروئے گئے تھے۔

''اوہ...... یہ یہاں کیسے رہ گیا؟'' امداد اللہ کے منھ سے نکلا۔

''دیگ میں سے جب زیورات ہاتھوں میں بھر بھر کر اوپر پہنچائے جا رہے تھے، اس وقت کہیں گر گیا ہوگا اور مٹی کے نیچے دب گیا ہوگا۔'' بیگم حازم بولیں۔

انیق نے پوچھا: ''پھر اب اس کا کیا کریں؟''

''ہمیں یہ آئی جی صاحب کے دفتر پہنچا دینا چاہیے، کیوں کہ ابھی باقی زیورات بھی وہیں ہیں نا......'' امداداللہ بولے۔

انیق نے کہا: ''تو آپ وہاں پہنچا دیں۔''

امداداللہ نے پوچھا: ''آپ لوگ ساتھ نہیں چلیں گے؟''

''میں آپ کے ساتھ چلا چلتا ہوں، سب کیا کریں گے جا کر۔''

''چلیے، یونہی سہی۔''

دونوں وہ ہار لے کر آئی جی صاحب کے دفتر پہنچے۔ چپراسی نے انھیں فوراً ہی اندر بھیج دیا۔ آئی جی صاحب اس وقت دفتر میں اکیلے ہی تھے۔ انھیں دیکھ کر چونکے۔

''خیر تو ہے؟''

''جی...... ہاں! یہ ایک چیز وہاں رہ گئی تھی۔ مٹی میں دبی ملی ہے۔''

آئی جی صاحب نے حیران ہو کر ہار کو دیکھا۔ چند لمحے ان کی طرف دیکھتے رہے، پھر بولے: ''آپ لوگوں کی دیانت داری سے بہت زیادہ خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ میری سفارشات وزیرِ اعلا صاحب تک جا چکی ہیں۔ ایک دو دن کے اندر اندر ان کی طرف سے جواب مل جائے گا، پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے ہار میز پر رکھ دیا اور ان کے ساتھ باہر آ گئے، پھر اپنے ڈرائیور کو ہدایت دی: ''ان لوگوں کو ان کے گھر پہنچا دیں۔''

تین دن بعد آئی جی صاحب، چند دوسرے آفیسرز کے ساتھ وہاں پہنچے۔ نواز ان کے ساتھ تھا۔ دستک کے جواب میں ایاد نے دروازہ کھولا اور ان سب کو دیکھ کر کھل اُٹھا:

''آیئے...... آیئے۔''

انھیں اندر بٹھایا گیا، پھر آئی جی صاحب نے قدرے بلند آواز میں کہا: ''حکومت نے نواز صاحب کو کوئی سزا نہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اب ہمارے معاشرے کے باعزت ری ہیں۔ پولیس میں انھیں ملازمت دے دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے اس رانے کے لیے ایک معقول رقم بطور وظیفہ جاری کی ہے۔ یہ آپ لوگوں کو اس وقت تک لے گی، جب تک ایاد اپنی تعلیم سے فارغ نہیں ہو جائے۔ فراغت کے بعد انھیں بھی پولیس مت میں لے لیا جائے گا اور ایسا ہی انیق صاحب کے سلسلے میں کیا جائے گا۔ اس رانے کو پولیس بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے گی۔ امداداللہ صاحب کو بھی حکومت کی ف سے تعریفی سرٹی فیکٹ کے ساتھ نقد انعام بھی دیا گیا ہے۔ آپ لوگوں کی خدمت میں نقد انعام پیش کیا جا رہا ہے۔ قانون کا یہ محافظ آپ کو سلام کرتا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے آئی جی صاحب کھڑے ہو گئے اور انھوں نے باقاعدہ ان سب کو لیوٹ کیا۔

ان کے چہروں پر شرم اور گھبراہٹ آ گئی۔ اس شرم کے پیچھے ایک سچی خوشی بھی صاف دیکھنے میں آ رہی تھی۔

☆☆☆

بیگم حازم کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ فوراً سمجھ گئے۔ انداز نواز کا تھا۔ ایاد نے فوراً اٹھ کر دروازہ کھول دیا، ساتھ ہی بولا: ''السلام علیکم انکل!''

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔'' نواز نے گرم جوشی سے جواب دیا۔

اس وقت انھوں نے دیکھا کہ نواز پولیس کی وردی میں تھا اور خوب جچ رہا تھا۔

''بھئی واہ، آپ اس وردی میں کتنے اچھے لگ رہے ہیں انکل!''

''اور مستقل قریب میں تم بھی لگو گے ان شاءاللہ۔'' نواز کے منھ سے نکلا۔

"ان شاء اللہ۔" ان سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

نواز نے تینوں بچوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ بیگم حازم کی آنکھوں میں اس وقت خوشی کے آنسو تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ ان آنسوؤں میں معاشرے کے سدھرنے سے مایوسی میں کمی اور قوم کا روشن مستقبل صاف نظر آ رہا تھا۔

اشاعت سے معذرت

✿ کراچی: سفر ہو رہا ہے (نظم)۔ پاکستانی بچو (نظم)۔ ہمارے بزرگ۔ مانو نے چور پکڑا۔ اللہ سے مانگ۔ براعظم اٹلانٹس۔ درخت کی آپ بیتی۔ نادان دوست۔ اے نونہال بچو (نظم)۔ ایسا پیارا تھا سعید (نظم)۔ قدرت کے امتحاں۔ یہی انصاف ہے۔ ہمارے نبیؐ (نعت)۔ منے کی ریل (نظم)۔ بلی شیر کی خالہ۔ کمپیوٹر۔ سچی لگن۔ محنت۔ سیاح اور بندر۔ ایمان داری کا صلہ۔ بندر، بندر یہ کیا بات۔ عمر کی بہادری ✿ ٹھٹھ: ماں کی ممتا ✿ حیدرآباد: انوکھی کتاب۔ سکون کی دولت۔ بے چارہ کبوتر ✿ سانگھڑ: میرا شہر سانگھڑ ✿ میر پور خاص: لالچ بُری بلا ہے ✿ ٹنڈو محمد خان: استاد محترم ✿ نوشہرہ: بہادر لڑکی ✿ بھریا روڈ: مکار ملک۔ کالی بھنو ✿ نوشہرو کینٹ: محبِ وطنی ✿ نوشہرو فیروز: کوئی کسی سے کم نہیں ✿ ٹنڈو جام: آفت کی پڑیا ✿ بلوچستان، اوتھل: لالچی درباں ✿ تربت مکران: مایوسی ✿ کوئٹہ: تارک الدنیا ✿ حب: ہم مسلمان ایک ہیں (نظم)۔ پھول سے بچے (نظم) ✿ ڈیرہ اسماعیل خان: پریوں کی کہانی ✿ تربیلا ڈیم: عہد ✿ بہاول نگر: نافرمان داود۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ کی نئی ایجادیں۔ گوشت کو دانتوں سے کاٹنا۔ تاج محل ✿ بہاول پور: کیلے کا درخت۔ قلعہ شیخو پورہ۔ عقل کی کرامت ✿ ملتان: احسان کا بدلہ احسان ✿ پنڈ دادن خان: ایک خواہش ✿ سرگودھا: پاکستانی بچے ✿ گوجرانوالہ: بادشاہ شیر اور غلام ✿ چک جھرہ ضلع فیصل آباد: ارقم تم کہاں ہو۔ پرستان کی سیر ✿ راولپنڈی: لاٹھی کی گرفت ✿ بلانی ضلع گجرات: حوصلہ شکنی۔ لالچ کا انجام ✿ رحیم یار خان: لالچ بُری بلا ہے ✿ بھکر: آیئے عہد کریں ✿ جگہ نامعلوم: شرط۔ تقویٰ کا انعام۔ نظمیں: کر دو امتحان۔ اب کے سال کچھ ایسا کرنا۔ حمدِ باری تعالیٰ۔

☆

آدھی ملاقات

خطوط ہمدرد نونہال شمارہ اپریل ۲۰۱۲ء کے بارے میں ہیں

❀ اپریل کا شمارہ پا کر بہت خوشی ہوئی اور خاص طور پر سرورق پر اپنی تصویر دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس شمارے کی تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ نیر مسعود، کراچی۔

❀ اپریل کے شمارے میں آدھی ملاقات میں آپ نے لکھا کہ قرآن شریف کے علاوہ کئی کتابیں مجھے پسند ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی، اس کی وضاحت کر دیں۔ کہانیوں میں توتے کی خاموشی (ڈاکٹر عمران مشتاق)، قربانی کا گدھا (م۔ص۔ ایمن)، ایک بڑا اور سچا آدمی (مسعود احمد برکاتی)، بلاعنوان انعامی کہانی (نظارت نصر) اور وہ ایک رات (پروفیسر محمد شریف خاں) بہترین اور قابلِ ستائش تحریریں تھیں۔ شار خان اماذئی، کراچی۔

علاوہ اور سوا کے معنی میں بہت فرق ہے۔ علاوہ کا مطلب ہوتا ہے اس چیز کو شامل کر کے یا اس کے ساتھ۔ میرا مطلب تھا کہ قرآن شریف کے ساتھ ساتھ بعض اور کتابیں بھی پسند ہیں۔

❀ اپریل کا شمارہ اپنی مثال آپ ہے۔ سب تحریریں شان دار ہیں۔ کہانیوں میں سب سے بہتر کہانی بلاعنوان کہانی ہے۔ اس کے علاوہ قربانی کا گدھا (م۔ص۔ ایمن)، توتے کی خاموشی (ڈاکٹر عمران مشتاق)، ایک بڑا اور سچا آدمی (مسعود احمد برکاتی)، مرزا تیمور کی کہانی (اشرف صبوحی) اور وہ ایک رات (پروفیسر محمد شریف خاں) بڑا اعلا معیار رکھتی ہیں۔ نظموں میں نغمۂ الف (تنویر پھول)، بابِ علم (مختار اجمیری) اور کھلونا بازار (ادیب سمیع چمن) دل کو بھا گئیں۔ الغرض سارا رسالہ قابلِ تعریف ہے۔ حسن رضا سردار، کامونکی۔

❀ اپریل کا شمارہ بہت دل چسپ تھا۔ قربانی کا گدھا (م۔ص۔ ایمن)، وہ ایک رات (پروفیسر محمد شریف خاں)، وہی غلطی (روبینہ سہیل)، مرزا تیمور کی کہانی (اشرف صبوحی) بہت زبردست کہانیاں تھیں۔ بلی گھر کے لیے بہت اچھے تھے۔ نائلہ محمود، کراچی۔

❀ اپریل کا ہمدرد نونہال بہت عمدہ تھا۔ ویسے تو سب کہانیاں بہترین تھیں، مگر مجھے وہ ایک رات اور توتے کی خاموشی بہت اچھی لگیں۔ کائنات ممتاز، کوئٹہ۔

❀ اپریل کا شمارہ پڑھا۔ علامہ اقبال کی یاد میں آپ نے خوب صورت مضامین شائع کیے۔ آپ کی بات درست ہے کہ قوم کے محسنوں کو ان کی وفات کی تاریخ پر ہی نہیں، بلکہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے، لیکن سوئے ہوئے ذہنوں کو جگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس طرح کے مضامین شامل اشاعت کیے جائیں تاکہ ان کی خدمت اور عظمت ہمارے دلوں اور ذہنوں کو جھنجوڑ دے اور کچھ کرنے کا عزم پیدا ہو جائے۔ ایک بڑا اور سچا آدمی، علامہ اقبال کی یادیں، کھانے کے آداب، دنیا کے بڑے سائنس داں، معلومات اقبال، علامہ اقبال ایک وکیل، بدقسمت ٹائی ٹینک بہت اچھے مضامین تھے۔ آمنہ، عائشہ، سعیہ، ہاجرہ، زہرہ، بنتِ عظم آباد۔

❀ اپریل کا رسالہ بہت دل چسپ تھا۔ ہمدرد نونہال ہمیشہ سے ہمارے لیے سبق آموز کہانیاں لے کر آ رہا ہے اور امید ہے کہ ہمیشہ لاتا رہے گا۔ اپریل کے رسالے میں جاگو جگاؤ اور کہانی "وہ ایک رات" بہت اچھی لگی۔ لطیفے بھی بہت اچھے تھے۔ حمنہ شکیل، راولپنڈی۔

❀ ایک بڑا اور سچا آدمی، توتے کی خاموشی، مرزا تیمور کی کہانی، وہ

ایک رات، بلاعنوان انعامی کہانی اور علم در یچے اچھی تحریریں تھیں۔ قربانی کا گدھا بور کہانی تھی۔ مضمون بد قسمت ٹائی ٹینک اچھا تھا۔ عباس علی صوفی، کراچی۔

❁ سب کہانیاں پسند آئیں۔ لطیفے بے حد مزے دار لگے۔ بیت بازی بھی اچھی تھی۔ بلاعنوان انعامی کہانی پسند آئی۔ روشن خیالات پڑھ کر بہت سبق ملا۔ عبدالوحید احمد پور کٹہ یارو۔

❁ اپریل کا شمارہ معلومات افزا تھا۔ قربانی کا گدھا، پہلی چوری اور وہ ایک رات بہت اچھی تحریریں تھیں۔ صفیہ حق، ملتان۔

❁ اپریل کا شمارہ اچھا تھا۔ تمام تحریریں اچھی لگیں۔ نوید الرحمن، اٹک۔

❁ اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں بہترین اور سبق آموز تھیں، لیکن ان میں سے بلاعنوان انعامی کہانی (نظارت نصر)، وہ ایک رات، مرزا تیمور کی کہانی اور توتے کی خاموشی سپر ہٹ تھیں۔ اکمل عبدالجبار، حیدر آباد۔

❁ اپریل کے شمارے میں تمام کہانیاں بہت دل چسپ تھیں، خاص طور پر معلوماتی تحریریں مجھے بہت پسند آئیں۔ محمد احتشام کاظم، شیخوپورہ۔

❁ اپریل کے ہمدرد نونہال کی کہانیوں میں پہلی چوری، ذرا سی غلطی، اور توتے کی خاموشی بہت دل چسپ اور سبق آموز تھیں۔ نظارت نصر کی "بلاعنوان انعامی کہانی" تجسس سے بھر پور تھی۔ نظموں میں "وقت" اور "کھلونا بازار" بہت معیاری تھیں۔ مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں مسعود احمد برکاتی کی تحریر "ایک بڑا اور سچا آدمی" بہت معلوماتی تھی۔ عائشہ ثاقب جنجوعہ، نجبہ ثاقب جنجوعہ، صدف ثاقب جنجوعہ، پنڈ دادن خان۔

❁ کہانیوں میں ڈاکٹر عمران مشتاق کی "توتے کی خاموشی"، اشرف صبوحی کی "مرزا تیمور کی کہانی" اور پروفیسر محمد ظریف خاں کی "وہ ایک رات" بہت سبق آموز اور متاثر کن تھیں۔ نظموں میں "نغمۂ الفت" اور "باب علم" بہت شان دار تھیں۔ علامہ اقبال کے حوالے سے تحریریں بہت معلوماتی تھیں۔ نونہال ادیب میں اچھا انسان اور اُدھار بہت زبردست تھیں۔ راجا ثاقب محمود جنجوعہ، راجا عظمت حیات، نزہت، پنڈ دادن خان۔

❁ کہانیوں میں توتے کی خاموشی، گدھے کی قربانی اور وہ ایک رات بہت پسند آئیں۔ "ایک بڑا اور سچا آدمی" زبردست تحریر تھی۔ عبدالرشید، اوتھل، لسبیلہ۔

❁ کہانیاں بہت اچھی تھیں خاص طور پر بلاعنوان انعامی کہانی بہت پسند آئی۔ انکل! میں نونہال بک کلب کی ممبر بننا چاہتی ہوں۔ کیا میں اپنی نصابی کتابیں آپ سے منگوا سکتی ہوں؟ حافظہ عمیرہ خادم حسین، کورنگی، کراچی۔

ہمدرد فاؤنڈیشن نے نصابی کتابیں شائع نہیں کیں۔

❁ اپریل کا شمارہ اس مہینے کے خیال سے جگمگا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی بہت بہت اچھا تھا۔ خاص طور پر ایک بڑا اور سچا آدمی، پہلی چوری اور مرزا تیمور کی کہانی واقعی اصلاحی کہانیاں تھیں۔ مدیحہ قاسم، میر پور خاص۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ تحریریں قربانی کا گدھا اور ایک بڑا اور سچا آدمی بازی لے گئیں۔ نظم "کھلونا بازار" بہت اچھی تھی۔ ہنسی گھر میں چند لطیفے پرانے تھے۔ بلاعنوان انعامی کہانی بھی اچھی تھی۔ محمد ہشام بن محمود عرفان، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ اس میں بلاعنوان انعامی کہانی سبق آموز اور دل چسپ تھی۔ عائشہ، ماہ نور جاوید، رحیم یار خان۔

❁ اپریل کے شمارے میں سب سے زبردست کہانی "قربانی کا گدھا" تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک رات اور بلاعنوان انعامی کہانی بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ کرن فدا حسین کیریو، لاڑھی، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت ہی شان دار تھا۔ سب سے اچھی کہانی بلاعنوان انعامی کہانی اور قربانی کا گدھا تھی۔ اس کے علاوہ پہلی چوری اور مرزا تیمور کی کہانی بھی زبردست کہانیاں تھیں۔ اس دفعہ لطیفے کچھ خاص نہیں تھے۔ دنیا کے چند بڑے سائنس داں پڑھ کر معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ پارس فدا حسین کیریو، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ ملا۔ بہت پسند آیا۔ توتے کی خاموشی اور قربانی کا گدھا بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ بلاعنوان انعامی کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ محمد فاروق، اسحاق، گوجرانوالہ۔

❁ اپریل کا شمارہ بھی اچھا تھا اور آپ کی کاوشوں کا عکاس۔ کہانیوں میں قربانی کا گدھا اور توتے کی خاموشی اچھی تھیں۔ انکل! مرزا تیمور کی کہانی جیسی کہانیاں یا قصے پڑھنے کا مجھے بہت زیادہ شوق ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلے کو برقرار رکھیے گا۔ محمد علی جوہر پر لکھی گئی آپ کی تحریر "ایک بڑا اور سچا آدمی" واقعی بہت خوب صورت تھی۔ آپ برسوں سے اس مہینے کا خیال شائع کرتے آ رہے ہیں۔ کیا آپ یہ کہیں سے اخذ کرتے ہیں یا یہ آپ کا تجربہ ہے؟ صائمہ محمود، محمد حارث، میمونہ، کراچی۔

میں صرف اپنے دماغ سے ڈھونڈتا ہوں اور جو بات دل میں آئے، اسے لکھ ڈالتا ہوں۔

❁ میں ہمدرد نونہال بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ یہ پاکستان کے بچوں کا نمبر ون رسالہ ہے۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تصور عباس سعید، خانیوال۔

❁ اپریل کا شمارہ ہر شمارے کی طرح بہترین تھا۔ کہانی قربانی کا گدھا لاجواب تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک رات، مرزا تیمور کی کہانی اور ذرا سی غلطی اچھی تحریریں تھیں۔ نا معلوم، بہاولنگر۔

❁ اپریل کا شمارہ سپر ہٹ رہا۔ توتے کی کہانی، قربانی کا گدھا، ایک بڑا اور سچا آدمی، مرزا تیمور کی کہانی، وہ ایک رات، بلاعنوان انعامی کہانی، پہلی چوری، ہنسی گھر اور بیت بازی بہت اچھی تھیں اور نظم میں نغمۂ الفت، باب علم، کھلونا بازار، وقت بہت عمدہ نظمیں تھیں۔ مریم محسن، گلشن معمار، کراچی۔

❁ اپریل کا چمکتا دمکتا معلومات کا خزانہ اور دل چسپ و سبق آموز کہانیوں اور نظموں سے مزین اپنا ہمدرد نونہال پڑھا۔ جاگو جگاؤ اور اس مہینے کا خیال تو ہے ہی زبردست۔ اس کے علاوہ کہانیوں میں پہلے نمبر پر قربانی کا گدھا، دوسرے نمبر پر توتے کی خاموشی، تیسرے پر مرزا تیمور کی کہانی رہی۔ ایک بڑا اور سچا آدمی اور وہ ایک رات بھی قابل تعریف تحاریر ہیں۔ رخسانہ جبین، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ معمول کے مطابق زبردست تھا۔ روشن خیالات اور علم دریچے کافی اچھے تھے۔ تحریر "کیڑے خود بخود صاف" پڑھ کر ایک سہانی امید کی کرن پیدا ہوئی۔ قربانی کا گدھا پڑھ کر دل کھل اٹھا۔ بلاعنوان انعامی کہانی کا بھی کوئی مول نہ تھا۔ محمد اعظم مغل، ڈگری۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ جاگو جگاؤ اور روشن خیالات بہت اچھے تھے۔ توتے کی خاموشی (ڈاکٹر عمران مشتاق)، قربانی کا گدھا (م۔ ص۔ ایمن)، وہ ایک رات (پروفیسر محمد ظریف خاں) اور بلاعنوان انعامی کہانی (نظارت نصر) بہت اچھی تحریریں تھیں۔ ہنسی گھر پڑھ کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ محمد طلحہ مغل، ڈگری۔

❁ جاگو جگاؤ سے لے کر نونہال لغت تک تمام کا تمام شمارہ نہایت دل چسپ اور دل فریب تھا۔ کہانی قربانی کا گدھا (م۔ ص۔ ایمن) پڑھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ آپ کی تحریر "ایک بڑا اور سچا آدمی" سے مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے متعلق نئی نئی باتیں پتا چلیں۔ سید محمد عباس، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر توتے کی خاموشی، قربانی کا گدھا، وہ ایک رات اور بلاعنوان انعامی کہانی بھی بہت اچھی تھیں۔ مسکراتی لکیریں اور ہنسی گھر نے تو دل جیت لیا۔ عزیر احمد، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ اچھا لگا۔ توتے کی خاموشی سبق آموز کہانی تھی۔ قربانی کا گدھا پڑھ کر ہنسی آئی۔ باقی تمام کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ربیعہ نعیم، ملتان۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت ہی زبردست تھا۔ کہانیوں میں اشرف صبوحی صاحب کی "مرزا تیمور کی کہانی" پہلے نمبر پر رہی۔ جب کہ پروفیسر محمد ظریف خاں کی "وہ ایک رات" اور قربانی کا گدھا (م۔ ص۔ ایمن) بھی بہت پسند آئیں۔ اس کے علاوہ معلوماتی سلسلے بھی بہت مفید

ہوتے ہیں اور آپ کی تحریر "ایک بڑا اور سچا آدمی" بہت اچھی لگی۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اقرا حسیم، بنوں۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ سرورق بہت پیارا تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، لیکن قربانی کا گدھا اور وہ ایک رات سب پر سبقت لے گئیں۔ لطیفوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ نونہال ادیب میں اچھا انسان، ہم نے سائیکل چلائی اور ہر نیک کام عبادت ہے بہت پسند آئیں۔ نظموں میں باب علم اور نغمۂ الفت اچھی لگیں۔ سیدہ تو یدہ عماد، خانیوال۔

❁ اپریل کا شمارہ اچھا تھا۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ سرورق کی تصویر اچھی تھی۔ نونہال مصور کا صفحہ بھی اچھا لگا۔ عریشہ نوید، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ ہمیشہ کی طرح بہت دل چسپ تھا۔ جاگو جگاؤ اور اس مہینے کا خیال بہت پُر اثر رہا۔ کہانیاں تو ساری اچھی تھیں، لیکن توتے کی خاموشی، وہ ایک رات، ذرا سی غلطی اور بلاعنوان انعامی کہانی بہت زبردست تھیں۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ روشن خیالات، علم دریچے، نونہال ادیب، نونہال لغت بھی بہترین تھے۔ ہنسی گھر کے لطیفے بھی بہت اچھے تھے، پڑھ کر مزہ آیا اور دنیا کے چند بڑے سائنس داں، علامہ اقبال، اسکوٹر جیسی جدید الیکٹرک کار، نونہال خبرنامہ نے ہمارے علم میں مزید اضافہ کیا۔ ایلیا محمود انصاری، میرپور خاص۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ چند بڑے سائنس داں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ علامہ اقبال کے بارے میں جو تحریریں تھیں، وہ بہت پسند آئیں۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ بلاعنوان انعامی کہانی بہت پسند آئی، کیوں کہ اس میں قاضی نے انتہائی مہارت سے انصاف کا فیصلہ کیا۔ عائشہ شمس الدین، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت ہی شان دار تھا۔ سرورق اچھا تھا۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات ہمیشہ کی طرح عمدہ تھے۔ نظمیں ساری اچھی تھیں۔ سب سے اچھی تو ایک بڑا اور سچا آدمی (مسعود احمد برکاتی) تھی۔ توتے کی خاموشی، قربانی کا گدھا، پہلی چوری، ذرا سی غلطی، علامہ اقبال ایک وکیل، وہ ایک رات اور اشرف صبوحی کی کہانی بہت اچھی تحریریں تھیں۔ ہنسی گھر، بیت بازی، کھانے کے آداب، دنیا کے چند بڑے سائنس داں اور نونہال خبرنامہ بہترین تھے۔ شاہ ودل، وہاڑی۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ لطیفے نئے تھے۔ انکل! اردو میں بہت سے لفظوں پر "نہ" لگتا ہے اور کچھ پر نہیں اور کچھ الفاظ مذکر ہیں اور کچھ مونث۔ ان کو پہچاننے کا اصول یا طریقہ ہے تو بتا دیں اور کیا علم سیکھنے کے لیے بھی "لائن پائیکر" چھوڑنا ضروری ہے۔ سہیل نصیر احمد، تربت۔

ابھی آپ کا مطالعہ بڑھے گا تو مذکر یا مونث کا فرق سمجھ میں آنے لگے گا۔ باقی باتیں تفصیل چاہتی ہیں۔

❁ انکل! اس دفعہ کا ہمدرد نونہال بہت اچھا تھا۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ کے ہمدرد نونہال کی وجہ سے میری اردو اچھی ہو گئی ہے۔ تسمیہ ادریس کھتری، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ ہر تحریر اور کہانی بہت اچھی تھی۔ کہانیوں میں مرزا تیمور کی کہانی، قربانی کا گدھا، ذرا سی غلطی اور پہلی چوری بہت پسند آئیں۔ وہ ایک رات بہت سبق آموز کہانی تھی۔ علیزہ کنول، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ "معمولی سا" تھا۔ سرورق کچھ پھیکا لگا۔ معلومات افزا زبردست سلسلہ ہے، جس سے علم کی جستجو کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح کے کچھ اور انعامی سلسلے شروع کرنے پر بھی غور فرمائیے۔ ایمن محسن، کراچی۔

❁ میں پرائمری کلاس سے نونہال کی قاری ہوں اور اب میں گریجویشن کی طالبہ ہوں، نونہال اور میری دوستی تو بہت پرانی ہے۔ میں جب بھی ہمدرد نونہال کے اوراق کھولتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ علم وادب کے قیمتی جواہرات میری جھولی میں آ گرے ہوں۔ ہر تحریر کا ایک ایک لفظ علم کا سمندر ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ میرا یہ بہترین دوست اسی طرح قائم ودائم رہے اور علم کی روشنی ہر سو پھیلاتا رہے۔ لاریب جاوید، کراچی۔

❁ اپریل کا تازہ شمارہ ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا۔ جاگو جگاؤ پہلی بات بہت پسند آئے۔ آپ کی اور شہید حکیم محمد سعید کی سوچ کی انفرادیت ہے۔ اس شمارے میں مزے دار اور خوب صورت کہانیوں کے ساتھ ساتھ اچھی اور معلوماتی تحریریں بہت خوب صورت تھیں۔ ڈاکٹر عمران مشتاق کی کہانی "توتے کی خاموشی" بہترین ہے۔ م۔س۔ ایمن کی کہانی "قربانی کا گدھا" پڑھ کر واقعی پیٹ میں بل پڑ گئے۔ علامہ اقبال کے متعلق بہت سی معلومات ملیں، جو کہ اب تک پوشیدہ تھیں۔ ہنسی گھر میں عام سے لطیفے تھے۔ خود کو گدگدی کرنا پڑی۔ مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں پڑھ کر اندر کا شعور جاگتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، لیکن ہم اپنے ملک پاکستان کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ شیخ حسن جاوید، فیضان خان، احمد خان رحمانی، کورنگی، کراچی۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ املا کی کچھ غلطیاں تھیں۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر توتے کی خاموشی، قربانی کا گدھا، مرزا تیمور کی کہانی اور سب سے بڑھ کر وہ ایک رات لاجواب تحریر تھی۔ "مسکراتی لکیریں" نے بھی لطف دیا۔ لطیفے کچھ پرانے تھے۔ عائشہ مجید، لاہور۔

❁ اس مرتبہ ہمدرد نونہال زبردست عمدہ اور بہترین تھا، جس کو دیکھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص کر وہ ایک رات، بلاعنوان انعامی کہانی اور مرزا تیمور بہت اچھی تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ لطیفے، بیت بازی، معلومات افزا، علم دریچے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ محمد جعفر، گروٹ۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت لاجواب تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ خصوصاً مسکراتی تحریر قربانی کا گدھا (م۔س۔ ایمن)، توتے کی خاموشی (ڈاکٹر عمران مشتاق) اور بلاعنوان انعامی کہانی (نظارت نصر) بہت پسند آئیں۔ عرفان اظہار، جھنگ صدر۔

❁ اپریل کا شمارہ تو بہت ہی زبردست تھا۔ بلاعنوان انعامی کہانی (نظارت نصر) لاجواب تھی۔ وہ ایک رات (پروفیسر محمد ظریف خان) سبق آموز کہانی تھی۔ ایک بڑا اور سچا آدمی (مسعود احمد برکاتی) بہت ہی اچھی تھی۔ انکل! نونہال ایک زبردست اور معلوماتی رسالہ ہے۔ دعا ہے کہ یہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ سمیہ رضوان احمد، حیدرآباد۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ معلومات افزا نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ایک بڑا اور سچا آدمی (مسعود احمد برکاتی) بہت معلوماتی تحریر تھی۔ بلاعنوان انعامی کہانی (نظارت نصر) کا جواب ہی نہیں۔ بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ انکل! اردو کی کسی اچھی اور جامع لغت کا نام بتا دیں۔ وجیہ اقبال احمد فاروقی، کراچی۔

وارث سرہندی کی "علمی اردو لغت" اچھی لغت ہے۔

❁ اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ توتے کی خاموشی اور بلاعنوان انعامی کہانی زبردست تھیں۔ نونہال خبرنامہ ایک بہت اچھا سلسلہ ہے۔ کچھوؤں کا صفائی کا نیا طریقہ پڑھنے میں تو اچھا لگا۔ ردا روشن، راولپنڈی۔

❁ اپریل کا شمارہ لاجواب تھا۔ کہانیاں ایک بڑا اور سچا آدمی، چور کون تھا اور بلاعنوان انعامی کہانی پسند آئیں۔ لطیفے نئے تھے۔ شہریار کنول، بہاول نگر۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا، لیکن سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ مسکراتی لکیریں پڑھ کر مزہ آیا۔ کہانیاں تمام اچھی تھیں۔ شعور سخاوت، حیدرآباد۔

❁ اپریل کا شمارہ بہت ہی اچھا تھا، لیکن سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ کہانیوں میں ایک بڑا اور سچا آدمی، پہلی چوری، وہ ایک رات، مرزا تیمور کی کہانی، توتے کی خاموشی اور بدقسمت جالی ٹینک تو بہت ہی اچھی تھیں۔ فرح ناز ابراہیم لغاری، سانگھڑ۔

❁ اپریل کے شمارے میں توتے کی خاموشی، قربانی کا گدھا، ایک بڑا اور سچا آدمی اور خاص طور پر بلاعنوان انعامی کہانی ٹاپ پر تھیں۔ ہنسی گھر بھی بہت اچھا تھا۔ قمرین عبدالصمد، رحیم یار خان۔ ☆

بلاعنوان کہانی کے انعامات

ہمدرد نونہال اپریل ۲۰۱۲ء میں جناب نظارت نصر کی بلاعنوان انعامی کہانی شائع کی گئی تھی۔ اس کہانی کے بہت اچھے اچھے عنوانات موصول ہوئے۔ کمیٹی نے بہت غور کرنے کے بعد ان میں سے تین اچھے عنوانات کا انتخاب کیا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ واہ قاضی واہ : حفصہ محمود، ناظم آباد، کراچی

۲۔ قاضی کی حکمت : نسرین فاطمہ، لطیف آباد، حیدر آباد

۳۔ ہار کا معما : مائرہ فاطمہ، تاج پورہ اسکیم، لاہور

﴿ چند اچھے اچھے عنوانات یہ ہیں ﴾

چور کون تھا؟۔ چور شہزادہ۔ اور چور پکڑا گیا۔ اور فیصلہ ہو گیا۔ اعتراف۔ انوکھا مقدمہ۔ مجرم شہزادہ۔ ہار کا راز۔ مثالی فیصلہ۔ گھر کا بھیدی۔ درست فیصلہ۔ دانا منصف۔ عقل کی جیت

ان نونہالوں نے بھی ہمیں اچھے اچھے عنوانات بھیجے

❁ کراچی: محمد عثمان شاہد، سیدہ مریم محبوب، محمد کاشان اسلم، حاسن یاسر انصاری، انشراح یاسر انصاری، رضی اللہ خان، عروبہ شمسہ، رضوان احمد، حمزہ امتیاز، نعیم الرحمن خانزادہ، محمد انصاری، خولہ انصاری، سنبلہ عبد الرزاق، سید محمد حمزہ، فرح ارم، عائشہ رئیس الدین، سید باذل علی اظہر، سید شہظل علی اظہر، سید صفوان علی جاوید، سید عفان علی جاوید، سیدہ جویریہ جاوید، حافظہ ندا، مزمل احمد خان، حذیفہ انیس، شعبان خالد خان، فرحاد آ.. خان، عائشہ بیگ، رمیشہ عمران، دانیال محمود، قطرینہ قائم، شفیقہ عمر، سہیل احمد، عریشہ صدیقی، نشمیہ سلیم، سیدہ عمیرہ مسعود، حنا شاہین، محمد ثاقب منصوری، اسماء ارشد، وجیہہ اقبال، جائشہ اقبال، سبیکا خان، حسان عاکف، تسمینہ ادریس کھتری، شاہ بشریٰ عالم، اسلم خانزادہ، سید بلال حسین ذاکر، محمد انس خان غوری، سید محمد طیب، انوشہ رئیس، زہیرہ عبداللہ، فرح احمد صدیقی، فاروق احمد صدیقی، فرزین احمد صدیقی، فراز احمد صدیقی، ورشہ اعجاز، اسد فدا حسین کیریو، ثانیہ نوید، عبداللہ عارف، واجد نگینوی، سید محمد عباس، محمد طاہر خان، کنول سلیمان، شاہ اسد، سکینہ حسنین، مریم معین، نمرہ اقبال، سروس احمد، عقیل احمد کھتری، راشد عرفان احمد، سیدہ حمنہ خالد، حریہ ناز، حلیمہ سعیدہ، نثار خان امازئی، عبدالباسط، حنان ریحان، شیخ حسن جاوید، یمنیٰ معین، ریان احمد، کامل عبداللہ صدیقی، سید نبیل منور، محمد دانش رافیق، اُسامہ بشیر احمد قریشی، مظفر ایم ڈی آصف، حفصہ محمود، عمران شکیل، ماہ نور بلوچ، عباس علی موتی، عبدالمعیز، ہانیہ شفیق، فاطمہ بنت مظفر عالم، سیدہ زہرہ امام، محمد صہیب عارفی، مہورا عدنان، تحریم خان، رخسانہ جنید، ماہ نور فاطمہ عادل، محمد واثق جاوید، ناعمہ تحریم، شزیٰ جاوید، مہوش حسن، شازیہ انصاری، عمارہ خرم، سندس آسیہ، محمد انس، اریب رضا، زینب انور علی، بلال فتح، سجاد علی، علیزہ سہیل ❁ حیدر آباد: عارفہ طارق، سنبل ناز، مبشر کمال، محسن علی، عائشہ منیر، نسرین فاطمہ، حبا عامر، ضحیٰ حنان خان، شہور سخاوت، سبرینہ رضوان احمد، عائشہ احتشام، محمد اسامہ انصاری، نور السحر، طٰہٰ یاسین، انصاف برحق ❁ میرپور خاص: افشین کنول، صدف ڈوگر، عبدالرحمٰن منیر، اویس نورانی، شہزیم راجا، حفصہ نور الدین، انیلا محمد عالم، عائشہ مہک ❁ ٹنڈو اللہ یار: فضا مریم غلام نبی، کائنات اسلم ❁ سانگھڑ: امیمہ کائنات، علیزہ ناز، فرح ناز ابراہیم لغاری، سحرش محمد یوسف، زونیرہ کنول، اقصیٰ جاوید انصاری، غفران اظہار احمد ❁ بدین: بے بی ماہ نور فاروقی ❁ ڈگری: محمد طلحہ مغل، محمد اعظم مغل ❁ پرانا سکھر: ماہ گل قاسمی، حوریہ معاذ علی انصاری جبین، محمد بلال، بسمہ ریاض احمد، سویرا خان، محمد حسیب عباسی، دلشاد انصاری ❁ جھڈو: محمد ریحان علی ❁ خیرپور میرس: ریحانہ راجپوت ❁ لاڑکانہ: سرا کہا کماری ❁ جھنگ صدر:

عرفان مختار ❀ شہداد پور: محمد صالح جان الخیری ❀ بہاولپور: قرۃ العین، صباحت گل، ایمن نور، احمد ارسلان، حنا بلقیس ❀ سیالکوٹ: عائشہ افضل ملک ❀ پنڈ دادن خان: پرنس راجا ثاقب، راجا نزاحت حیات خان جنجوعہ ❀ میلسی وہاڑی، ملتان: شاروودل، طوبیٰ ساجد، رابعہ نعیم، سمیرا بی بی، احمد سعید کشمیری، ناعمہ مجید، فروا شاور، محمد منیب الرحمٰن، صفیہ، خدیجہ منال ❀ ضلع ساہیوال: امجد اقبال ساحل ❀ ضلع فیصل آباد: عائشہ اکرم مغل، ماہم صدیقی، صفی الرحمٰن ❀ گوجرانوالہ: عمر فاروق، احمد سلمان ملک ❀ جامپور: مہرالنساء واحد ❀ تلہ گنگ ضلع چکوال: عاطف ممتاز ❀ رحیم یار خان: ثمرین عبد الصمد، انعم شہزادی ❀ لاہور: عائشہ مجید، ماہ نور سعید، چودھری امتیاز علی، وہاج عرفان، سید فیصل معیز رضوی، محمد افضل اکرم، محمد حسن سہیل، مائدہ فاطمہ، بابر نذیر ❀ اسلام آباد: ایمن طاہر، بلال حسین، ثمرہ شان، محمد ریان الرحمٰن ❀ راولپنڈی: عامرہ یاسین، ردا رحمٰن، عریج شہزاد، محمد حمزہ احمد خان، نمرا نواز، ثانیہ گلزار ❀ کرک: ایم آفتاب عالم ❀ پشاور: حانیہ شہزاد ❀ نوشہرو فیروز: عثمان روف ❀ پنو عاقل: محمد وقاص خواجہ ❀ نوشہرو کینٹ: شائزہ مریم ❀ شاہ کوٹ: شہریار رمضان ❀ کاموکے: حسن رضا سردار ❀ کوئٹہ: ماجد نواز، حمیرا نواز، آسیہ ظاہر ❀ کالا گجراں جہلم: صدف کیانی ❀ حضرو ضلع اٹک: محمد علی، نوید الرحمٰن، عطیہ بی بی، حسام علی ❀ ڈی جی خان: عمارہ الیاس خان ❀ ٹھٹھ: الضحیٰ فاطمہ، تیمور جاوید، اُمِ کلثوم، وجیہہ جاوید، اقصیٰ احمد، عائشہ بی بی ❀ جھاوریاں: سید فرید حسن ❀ بہاول نگر: احمد یار گوندل ❀ حب بلوچستان: داود الحسن، طیبہ عبد الرشید، خلیل نصیر احمد ❀ آزاد کشمیر: محمد جواد چغتائی ❀ بنوں: اختر منیر ❀ کوہاٹ: محمد صبیح، شابان آصف ❀ ضلع چترال: فضاء شاہد ❀ تحصیل گوجر خان: تحریم اعجاز ❀ وزیر آباد: فائزہ شکیل۔

☆ ☆ ☆

جوابات معلومات افزا - ۱۹۶

سوالات اپریل ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئے تھے

۱۔ حضرت ذکریاؑ، حضرت یحییٰؑ کے والد تھے۔

۲۔ ۱۴۵۱ء سے ۱۵۲۶ء تک ہندستان پر لودھی خاندان کی حکومت تھی۔

۳۔ ملکہ وکٹوریہ نے ۲۰ جون ۱۸۳۷ء سے ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء تک برطانیہ پر حکومت کی۔

۴۔ لیاقت علی خاں کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم بنے تھے۔

۵۔ اردو کالج (کراچی) ۱۹۴۹ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے قائم کیا تھا۔

۶۔ ''سبی'' صوبہ بلوچستان کا ایک ضلع ہے۔

۷۔ مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے ماہ نامہ اردوے معلیٰ جاری کیا۔

۸۔ مصر کے آخری بادشاہ شاہ فاروق تھے۔

۹۔ MUTTON انگریزی زبان میں بھیڑ بکری کے گوشت کو کہتے ہیں۔

۱۰۔ اوپیک (OPEC) پیٹرول برآمد کرنے والے ملکوں کی تنظیم کا نام ہے۔

۱۱۔ ببر علی، مشہور شاعر میر انیس کا اصل نام ہے۔

۱۲۔ سوڈا، ریت اور چونا شیشے کے بنیادی اجزا ہیں۔

۱۳۔ تبت میں بدھ مت کے سب سے بڑے مذہبی رہنما کو دلائی لاما کہتے ہیں۔

۱۴۔ گلاسگو (GLASGOW) اسکاٹ لینڈ (برطانیہ) کی بندرگاہ ہے۔

۱۵۔ اردو زبان کا ایک محاورہ ہے: ''لوہے کے چنے چبانا۔''

۱۶۔ خواجہ حیدر علی آتش کے اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح درست ہے:

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

انعام پانے والے خوش قسمت نونہال

کراچی: ثاقب تنویر، بشریٰ معین، تحریم خاں، رخسانہ جنید، منزہ ارشد حیدرآباد: شبہنور سخاوت، عائشہ احتشام الحق میر پور خاص: فیروز احمد لاہور: ماہ نور سعید، محمد حسین بھاولپور: احمد ارسلان جہلم: پرنس راجا ثاقب وزیرآباد: جویریہ وسیم ہاشمی کوہاٹ: محمد صبیح پشاور: حانیہ شہزاد۔

۱۶ درست جوابات بھیجنے والے ذہین نونہال

کراچی: عائشہ محمد حنیف، عبداللہ بن صبیح، سدرہ علی، فہد حسن کیریو، علیزہ شکیل، محمد آصف انصاری، سیدہ زہرہ امام، محمد انس عبدالستار، ماہ نور فاطمہ عادل، یوسف مفتی، محمد حبیب عارفی، ناعمہ تحریم، فرحان فہیم، ثاقب منصوری، عنبر شمس، شاہ محمد مظہر عالم، فرح ارم، اسماء ارشد، سید باذل علی، سید شہظل علی اظہر، عائشہ رئیس الدین، سیدہ جویریہ جاوید، سید عفان علی، سیدہ مریم محبوب، سید سالک محبوب، ثوبیہ خان، ملائکہ رحمٰن، حبیبہ حبیب، سید زین العابدین، شاہ اسلم خانزادہ، نعیم الرحمٰن، محمد سعید عمران، عمیم اختر، زعیم اختر، محمد باسط رضا، سیدہ ثوبیہ ناز، محمد وقاص عارف حیدرآباد: فارینہ فاطمہ، منیبہ عبدالقدوم، طہٰ یاسین، قاسم محمد عمر، محمد صادق، صائمہ زید، بکرم علی، کمال احمد، احمد رضا، عائشہ منیر، تحسین فاطمہ ڈگری: محمد اعظم مغل، محمد طلحہ مغل میر پور خاص: کائنات اسلم، انشین کنول خیر پور: ونیرہ شاہ جیلانی جامشورو: نادر علی جھتیاں سانگھڑ: زین العابدین نوشہرو فیروز: شاہزہ مریم، جاشنہ جبین سکرنڈ: صادقین ندیم لاہور: بابر نذیر ملتان: بمیرانی بی، عروبہ رضوان، احمد سعید کشمیری، طوبیٰ سعید راولپنڈی: نمرہ نواز، میمونہ یاسمین، دعا علی، ملائکہ اعجاز، مدرخ اعجاز بھاول پور: حنا بلقیس، ایمن نور، صباحت گل، قرۃ العین جہلم: راجا فرح حیات تلہ گنگ: عاطف ممتاز جھنگ صدر: قرۃ العین عطاء شاہ کوٹ: محمد شہریار رمضان جھاوریاں: سید محمد علی حسن ڈی جی خان: پروین اختر بھٹی کوہاٹ: طلحہ نواز۔

۱۵ درست جوابات بھیجنے والے سمجھدار نونہال

کراچی: کنول سلیمان، اقبال احمد خان، نثار خان، حفصہ محمود، سیدہ حمنہ خالد، شیخ حسن جاوید، طہور اعدنان، فخر عباس، بشریٰ جاوید، احدیہ خان غوری، آمنہ کمال، وجیہہ اقبال، محمد کاشان اسلم، حاسن یاور انصاری، انشراح یاسر

انصاری، عبداللطیف، محمد حمزہ امتیاز، عائشہ بیگ، سید لقمان موسوی، لاہور: عائشہ مجید، چودھری امتیاز علی حیدرآباد: اسامہ، محمد زریاب بیگ، عاتکہ ظفر صدیقی فیصل آباد: عائشہ اسلم مغل، عروبہ کوثر کوئٹہ: کائنات ممتاز بدین: بی بی ماہ نور ٹھٹھہ: اقصیٰ احمد، ام کلثوم، انس فاطمہ، تیمور جاوید، وجیہہ جاوید، عائشہ بی بی سکھر: صائمہ شیر محمد، سویرا محمد حسیب عباسی، دلشاد انصاری اسلام آباد: نمرہ شان راولپنڈی: عمار طیب، محمد حسین ساجد، ثنا عرفان بنو عاقل: محمد وقاص خواجہ ضلع اٹک: حسام علی جنڈ کاموکی: حسن رضا سرور ملتان: صفیہ حسنی، ربیعہ نسیم حویلیاں: حافظ حامد عبدالباقی ہری پور: امامہ جنید ٹنڈو الٰہیار: فضا مریم جھڈو: شنہریم راجا میلسی: شاردول کھاریاں کینٹ: امیمہ ضیاء سیالکوٹ: عائشہ افضل ملک۔

۱۴ درست جوابات بھیجنے والے علم دوست نونہال

کراچی: محمد بلال صدیقی، فیصل شکیل، فاطمہ بنت مظفر عالم، عبدالباسط، اردہ تہذیب، روحیل علی خان لاہور: سید فیصل معیز رضوی، سلمان عرفان حیدرآباد: زین حسان خان، رابعہ زاہد، سبرینہ رضوان احمد، ملک محمد زاہد، اشعل عبدالجبار ملتان: سعد بن عامر راولپنڈی: ثانیہ گلزار کوٹلی: شہریار احمد چغتائی خیر پور میرس: ریحانہ راجپوت جاچپور: مہرالنساء واحد میر پور خاص: محمد ریحان علی جہلم: اسماء قمرین۔

۱۳ درست جوابات بھیجنے والے محنتی نونہال

کراچی: مزمل امین کھتری، واجد گیلانی، سعد اللہ سلیم، زہیرہ عبداللہ کرک: محمد آفتاب عالم سکھر: محمد فرقان شیخ راولپنڈی: وارث امیر علوی کوئٹہ: آسیہ طاہر۔

۱۲ درست جوابات بھیجنے والے پُر امید نونہال

کراچی: مہوش حسین، اسامہ بشیر، بابر فتح، زینب انور علی سرگودھا: اسامہ اسلم خیر پور: محمد عمر فاروق راولپنڈی: محمد حمزہ، طہرین صادق کہوٹہ: روزا رحمٰن ہری پور: ایان آصف ضلع بہاولنگر: شہریار گوندل حب: بختاور اظہر۔

۱۱ درست جوابات بھیجنے والے پُر اعتماد نونہال

کراچی: حریم ناز، حافظ بسمہ قاضی، زارا مسعود، سجاد علی اسلام آباد: ایمن طاہر سکھر: حوریہ جبین، مرک قاضی، بسمہ ریاض احمد اٹک: عطیہ بی بی جھول: اقصیٰ نمرہ محلہ قائم والا: سلمان ریاض۔

نونہال لغت

لفظ	تلفظ	معنی
قِشر	قِ شْ رْ	چھلکا۔ پوست۔
خَلقت	خَ لْ قَ تْ	مخلوق۔ لوگ۔
خِلقت	خِ لْ قَ تْ	پیدائش۔ فطرت۔ سرشت۔
اقلیت	اَ قَ لْ لِ یَ تْ	کمی۔ کم تعداد۔ وہ قوم جو تعداد میں تھوڑی ہو۔ اکثریت کی ضد۔
وحدت	وَ حْ دَ تْ	اکیلا پن۔
مشاورت	مُ شا وَ رَ تْ	آپس میں مل کر مشورہ کرنا۔ باہم صلاح کرنا۔
سوغات	سَ و غا تْ	تحفہ۔ ہدیہ۔ عمدہ چیز۔ نرالی چیز۔
ملیدہ	مَ لی دَ ہ	چورما۔ روٹی کو چورا کر کے اس میں گھی شکر ملا کر بناتے ہیں۔
ذوالمنن	ذُو و ا لْ مِ نَنْ	بخشش اور احسان کرنے والا۔ خدا کی صفت ہے۔
شبستان	شَ بِ سْ تا نْ	سونے کا کمرا۔ آرام گاہ۔ بادشاہوں کے سونے کا کمرا۔
کون ومکاں	کو نْ و مَ کا نْ	دنیا۔ جہاں۔ سنسار۔
گدا	گَ دا	بھکاری۔ فقیر۔ منگتا۔ غریب۔ مفلس۔
متولی	مُ تَ وَلْ لی	انتظام کرنے والا۔
محن	مِ حَ نْ	محنت کی جمع۔ بلائیں۔ تکلیفیں۔
مشتعل	مُ شْ تَ عِ لْ	بھڑکتا ہوا۔ شعلے مارنے والا۔
بھانت بھانت کا	بھا نْ تْ بھا نْ تْ کا	قسم قسم کا۔ طرح طرح کا۔ رنگ رنگ کا۔
ادراک	اِ دْ را کْ	دریافت کرنا۔ پانا۔ عقل۔ سمجھ۔ فہم۔
بیاض	بَ یا ضْ	چیدہ اشعار اور مضامین لکھنے کی کتاب۔ یادداشت کی کاپی۔
زرمبادلہ	زَ رِ مُ با دَ لَہ	وہ سکے جن کے ذریعے سے دوسرے ملکوں سے تجارت ہوتی ہے۔

نئی نئی معلومات

ہمدرد نونہال، خاص نمبر کا تحفہ

شائع کردہ

ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان

کراچی

نئی نئی معلومات

علم روشنی ہے۔ زندہ رہنے اور اچھی زندگی گزارنے کے لیے انسان کو اپنی معلومات بڑھاتے رہنا چاہیے۔ معلومات حاصل کرنے کا شوق بہت اچھا شوق ہے۔ آیندہ صفحات کے مطالعے سے آپ کے اس شوق کی تسکین ہوگی۔ نئی نئی اور عجیب عجیب معلومات سے لطف اور فائدہ اٹھایئے۔

مسعود احمد برکاتی

شائع کردہ

ہمدرد لیباریٹریز (وقف) پاکستان

کراچی

مشکل سے یقین آتا ہے

ہماری روزمرہ زندگی میں بعض مشاہدات بہ ظاہر ناقابلِ یقین ہوتے ہیں، لیکن وہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنھوں نے اس قسم کے حقائق کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم ذیل میں چند ایسے ہی حقائق پیش کرتے ہیں، تاکہ ہمارے قارئین محظوظ ہوسکیں۔

☆ ایک اُبلا ہوا انڈا جو خوب سخت ہوچکا ہو، لے لیجیے اور اُسے لمبائی کی سمت سے میز پر زور سے گھمایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ لیٹا رہنے کے بجائے ایک سرے پر کھڑا ہوجائے گا جب کہ اُسی سائز کا کچا انڈا یا کم اُبلا ہوا انڈا ایسا نہیں کرے گا۔

☆ فولاد کی ٹھوس گیند اُسی سائز کی ربر کی گیند کے مقابلے میں ٹپا کھا کر زیادہ اچھلے گی۔

☆ کوچوان کے چابک یا کسی دوسرے کوڑے کو جب آپ زور سے جھٹکا دیتے ہیں تو اس میں سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوڑے کے سرے کی رفتار آواز کی رفتار سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ ہوا میں آواز کی رفتار تقریباً ساڑھے سات سو میل فی گھنٹا ہوتی ہے۔

☆ ہمارے ہاں تو آسمانی بجلی موسم برسات میں ہی کڑکتی نظر آتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آسمانی بجلی ہر لمحہ تقریباً سو بار ہماری زمین پر گرتی ہے۔

☆ اوسط درجے کا ایک انسان ہر سال ایک ٹن غذا اور مائع یا مشروبات استعمال کرتا ہے۔

☆ ہماری چھینک کی رفتار سو میل فی گھنٹا تک پہنچ جاتی ہے۔

☆ انسانی آنکھ اتنی تیز ہوتی ہے کہ اندھیری رات میں کسی پہاڑی پر کھڑا ہوا

انسان پچاس میل کے فاصلے پر روشن ہونے والی دیا سلائی کی روشنی دیکھ سکتا ہے۔

☆ آپ کے دائیں ہاتھ کے ناخن آپ کے بائیں ہاتھ کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھتے ہیں، کیوں کہ آپ اپنا دایاں ہاتھ نسبتاً زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

☆ مسکرانے میں ہم اپنے سترہ (۱۷) اعصاب سے کام لیتے ہیں، لیکن جب ہمیں غصہ آتا ہے تو سارے چہرے کے تینتالیس (۴۳) اعصاب کو کام کرنا پڑتا ہے۔

☆ اگر آپ کی عمر ۲۷ سال ہے تو شروع سے اب تک آپ کا قلب تین ارب بار دھڑک چکا ہے۔

☆ شطرنج کی چالیں چلنے کے مختلف طریقوں کو شمار کرنا ہو تو سترہ کے بعد چھبیس صفر لگایئے۔ اب یہ ہندسہ آپ شمار نہیں کرسکیں گے۔

☆ ایک معمولی چیونٹی اپنے وزن سے پچاس گنا زیادہ وزن اٹھا سکتی ہے۔

☆ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مچھر جاڑوں میں مرجاتے ہیں، لیکن یہ کیڑا اتنا سخت جان ہوتا ہے کہ شمالی قطب کے قریب بھی موجود پایا گیا ہے، جہاں سب سے زیادہ سردی پڑتی ہے۔

☆ ایک چھچھوندر ایک ہی رات میں تین سو فیٹ لمبی سُرنگ کھود سکتی ہے۔

☆ سانپ کے ناک نہیں ہوتی۔ وہ اپنی زبان کو گھما کر اس سے سونگھتا ہے۔

☆ سمندر کی تیز ترین مچھلی ''بادبانی مچھلی'' کہلاتی ہے۔ اس کی رفتار ۶۸ میل فی گھنٹے تک پہنچ جاتی ہے۔

☆ سیہہ کے جسم پر چھتیس ہزار تک کانٹے ہوتے ہیں۔

☆ چمگادڑ ہی واحد پرندہ ہے جو اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلا کر پالتی ہے۔

☆ گھوڑا کھڑے کھڑے سولیتا ہے۔

☆ بھیڑ بہتے ہوئے پانی سے اپنی پیاس نہیں بجھا سکتی۔

☆☆☆

ملک، دارالحکومت، زبان اور سکّے

ملک	دارالحکومت	سکہ	زبان	آبادی
افغانستان	کابل	افغانی	پشتو	29,929,000,
ایران	تہران	ریال	فارسی	68,017,900
آسٹریا	وی آنا	شلنگ	جرمن	8,184,700
اٹلی	روم	لیرا	اٹالین	58,103,000
الجزائر	الجیرز	دینار	عربی	4,015,700
ارجنٹائن	بیونس آئرس	پیسو	اسپینش	39,537,900
انڈونیشیا	جکارتہ	روپیہ	بھاشا	241,973,900
آسٹریلیا	کنبرا	ڈالر	انگریزی	20,090,400
بھارت	نیودہلی	روپیہ	ہندی	1,080.264,400
بنگلہ دیش	ڈھاکہ	ٹکا	بنگالی	144,319,600
برما	رنگون	کیات	برمی	50,020,000
برازیل	برسیلیہ	کروزیرو	پرتگاسی	186,112,800
بلجیئم	بورسلز	فرانک	فرانسیسی	10,364,400
بلغاریہ	صوفیہ	لیو	بلغارین	7,450,300
برطانیہ	لندن	پونڈ	انگریزی	60,441,500
پرتگال	لزبن	اسکیڈو	پرتگاسی	10,566,200

ملک	دارالحکومت	سکہ	زبان	آبادی
پولینڈ	وارسا	زلوٹی	پولش	38,635,100
پاکستان	اسلام آباد	روپیہ	اردو	162,419,900
ترکی	انقرہ	لیرا	ترکش	69,660,600
تنزانیہ	ڈوڈوما	تنزانی شلنگ	سواہلی	36,766,400
تھائی لینڈ	بنکاک	بھات	تھائی	65,444,400
جاپان	ٹوکیو	ین	جاپانی	127,417,200
جرمنی	مشرقی برلن	مارک	جرمن	82,431,400
چین	بیجنگ	یوان	مندارن	1,306,313,800
چیکوسلواکیہ	پراگ	کرونا	سلواک	15,600,000
ڈنمارک	کوپن ہیگن	کرون	ڈینش	5,432,300
روس	ماسکو	روبل	رشین	143,420,300
رومانیہ	بخارسٹ	لیو	رومانین	22,330,000
اسپین	میڈرڈ	پسیٹا	اسپینش	40,341,500
سعودی عربیہ	ریاض	سعودی ریال	عربی	26,417,600
سوڈان	خرطوم	پونڈ	عربی	40,187,500
سویڈن	اسٹاک ہوم	کرونا	سویڈش	9,001,800
سوئیزرلینڈ	برن	سوئس فرانک	جرمن	7,489,400
سری لنکا	کولمبو	روپیہ	سینہالیز	20,064,800
سنگاپور	پونگا	ڈالر	بھاسا	4,425,700
عراق	بغداد	دینار	عربی	26,074,900

ملک	دارالحکومت	سکہ	زبان	آبادی
فلپائن	منیلا	پیسو	فلپائنو	87,857,500
فرانس	پیرس	فرانک	فرنچ	60.656,200
کینیا	نیروبی	کے۔شیلنگ	سواہلی	33,829,600
لبنان	بیروت	پونڈ	عربی	3,826,000
مصر	قاہرہ	پونڈ	عربی	77,505,800
متحدہ عرب امارات	ابوظہبی	درہم	عربی	2,563,200
ملائشیا	کوالالمپور	رنگٹ	ملایا	23,953,200
ناروے	اوسلو	کراؤن	نارویجین	4,593,000
نائیجیریا	ابوجا	نیرا	انگریزی	128,772,000
ہالینڈ	ایمسٹرڈم	فلورن	ڈچ	6,065,459
ہانگ کانگ	وکٹوریہ	ڈالر	انگریزی	7,008,900
یوگوسلاویہ	بلغراد	دینار	سرب	23,724,919
یوگنڈا	کمپالا	شیلنگ	انگلش سواہلی	27,269,500
یونان	ایتھنز	ڈرچما	یونانی	10,663,484
یو۔ایس۔اے	واشنگٹن ڈی سی	ڈالر	انگلش	295,734,100

دنیا کی دس بلند ترین عمارتیں

ا۔ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ، نیویارک

۱۹۳۱ء میں ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ مکمل ہونے کے بعد عام لوگوں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ دنیا کی بلند ترین عمارت تسلیم کی گئی، البتہ جب شکاگو کا ٹوئن ٹاور تعمیر ہو گیا تو دنیا کی بلند ترین عمارت کا اعزاز اس نے حاصل کر لیا۔ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی اوپری منزلوں سے پورے نیویارک شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔پیٹروناس ٹوئن ٹاورز، ملائشیا

کوالالمپور، ملائشیا کے ٹوئن ٹاورز دنیا کی سب سے بلند ترین عمارتیں ہیں۔ ان عمارتوں کے درمیان میں ۴۱ ویں اور ۴۲ ویں منزلوں پر ایک پُل بھی تعمیر کیا گیا ہے، تاکہ ایک سے دوسری عمارت میں آمدورفت جاری رہ سکے۔ اس پُل کو محض نٹ بولٹوں سے عمارتوں کے درمیان نہیں لٹکایا گیا، بلکہ عمارتوں کو تعمیر کرتے وقت ہی اسے بھی تعمیر کر دیا گیا تھا۔ اب یہ پل تیز و تند ہوا میں اکھڑ کر گر نہیں سکتا۔ اس کی تعمیر اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ اگر کسی ایک عمارت میں ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو وہاں سے لوگ پل کے ذریعے سے دوسری عمارت میں جا کر اپنی جان بچا لیں۔

۳۔کرسلر بلڈنگ، نیویارک

ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے مکمل ہونے سے پہلے کرسلر بلڈنگ، نیویارک کو دنیا کی بلند ترین عمارت تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے اور اس بات پر سارے ماہر

تعمیرات متفق ہیں۔

۴۔ برج العرب، دبئی

یہ دنیا کی دوسری سب سے بلند عمارت ہے۔ اس عمارت میں آفس نہیں ہیں، بلکہ یہ ہوٹل ہے، چناں چہ یہاں کھایا پیا اور قیام کیا جاسکتا ہے۔ برج العرب کو ایک مصنوعی جزیرے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے ایک قوسی پُل تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ پُل دبئی شہر کی شان شوکت اور امارت کو ظاہر کرتا ہے۔

۵۔ برج دبئی

برج دبئی دنیا کی ایک بلند عمارت ہے اور اسے اب بھی تعمیر کیا جا رہا ہے جس کی بنا پر اس کی بلندی میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی بلندی اور خوب صورتی کی بنا پر اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس سال جب اس کی تعمیر مکمل ہو جائے گی تو یہ ۸۱۸ میٹر (۲۶۸۴ فیٹ) کی ہو جائے گی۔ اس کی نچلی ۳۷ منزلوں تک ایک ہوٹل ہے، جس کا نام ارمانی ہوٹل ہے۔ اس کے بعد ۴۵ ویں منزل سے ۱۰۸ منزل تک یعنی ۶۴ منزلیں رہائشی ہیں جس میں ۷۰۰ اپارٹمنٹس ہیں۔ اس ٹاور کی ۸۷ ویں منزل پر سوئمنگ پول ہے جس میں عام لوگ پیراکی کر سکتے ہیں۔ عمارت کی باقی منزلوں پر آفس قائم کیے جائیں گے۔ اس عمارت کی ۱۲۳ ویں منزل پر لابی ہے اور ۱۲۴ ویں منزل سے سارے دبئی کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ شنگھائی ورلڈ فنانشل سینٹر، چین

شنگھائی کی اس بلند عمارت میں دنیا کی ساری چیزیں دست یاب ہیں، جن میں آفس، ہوٹل، کانفرنس روم، شاپنگ مال اور شہر کا نظارہ کرنے کا فلور شامل ہے۔

۷۔ بینک آف چائنا ٹاور، ہانگ کانگ

ایشیا کی بلند ترین عمارت چائنا ٹاور ہے۔ اس کی بناوٹ اور خوب صورتی بے مثال ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ایسا معلوم ہوتا جیسے زمین سے بہت سے بانس اُگ آئے ہوں۔ یہ عمارت زندگی اور کامیابی کی علامت ہے۔ اس کے ڈیزائن پر بہت سے لوگوں نے اعتراض بھی کیا ہے کہ اس کی شکل انگریزی حرف X جیسی ہے اور عمارت کے کنارے نوکیلے ہیں۔

۸۔ تائپی ۱۰۱، تائپی

یہ اب بھی دنیا کی دوسری بلند ترین عمارت ہے۔ تائیوان میں تیز و تند ہواؤں کے طوفان اور زلزلے آتے ہیں، لہٰذا یہ عمارت اس طرح سے بنائی گئی ہے کہ اسے طوفان اور زلزلوں سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ عمارت آٹھ آٹھ منزلوں کے ٹکڑوں میں تعمیر کی گئی ہے۔

۹۔ گھرکن، لندن

جدید طرز پر تعمیر کی گئی یہ عمارت لندن کی بلند ترین عمارتوں میں سے ایک ہے۔ اس کی تعمیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس میں توانائی کا خرچہ نصف ہوتا ہے۔

۱۰۔ سیئرس ٹاورز، شکاگو

سیئرس ٹاورز ایک زمانے میں دنیا کی بلند ترین عمارت مانی جاتی تھی۔ اس کی ۱۰۳ ویں منزل سے سارے شہر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ عمارت خوب صورت ہے، لہٰذا سیاح اسے دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے ہیں۔ جب طوفانی ہوائیں چلتی ہیں تو عمارتیں ایک طرف کو جھک جاتی ہیں۔ اس کی ۱۰۳ ویں منزل سے ریاست الینوائس اور جھیل مشی گن تک کو دیکھا جاسکتا ہے۔

عجیب مچھلیاں اور پرندہ
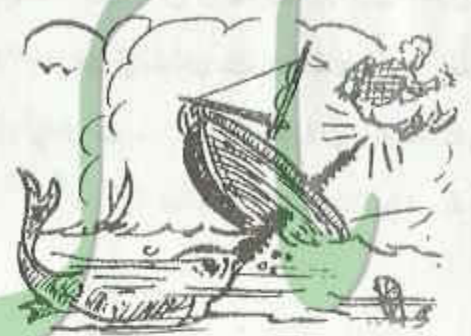
تلوار نما مچھلی

تلوار نما مچھلی (سورڈفش) کشتی میں سوراخ کرسکتی ہے۔ اس مچھلی کا نام سورڈفش اسی لیے ہے کہ اس کی تھوتھنی پر تلوار کی طرح ایک مضبوط ہڈی ہوتی ہے۔ یہ اس سے دوسری مچھلیوں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ مچھیروں نے اس کو زندہ پکڑنا چاہا اور اس نے غصے میں آکر کشتی میں سُوراخ کردیا۔

ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اس مچھلی نے اُن کشتیوں میں سوراخ کردیا جن کے اندر تانبے کی چادریں جڑی ہوئی تھیں۔

مچھلی بھی چل سکتی ہے!

آسٹریلیا میں ایسی مچھلی پائی جاتی ہے، جو چلتی ہے۔ اس کے پر اس طرح سے مڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ اس کو چلنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ یہ پانی سے نکل کر سیدھی چلنے لگتی ہے۔ یہ درختوں کے تنوں پر بھی چڑھ جاتی ہے، جو دریا کے کنارے ہوتے ہیں اور وہیں گھنٹوں بیٹھی رہتی ہے۔ یہ پانی سے باہر بھی زندہ رہتی ہے اور زمین پر رہنے والے کیڑے مکوڑے کھا جاتی ہے۔

نڈر اور بے باک پرندہ

ایک ایسا پرندہ بھی ہے جو مگرمچھ کے اوپر بیٹھ کر اس کے جسم سے کیڑے مکوڑے چن چن کر کھاتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس کے منھ کے اندر داخل ہو کر گوشت کے ٹکڑے وغیرہ بھی کھا جاتا ہے اور مگرمچھ آرام سے منھ کھولے لیٹا رہتا ہے۔

جنھوں نے حیرت انگیز ریکارڈ قائم کیے

یہ دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے کہ مشی گن کے میلون بوتھ نے ۲۹ فیٹ ۳ء۸ انچ تک ناخن بڑھانے کا عالمی ریکارڈ قائم کردیا۔ اس کے علاوہ ۶۸ سالہ ایک خاتون لی ریڈ مونڈ نے ۱۹۷۹ء سے ناخن نہیں ترشوائے اور اپنے ناخنوں کو ۲۸ فیٹ ۴ء۵ انچ لمبا کرلیا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسکاٹ مرفی نے ایلومینم کے ایک فرائی پان کو اپنے ہاتھوں سے مروڑ کر نلکی کی شکل میں کردیا۔ یہ کارنامہ اس نے ۳۰ جولائی ۲۰۰۷ء کو ٹریننگ سینٹر مارٹل بیچ پر سیکڑوں افراد کی موجودگی میں انجام دیا۔

ویلز، برطانیہ کے شہری سام ویکنگ نے چوبیس گھنٹوں تک مسلسل ایک پہیے کی سائیکل ۸ء۲۸۱ میل چلا کر دنیا کا سب سے بڑا ریکارڈ قائم کردیا اور اپنا نام ستمبر ۲۰۰۷ء میں گنیز ورلڈ ریکارڈ بک میں درج کرالیا۔

ڈگلس ڈسلوا نے اسکیٹ بورڈ پر کھڑے ہو کر اسے ۷۰ء۲۱ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑانے کا ریکارڈ قائم کیا۔ اس نے یہ کارنامہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو انجام دیا۔ چناں چہ اس کا نام گنیز ریکارڈ بک میں درج کیا گیا۔

کینیڈا کے سروان سنگھ نے ۷ فیٹ ۸ انچ لمبی داڑھی رکھ کر ۱۱۔ نومبر ۲۰۰۸ء کو عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

سلومینیا کے مارکو بالوح نے ۲۴ گھنٹے تک مسلسل سائیکل چلا کر ۵۵۳ء۱۴ میل کا فاصلہ طے کیا اور عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

امریکا کے جوئل وال نے دنیا کی سب سے بڑی ربر بینڈ بال بنائی ہے جس کا وزن ۴۰۹۷ کلوگرام ہے۔ اس گیند کو فلاڈلفیا میں ناپا گیا اور ۲۰۰۸ء میں اس شخص کا نام گنیز ورلڈ ریکارڈ بک میں درج کیا گیا۔

برطانیہ کے گیری ٹرنر نے اپنی کھال کو ۶.۲۵ انچ تک کھینچ کر عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔

امریکا کے جیک شوف نے ۱۰۹۴ گھڑیاں جمع کر کے عالمی ریکارڈ قائم کر دیا اور ۱۷ جون ۲۰۰۸ء کو اپنا نام گنیز ورلڈ ریکارڈ بک میں درج کرا لیا۔
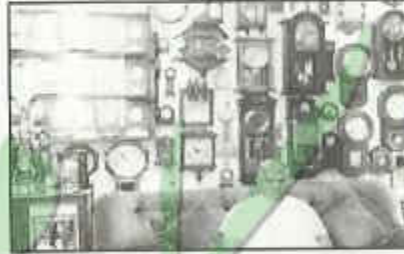
۱۱ جولائی ۲۰۰۶ء کو ایڈ نارائٹ نے ہینڈل پر بیٹھ کر موٹر سائیکل چلانے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ اس نے ۱۰۸ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر سائیکل چلا کر ریکارڈ قائم کیا تھا۔

۹۷ سالہ خاتون ڈوروتھی ٹیبل ٹینس کی سب سے معمر خاتون ہیں جنھوں نے ۲۵ مئی ۲۰۰۸ء کو آسٹریلیا میں ورلڈ ویٹرین ٹیبل ٹینس چیمپین شپ کے مقابلے میں شریک ہو کر عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

ایک مشہور کمپنی نے ایک میٹر سے بھی کم چوڑی فوجی بکتر بند گاڑی تیار کر کے عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ گاڑی بہت طاقت ور ہے اور اتنی چھوٹی ہے کہ ایک لفٹ میں سما سکتی ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا گھونگھا افریقہ میں ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۵،۵ انچ ہے، جب کہ اس کا خول ۱۰،۷۵ انچ کا ہے۔ اس کا وزن مکمل طور پر ۲ پونڈ ہوتا ہے۔

چاروں ہاتھوں پاؤں سے دوڑنے کا ریکارڈ ایک جاپانی نے ۱۳ نومبر ۲۰۰۸ء کو قائم کیا۔ اس نے ۱۰۰ میٹر کا فاصلہ ۱۸،۵۸ سیکنڈ میں طے کیا۔

دنیا کی سب سے بڑی لائبریری

لائبریری آف کانگریس دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے جو امریکا کے شہر واشنگٹن میں قائم ہے۔ اس لائبریری کے سارے شیلفوں کو اگر ایک قطار میں رکھ دیا جائے تو ان کی لمبائی ۵۳۵ میل ہو جائے گی۔ لائبریری میں موجود نوادرات کی تعداد ساڑھے آٹھ کروڑ ہے جس میں سے صرف کتابوں کی تعداد ۲ کروڑ ہے۔ کتابوں کے علاوہ لائبریری میں نقشے، گلوب، نیوز ریل، ریکارڈنگ، حکومت کے اہم کاغذات اور لوگوں کے ذاتی مسودات شامل ہیں۔ اس لائبریری میں قدیم فلمیں بھی رکھی گئی ہیں۔ ابتدائی دنوں میں جو کتابیں شائع ہوتی تھیں ان کے نمونے بھی یہاں مل جاتے ہیں۔ دنیا کی سب سے چھوٹی کتاب بھی یہاں محفوظ ہے جسے مائکرواسکوپ کی مدد سے پڑھا جا سکتا ہے۔

لائبریری میں آنے والی کتابوں اور رسالوں کی تعداد ۳۱،۰۰۰ ہے، جنھیں ایک بڑا عملہ سلیقے سے مناسب جگہوں پر رکھتا ہے۔ لائبریری کی تین چوتھائی کتابیں ۴۷۰ زبانوں میں ہیں۔ عربی کی کتابوں کا یہاں سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ تبت سے متعلق یہاں اتنے نوادرات ہیں، جو تبت میں بھی نہیں ہیں۔ انقلاب روس سے پہلے کی یہاں اتنی تصویریں محفوظ ہیں جتنی کہ خود روس میں بھی نہیں ہیں۔ اس لائبریری میں ۲۳ کمرے صرف اس لیے ہیں کہ وہاں بیٹھ کر مطالعہ اور تحقیق کی جا سکتی ہے۔ لائبریری میں بیٹھنے کے لیے کسی خاص اجازت نامے کی ضرورت نہیں، ہر شخص یہاں آ کر کتابوں سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

۱۸۰۰ء میں کانگریس کی عمارت فلاڈلفیا سے واشنگٹن ڈی سی منتقل کی گئی تو لائبریری کو پانچ ہزار امریکن ڈالر کی امداد دی گئی تا کہ ایسی کتابیں خریدی جا سکیں جو

کانگریس کے ممبران کے کام آسکیں، مگر جب ۱۸۱۴ء میں برطانوی دستوں نے حملہ کیا تو دارالحکومت کی عمارتوں میں آگ لگادی۔ یہ آگ لائبریری میں بھی لگ گئی اور ساری کتابیں جل کر راکھ ہوگئیں۔ تب امریکا کے سابقہ صدر تامس جیفرسن نے اپنی ذاتی لائبریری کی کتابیں کانگریس لائبریری کو فروخت کردیں جن کی تعداد ۶۴۸۷ تھی۔ اس ذخیرے میں دنیا کے ہر موضوع پر کتابیں تھیں۔ ۱۸۵۱ء میں ایک بار پھر دارالحکومت میں آگ لگ گئی اور اس آگ نے لائبریری آف کانگریس کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس کی تین چوتھائی کتابیں جل گئیں جن میں سے زیادہ تر کا تعلق تامس جیفرسن کی دی ہوئی کتابوں سے تھا۔

۱۸۷۰ء میں امریکی کانگریس نے یہ قانون بنایا کہ اگر کوئی شخص اپنی کسی کتاب یا چیز کے جملہ حقوق محفوظ کرانا چاہے تو اس کتاب یا چیز کی دو کاپیاں لائبریری کو بھیجے۔ لائبریری میں آنے والی چیزوں کی تعداد میں جب بے پناہ اضافہ ہوگیا تو اس کے دوسرے حصے کی تعمیر کی گئی۔ یہ اطالوی طرز کی عمارت تھی جس میں پچاس مصوروں نے مجسمے اور پینٹنگز بنا کر اسے سجایا تھا۔

۱۹۳۵ء میں وہ عمارت بھی علمی خزانوں سے بھر گئی تو ۱۹۴۵ء میں ایک اور عمارت تعمیر کی گئی۔ اس کے علاوہ واشنگٹن ڈی سی کے مضافات میں بھی ایسی عمارتیں تلاش کی گئیں جہاں لائبریری کی چیزیں رکھی جاسکیں۔ ۱۹۸۰ء میں لائبریری کی ایک اور عمارت جس کا نام جیمز میڈیسن میموریل بلڈنگ ہے، مکمل کی گئی۔ یہ پہلے کی ساری عمارتوں سے وسیع و عریض ہے اور دنیا میں اس سے بڑی کوئی لائبریری نہیں ہے۔

اس لائبریری میں ۵۰۰۰ ملازمین کام کرتے ہیں، اتنے ملازمین دنیا کی کسی اور لائبریری میں کام نہیں کرتے۔ اس لائبریری نے گزشتہ برس کانگریس کے ممبران کے ۴ لاکھ سوالوں کے جوابات دیے۔ یہاں نابیناؤں اور معذوروں کو تعلیم دینے کا خاص انتظام ہے۔ امریکا کے تقریباً سات لاکھ ایسے افراد کو بریل کتابوں کی مدد سے تعلیم دی جاتی ہے۔